مطالعات نیاز

لالہ نرائن دت سہگل نے چوپڑہ پرنٹنگ پریس جالندھر سے چھپواکر
نیشنل لٹریچر کمپنی دہلی سے شائع کیا

مطالعاتِ نیاز

ادب و افسانہ ــــــــــــــ تاریخی اور علمی مقالات

کا مجموعہ

نیاز فتح پوری

نیشنل لٹریچر کمپنی دہلی

باراول

قیمت ۵؍

سول ایجنٹ

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب
چوک فتحپوری دہلی

پاکستان میں ملنے کا پتہ

ادارہ فروغ اردو ۔ ہسپتال روڈ لاہور

و

سیّد وصی اشرف صاحب دہلی بکڈپو
الفنسٹن سٹریٹ ۔ صدر کراچی



ترتیب

ادب و افسانہ

تاریخی علمی

اَدب و اَفسانہ

حسن اور کشاکش غمزہ

عورت اور اُس کے حسن و جمال کو تاریخ انسانی میں جو اہمیت حاصل ہے اگر ہم اس کی کوئی تشبیہ موجودہ علوم و فنون کی زبان میں ڈھونڈیں تو سوائے "برق و شعاع" کے کوئی دوسرا لفظ میسر نہیں آسکتا۔ وہی آنکھیں خیرہ کر دینے والی تابش، وہی رگ و پے میں سرایت کر جانے والی بجلی، وہی ایک بار اپنے دائرہ کشش میں لا کر کبھی نہ چھوڑنے والی گرفت ـــــ اور ـــــ وہی "سوختم لیک ندانم بچہ عنوانم سوخت" قسم کی جلوہ پردازی جو بجلی میں ہے عورت کے حسن میں بھی نظر آتی ہے۔

آفات و مصائب سے بچانے کا قوی ترین ذریعہ مذہب سمجھا جاتا ہے لیکن عورت کے باب میں اس کی کمزوری کا بھی یہ عالم ہے کہ "صید از حرم کشند خم جد بلنداد" اور یہ کچھ

نہیں کر سکتا۔ جنگجو اور خون آشام مرد نے دنیا میں اپنے دشمن کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ "مئے مرد افگنِ حسن" کے سامنے اس کو ہمیشہ سپر ہی ڈالدینا پڑی۔

عالم کا وہ کونسا واقعہ ہے۔ جس میں کسی عورت نے حصّہ نہ لیا ہو۔ اور ہنگامہ نہ بپا کر دیا ہو۔ دُنیا کی وہ کونسی چنگاری ہے۔ جسے عورت کے تنفس نے چھوا ہو۔ اور اس نے "التہاب جہنم" کی صورت نہ اختیار کرلی ہو۔ مرد کی تلوار نے اُسی وقت سب سے زیادہ کاٹ دکھائی۔ جب پہلے اُسے عورت نے زخمی کر دیا۔ اور اس کے عزم میں اسی وقت کوہ تراش سنگینی پیدا ہوئی جب عورت کی سنگدلی نے اس سے "جوئے شیر" لانے کی فرمائش کی ہو۔ الغرض یہ دُنیا ہمیشہ "آشوبگاہِ حسن" رہی ہے۔ اور اسکی تاریخ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو "غمِ روزگار سے کم "غم عشق" کا حصّہ نظر نہ آئیگا۔ مگر یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب لیلیٰ مستور تھی۔ اور قیس اس کے لئے سرگرداں رہا کرتا تھا۔ یعنی عشق کی فراوانی تھی صرف اس لئے کہ حسن میں ارزانی نہ تھی۔ اور وہ ہر مدعی کو "دار و رسن" کا مستحق نہ جانتا تھا لیکن اب حالات کچھ اور ہیں پہلے حسن و جمال صرف فطری ودیعت سمجھا جاتا تھا۔ اور اب اس نے ایک تمدنی ضرورت اور علمی مسئلہ کی حیثیت سے اکتسابی صورت اختیار کرلی ہے۔ یعنی پہلے وہ ایک ایسا ہیرا تھا۔ جو صرف معدن ہی سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ لیکن اب وہ بنایا بھی جا سکتا ہے۔ اور اس کا سودا بھی ارزاں ہو جاتا ہے۔

چند سال قبل کی بات ہے۔ کہ کاروباری دُنیا میں سوائے رقص گاہوں اور تھیٹروں کے کوئی اور جگہ ایسی نہ تھی۔ جہاں کاروبار کی کامیابی کا انحصار صرف عورت کے حسن جمال

پر رہا ہو۔ لیکن اب کوئی کارگاہ انسانی ایسی نہیں ہے۔ جہاں عورت اور وہ بھی حسین عورت کی ضرورت کو محسوس نہ کیا جاتا ہو۔ جب کسی کارخانہ کو کسی عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو وہ صراحتاً اشتہار میں ظاہر کر دیتا ہے کہ اسے "مکروہ صورت عجوزہ" کی ضرورت نہیں ہے۔ دوکاندار مال فروخت کرنے کے لئے اکثر و بیشتر عورتوں ہی کی خدمات حاصل کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کسی کا تقرر کریں۔ عشق کے تمام زاویوں سے اس کے حسن کا جائزہ لے لیتے ہیں۔ تب کہیں جا کر اُس کو جگہ دیتے ہیں۔ مدارس کیلئے جو اُستانیاں تلاش کیجاتی ہیں۔ ان میں بھی سب سے پہلے حسن ہی کا عنصر تلاش کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ میں ابتدا ہی سے جمالیات کا ذوق پیدا ہو جائے۔ ہسپتالوں میں نرسیں بھی طرحدار ہی ڈھونڈھ کر رکھی جاتی ہیں۔ کیونکہ "دلِ بیمار" کا علاج ظاہر ہے "چشمِ بیمار" سے بہتر اور کون کر سکتا ہے۔ اسی طرح دائیوں اور کھلائیوں کا انتخاب بھی جمالیاتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے تاکہ بچوں کے "احساسِ حسن" اور "ذوقِ نظر" کو صدمہ نہ پہنچے۔ الغرض اس وقت ہر طرف عورت کی مانگ ہے اور عورت نام ہے۔ صرف حسن و شباب کا۔ گذشتہ جنگ سے قبل عورت اور اس کے حسن و جمال کا تعلق صرف ازدواجی معاملات سے تھا۔ لیکن جب گذشتہ محاربۂ عظیم کے دوران میں نوخواہ مرد اپنے ہی ابنائے جنس کے پھاڑ کھانے میں مصروف ہو گیا تو عورتوں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ان کاموں کو سنبھالیں جنہیں مرد ادھورا چھوڑ گئے تھے۔ اور تمدن کی ان تمام داعیات کو پورا کریں جن کی تکمیل کشاکشِ حیات تو نہیں لیکن "کشاکشِ تعیش" کیلئے یقیناً از بس

ضروری تھی۔ چنانچہ وہ اپنے بچوں کے پالنے چھوڑ چھوڑ کر باہر آگئیں۔ اور زندگی میں بالکل پہلی مرتبہ ان پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ مرد کی آزادی جس پر وہ رشک و حسد کیا کرتی تھیں، پھولوں کی سیج نہیں ہے۔

عورت ہر جگہ عورت ہے اور دُنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مرد کی ترباض سے تر باض نگاہ اس پر پڑی ہو اور کوئی التجا اس میں پنہاں نہ ہو۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کاروباری دُنیا میں حُسن کے افادی پہلو کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ خداوندانِ تمدن و عمرانیت، آقایانِ صنعت و تجارت نے عورت کا خوشی سے خیر مقدم کیا۔ اپنی آغوشیں اُس کے لئے کھولدیں۔ لیکن صرف اس شرط کے ساتھ کہ وہ جوان ہو۔ حسین و جمیل ہو۔ اور رعنائی و دلکشی کی مالک ہو۔

مرد کی اس خواہش کا علم ہونا تھا۔ کہ برسوں کے زنگ خوردہ آئینے عورت کے ہاتھ میں آگئے۔ اور اس کی فکر کا تنہا مقصود یہ رہ گیا۔ کہ وہ "زرو دولت" کے قائم کئے ہوئے معیار پر کیونکر پوری اُترے۔ اتفاق سے جنگ کے دوران میں ڈاکٹری کی ایک نئی شاخ اور پیدا ہوگئی تھی۔ جو معیوب بیکار اعضاء کو مفید و کارآمد بنانے لگی تھی۔ اس لئے عورتوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوگئی اور چونکہ ضرورت ایجاد کی ماں کہلاتی ہے اس لئے اُس نے "حسین بننے اور بنانے" کا ایک فن ہی مستقل پیدا کر دیا جس کے جاننے والے اب یورپ کے ہر شہر میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

مغرب کی عورت میں اب یہ خواہش اتنی قوی ہوگئی ہے کہ وہ فاقہ کر سکتی ہے۔

خودکشی کر سکتی ہے لیکن بدصورت رہنا اسے گوارا نہیں یہاں تک کہ معمر عورتیں بھی اپنے جسم کی جھریاں دور کرا کرا کے جوان بن رہی ہیں۔ اور جوان عورتوں کی کشمکش کا تو خیر پوچھنا ہی کیا۔ کہ انہیں سر سے پاؤں تک ایک ایک عضو کا حساب دینا پڑتا ہے۔ "مقابلۂ حسن" کے بین الاقوامی جلسوں میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ کس عورت کی کونسی چیز زیادہ دلکش ہے اور اس طرح اب سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے انگوٹھے تک ہر ہر چیز کے متعلق اصول بنا دئے گئے ہیں۔ کہ کونسا عضو کب واقعی حسین کہلایا جا سکتا ہے۔ اور کب دائرہ حسن سے خارج۔

اس سے قبل عورت کے حسن کا ذکر آتا تھا۔ تو زیادہ تر "نک سک" اور ناک نقشہ سے بحث کی جاتی تھی۔ لیکن اب حالت یہ ہے کہ جب تک کوئی عورت ہر لحاظ سے "وینس" کا مرمریں مجسمہ نہ ہو۔ وہ عورت کہلائے جانے کی مستحق ہی نہیں ہے اور نہ اُسے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق حاصل۔ رات دن ورزشیں ہو رہی ہیں، دھوپ میں جلوں پر دوڑ لگائی جا رہی ہے۔ شہسواری اور تیراکی مشقیں ہو رہی ہیں۔ حرکات رقصیہ کی مزاولت جاری ہے اور ان سب محنتوں کا مقصود صرف وہی ایک اکتسابِ جمال ہے۔

یقیناً حسن و جمال عورت کا فطری عطیہ ہے اور اس کے حصول و بقا کے لئے عورت کو کوشش بھی کرنا چاہیئے۔ لیکن چونکہ عورت اس جنس کو لے کر اب بازار میں آگئی ہے۔ اور وہ اس کا سودا چاہتی ہے۔ اس لئے اس کو مرد کی خواہش کے سامنے جھک جانا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو اسی سانچہ میں ڈھالنا پڑتا ہے جو مرد کے نزدیک

پسندیدہ ہے۔ خود اُس کی ذاتی اہمیت اب کچھ باقی نہیں رہی ہے۔ عورت کے حسن و جمال کا سودا سب سے اچھا اس وقت سینما کی دنیا میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں کی مسابقت میں اُسے جتنی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔

کچھ زمانہ قبل تک سینما میں عورت کے حسن کا بڑا معیار اس کے جسم کی نزاکت تھا۔ اور اس کی اتنی سخت پابندی تھی کہ اگر کسی عورت کا وزن مقررہ وزن سے چند تولے بھی زائد ہوتا تھا۔ تو اس کے لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ اس نزاکت یا مدقوقیت کو حاصل کرنے کے لئے عورت کو مسلسل فاقے کرنے پڑتے تھے۔ اور تمام دنیا کی غذائیں ترک کر کے صرف چند مختصر ہلکی غذاؤں پر زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ ہالی وڈ میں کام کرنے والی بعض عورتوں کی غذا صرف یہ تھی۔ کہ صبح کو نصف لیموں کا افشردہ، دوپہر کو چند چمچے سابودانہ اور رات کو پھر وہی افشردہ لیموں کیا ممکن تھا۔ کہ وہ روٹی کا ایک ٹکڑا کھالیں یا دنیا کی اور لذیذ غذائیں چکھ سکیں۔ لیکن اب یہ حالت باقی نہیں رہی ہے۔ اور ان کو چند کیلوگرام اپنا جسم بڑھانے کی اجازت دیگئی ہے۔ جس سے وہ بجائے نصف لیموں کے پورے لیموں کا افشردہ پی سکتی ہیں۔ اور کبھی کبھی روٹی کا کوئی ٹکڑا بھی انہیں نصیب ہو جاتا ہے۔

عورت کے چہرہ پر ابرو کی ساخت بھی خاص چیز سمجھی جاتی ہے لیکن چونکہ سینما ایکٹرسوں کو مختلف اوقات میں مختلف جذبات پیدا کرنے کے لئے ابروں میں بھی تغیّر پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اب اُن کو بالکل صاف کرا دیا گیا ہے۔ تاکہ جب جیسی ضرورت ہو۔ تو قلم سے بنائی جا سکیں۔

پہلے فراخ پیشانی لوازمِ حسن میں داخل تھی لیکن اب اس کی تنگی کو پسند کیا جاتا ہے اور اس لئے بالوں کی آرائش اس طرح کی جاتی ہے کہ پیشانیِ فراخ معدوم ہو جائے۔ پھر یہ ذوق صرف سینما ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اونچی سوسائٹیوں میں بھی پایا جاتا ہے اور اس طرح اب یورپ کی عورت صرف ایک ایسی صنعت رہ گئی ہے جسے مرد کی ہر نگاہ کے ساتھ بدلتا رہنا چاہیئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یورپ کی عورت آزاد ہے لیکن خود اس سے پوچھئے کہ وہ کیسی سخت غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

غالب مر گیا۔ لیکن حسن بدستور کشاکشِ غمزہ میں مبتلا ہے اور اہلِ جفا کو اب تک آرام نصیب نہیں ہوا۔

نگار۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء

ہنی بال

قوت وشجاعت کا دیوتا اور جامِ زہر

(۱)

مسیح سے ۲۳۶ء قبل کا زمانہ ہے۔ شہر قرطاجنہ میں بعل بلوخ کے مندر میں قربانگاہ کے سامنے مشہور سپہ سالار حملکار کھڑا ہوا ہے۔ اور اس جنگی تاخت کی کامیابی کے لئے دیوتا پر بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ جو وہ ملک ہسپانیہ پر کرنے والا ہے۔ افسران فوج چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اور قریب ہی ایک کمسن لڑکا کھڑا ہوا ہے۔ جس کی شباہت صاف کہے دیتی ہے کہ سپہ سالار سے اس کا کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔ اس نوعمر لڑکے کا نام ہنی بال ہے۔ یعنی خداوند بعل کا عطیۂ اوّل اوّل جب رومیوں نے اہل صقلیہ سے جنگ کی تھی۔ اسی وقت ہنی بال پیدا ہوا تھا یہی وہ زمانہ تھا۔ جب کہ جنرل حملکار نے

رومیوں کے خلاف نہایت شجاعت کیساتھ چھ برس تک لگاتار جنگیں کی تھیں تاکہ رومیوں کو جزیرہ صقلیہ میں نہ آنے دے۔ لیکن قرطاجنہ کی طرف سے عین وقت پر مدد نہ مل سکنے سے جنرل مذکور کی تمام کوششیں خاک میں مل گئیں۔ کمسن ہنی بال کا ننھا سا دل فخر و ناز اور شرم وحیا دونوں قسم کے جذبات کا ایک معمورہ تھا۔ باپ کی بہادری اور شجاعت کے حالات سن کر جس نے نوک سناں لاکھوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کا دل فخر و ناز سے بھر جاتا اور جب اس کو اپنی قوم کی شکست کا خیال آتا تھا۔ تو شرم کے مارے وہ سرنگوں ہو جاتا تھا قرطاجنہ جو کسی وقت اپنی بحری قوت کے لحاظ سے ممتاز تھا اب ہمیشہ کے نکبت و ادبار کے قعر مذلت میں گر پڑا تھا۔

جب بعل ملوخ دیوتا کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے کی رسمیں پوری ہو چکیں تو حملکار اعظم نے اپنے نو عمر بیٹے کو اشارہ سے بلایا۔ اور ایک طرف لیجا کر جہاں دوسرا کوئی شخص ان کی بات نہ سن سکتا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ کیا وہ بھی اس کے ساتھ ہسپانیہ کی جنگی مہم پر جانا چاہتا ہے۔ ہنی بال نے کہا "ہاں"۔ اُس کا باپ اس کا ہاتھ پکڑ کر دیوتا کی قربان گاہ پر لے گیا۔ اور اس کو حکم دیا کہ وہ قربانی پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے۔ کہ جب تک زندہ رہیگا اس وقت تک روم کی دشمنی سے باز نہ آئیگا۔ جب ہنی بال نے قربانی کے خون سے قشقہ اپنی پیشانی پر لگا کر حلف لیا کہ جب تک وہ زندہ رہیگا۔ روم کا دشمن رہیگا۔ تو باپ نے فرط محبت میں سینہ سے لپٹا لیا۔ اور اس طرح ایک خونین حلف نے دونوں کا خونیں رشتہ اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا۔ اب دونوں نے اس مہم پر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں جہاں

سے باپ کو اپنے وطن واپس آنا کبھی نصیب نہ ہوا۔ اور بیٹا بھی آیا۔ تو چھتیس برس کے بعد گویا وہ خونیں حلف اور قربانی کے خون کا چھوٹا سا قطرہ ایک پیشین گوئی تھی۔ اس بات کی کہ ۳۶ برس کے عرصہ میں لاکھوں آدمیوں کا گرم خون پانی کی طرح بہے گا۔

۲

گذشتہ واقعہ کو بیس برس گذر چکے ہیں۔ ملک اطالیہ کے شمالی کوہستان کے دامن میں ایک عظیم الشان فوج کا اجتماع ہو رہا ہے۔ جن کے چہرے مسلسل فاقہ کشی اور لگاتار محنت کیوجہ سے اُتر گئے ہیں۔ جنکی آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں۔ اور جن میں سے ہر ایک کی صورت پر خستگی و درماندگی برس رہی ہے۔ اس فوج میں مختلف اقوام وملل کے جوان شامل ہیں۔ یہ پیدل فوج ہسپانوی اور افریقی جوانوں پر مشتمل ہے۔ سواروں میں بربر اور صحرانشین بدوی داخل ہیں۔ ان میں جزائر بلیاری کے فلاخن انداز بھی ہیں اور فرانس کے تیر انداز بھی اور اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس وقت روم کی دشمن کتنی قومیں ہیں۔ جو اس کو تباہ و برباد کرنے چلی ہیں۔

جب یہ فوج اطالیہ کے میدانوں میں اُتری۔ تو اس وقت اس کی تعداد بیس ہزار پیدل اور چھ ہزار سوار تھی۔ گویا یہ مٹھی بھر فوج اس قوم پر حملہ کرنے آئی تھی۔ جو خود اپنی زمین پر لڑتی تھی۔ اور جس کی تعداد بھی اس وقت ڈھائی لاکھ مسلح جوانوں اور ساڑھے سات لاکھ ردیف پر مشتمل تھی۔

اگر ظاہری اسباب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس وقت رومیوں کا پلہ ہر طرح

بھاری تھا۔ لیکن باوجود اس کے بھی اہل روما یہ خبر سن کر خائف تھے۔ اور وہ ایسا محسوس کر رہے تھے۔ کہ گویا بعل ملوخ پہاڑوں پر اتر آیا ہے اور اس کا خوفناک سایہ اطالیہ کی زرخیز میدانوں پر پڑ رہا ہے۔

۳

ان واقعات کو دو سال گذر چکے ہیں۔ معرکۂ کنّا کی شام ہے شمشیر انتقام علم ہے اور دشمن دست بستہ پابستہ سامنے پڑا ہوا ہے۔ صرف تلوار کی جنبش کی دیر ہے اور دشمن کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ مگر نہیں! تلوار میں جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ کیوں؟ یہی وہ تاریخی معمہ ہے جسے مؤرخین آجتک حل نہ کر سکے۔

جب سے ہنی بال اطالیہ میں داخل ہوا ہے۔ وہ رومی فوجوں کو تین زبردست جنگوں میں شکست دے چکا ہے۔ پہلی جنگ تریبیا (Trebia) میں ہوئی جہاں اُس نے شدت کی سردی میں صبح کے وقت دشمن کو ناشتہ کئے بغیر لڑنے پر مجبور کیا۔ دوسری جنگ ۲۱۷ء قبل مسیح فصل بہار میں جھیل ٹراسمینیس کے کنارے ہوئی۔ یہاں بھی ہنی بال نے نہایت جرأت و ہوشیاری سے کام لیا۔ اور ہنی بال کی فوج صبح کے کہر میں پہاڑیوں سے نکل کر دشمن پر بیخبری میں آ پڑی۔ اور راہ فرار بند کر کے دشمن کو تباہ کر دیا۔ اب روما کا راستہ صاف تھا۔ صرف سو میل کا فاصلہ طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔ اور مزاحمت کیلئے اہل روما کے پاس کوئی باقاعدہ فوج بھی نہیں رہی تھی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ روما کی طرف کوچ کرے۔ ہنی بال نے اپنی فوجوں کا رُخ مشرق کی طرف

سواحل بحیرۂ ایڈریاٹک کی طرف پھیر دیا۔ اور تمام وسیع ملک کو تاخت وتاراج کر دیا۔ اس نے روما کا رُخ کیوں نہیں کیا؟ اس کے جو اسباب بھی ہوں۔ لیکن یہ یقین ہے۔ کہ ہنی بال اس طرح روما کے حلیفوں کو اپنے قابو میں لانا چاہتا تھا۔ ہر چند اس واقعہ کے بعد رومیوں کو دم لینے کا کسی قدر موقعہ مل گیا تھا۔ اور ان کے خلاف سخت پروپیگنڈا میں مصروف تھا۔ لیکن وہ محسوس کرنے لگے تھے۔ کہ بلوخ بت کے منہ سے شعلہ ہائے آتشیں نکل کر اُن کے چہروں کو جھلسائے دیتے ہیں۔ اس لئے اب انہوں نے فابیس نامی ایک شخص کو اپنا فرمانروا مقرر کیا۔ جس نے وہ مشہور جنگی چال اختیار کی جو اس کے نام سے اب تک منسوب چلی آتی ہے یعنی اس نے یہ کوشش کی کہ باہم لڑائی جنگ کرنے سے محترز رہ کر دشمن کو کمزور کرے۔

لیکن جب فابیس کی مدت ششماہہ گذر گئی۔ تو رومیوں نے دیکھا کہ ہنی بال کی فوج نے ان کے خلفاء کا تمام علاقہ تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس لئے وہ سامنے ہو کر لڑنے پر مجبور ہوئے اور مقام کنّا کے میدان جنگ میں انہوں نے اپنی عظیم ترین سپاہ کا اجتماع کیا۔ مگر ہنی بال نے اپنی جنگی قابلیت سے کام لیکر سب کو گھاس کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔

رومیوں کی فوج کا قتل عام کرنے کے بعد اسی روز شام کو افریقی رسالوں کے کماندار نہر بال نے ہنی بال سے کہا: مجھے روما پر دھاوا کرنے دیجئے۔ اور آپ پیچھے پیچھے چلے آیئے۔ اگر خداوند بعل بلوخ کو منظور ہوا۔ تو آج سے پانچویں دن پایۂ تخت میں جشن

فتح منعقد ہو گا۔

اس پر ہنی بال نے کہا۔ کہ ابھی اس معاملہ پر غور و خوض کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔" یہ سُن کر مہربال بگڑ گیا۔ اور اس نے طنزاً کہا کہ :۔ ہنی بال تم فتح کرنا خوب جانتے ہو۔ لیکن فتح سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتے۔"

ممکن ہے مہربال کا قول غلط ہو۔ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ ہنی بال نے اپنی اس عظیم الشان فتح سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا۔ یقیناً ہنی بال کے اس تساہل کا کوئی زیادہ گہرا سبب ہے۔ اس تمام جنگ و جدال اور کشت و خون سے ہنی بال کا اصلی مقصد کیا تھا! انتقام! اور صرف انتقام۔ یہ ایک سامی النسل قوم کا انتقام تھا۔

قدیم زمانہ کے نیم وحشی لوگوں کی عادت تھی۔ کہ جب وہ کسی دشمن سے انتقام لیتے تھے۔ تو وہ اس کو جلد قتل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آہستہ آہستہ عذاب دے کر اس کی جان لیا کرتے تھے۔ تاکہ جس قدر دشمن کو زیادہ تکلیف ہو اسی قدر انتقام میں لطف آئے۔ دشمن سے نہ صرف بدلا لیا جاتا تھا۔ بلکہ اسے محسوس کرایا جاتا تھا۔ کہ بدلا لیا جا رہا ہے۔ انسان اس ابتدائی فطرت کا اثر ہنی بال کی طبیعت پر بھی ہونا چاہیئے تھا۔ اگر کوہستان ایلپس کی بلند چوٹیوں پر سے اُتر کر بجلی کی طرح رومیوں پر ہنی بال آ گرتا تو اس کا نتیجہ ہوتا۔ کہ رومی اپنے بال بچوں، اپنی عزت و ناموس اور اپنے وطن کی حفاظت میں لڑ کر جان دے دیتا اور دنیا میں نام کر جاتا۔ لیکن اگر روم کی فوجوں کو یکے بعد دیگرے شکست دی جائے۔ اس کے حلیفوں اور دوستوں کو اس سے رفتہ رفتہ توڑ لیا جائے

اسے ان لوگوں کی نظروں میں حقیر و ذلیل کر دیا جائے۔ جو کل تک اس کے نام سے تھراتے تھے۔ اور بالآخر پوری طرح بے بس کر کے اُس کی جان لی جائے۔ تو یہ ہے انتقام یہ ہے پرلطف سامی انتقام۔

۴

پانچ سال کا زمانہ اور گذر گیا۔ ہنی بال ایک گھوڑے پر سوار شہر روما کی فصیل کے سامنے خراماں خراماں جا رہا ہے۔ اور اس شہر کو اطمینان کی نظروں سے دیکھ رہا ہے جسکی ابدی دشمنی کا اس نے قرطاجنہ میں آج ۲۷ برس پیشتر حلف اٹھایا تھا۔ مضافات شہر کے لوگ شہر میں پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ اور رات کے وقت گاؤں کے جلنے کی جو روشنی دور دور تک نظر آتی ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ خداوند بعل ملوخ کا قہر و غضب روم پر ٹوٹ رہا ہے۔ ہنی بال شہر روما پر نظریں ڈالتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ کا نیزہ شہر پناہ کے اوپر سے شہر میں پھینکتا ہے۔ وہ روما کی طرف ذلت کی نظروں سے دیکھتا ہے اور شہر کے سامنے سے چلا جاتا ہے۔ فتح کینا کے بعد شہر کاپوا کے ساتھ بہت سے اطالوی شہروں نے ہنی بال کی اطاعت کرلی تھی۔ شہر کاپوا وسعت اور دولت کے لحاظ سے شہر روما کا قریب ترین حریف تھا۔ لیکن اس علاقہ میں بھی بہت سے مقامات پر ابھی تک روم کی قلعہ بند فوجیں دشمن کی مدافعت کر رہی تھیں۔ اور اطالیہ کا مغربی حصہ ابھی تک پوری طرح سے روم کے زیر فرماں تھا۔ واقعہ کینا کے بعد روم کو اس قدر فرصت مل گئی تھی۔ کہ وہ تازہ دم فوجیں بھرتی کرلے اور ادھر ہنی بال کے جدید حلفاء نے یہ چال چلی کہ وہ ہنی بال کی مدد خود تو لے لیتے تھے لیکن اپنی طرف سے

اس کو کوئی مدد نہیں دیتے تھے۔ اب رومی فوجیں بھی کافی ہوشیار ہو گئی تھیں! وہ ہنی بال سے میدان میں کبھی نہیں لڑتی تھی۔ بلکہ وہ اس کے دوستوں اور حلیفوں پر چھاپے مار کر ان کو دق کرتی تھیں۔

۲۱۲ ق م میں جب کہ ہنی بال اطالیہ کے جنوب میں شہر تارنتم کا محاصرہ کر رہا تھا۔ تو ادھر رومیوں نے شہر کاپوا کو محصور کر لیا۔ اور اگرچہ ایک مرتبہ ہنی بال نے آکر محاصرہ اٹھا دیا تھا۔ مگر رومی جنرل اس کو پھر دوسری طرف لگانے گیا یعنی دوسرے شہر پر جاکر چڑھائی کی۔ اور جب ہنی بال اس طرف گیا۔ تو رومیوں نے پھر آکر شہر کاپوا کو گھیر لیا۔ اور اس مرتبہ رومیوں نے اس قدر مضبوط مورچہ بندی کی تھی۔ کہ جب ہنی بال نے آکر محاصرہ اٹھانے کی کوشش تو وہ ناکام رہا۔ لیکن اس کے جواب میں ہنی بال نے یہ چال چلی کہ اُس نے شہر روما پر چڑھائی کر دی لیکن کاپوا یا روما میں کسی جگہ بھی رومی جرنیل ہنی بال کی اس چال سے دھوکے میں نہ آئے۔ انہوں نے کاپوا کا محاصرہ بدستور قائم رکھا۔ صرف ایک مختصر سی فوج ہٹا کر روما کے لئے بھیجدی۔ جہاں بہت سی جدید فوج بھرتی ہو کر پہلے ہی موجود ہو گئی تھی۔ جب کاپوا میں اہل روما نے پھر قبضہ کر لیا۔ تو ہنی بال کو اپنے آدمیوں کے سوائے اور کسی طرف سے امداد و اعانت کی توقع نہ رہی۔ کارتھیج کی طرف سے اس کو بہت قلیل کمک پہنچی تھی۔ کیونکہ اہل کارتھیج فنیقی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ قوم سوداگروں اور دوکانداروں کی قوم تھی۔ جو صرف اس خیال سے جنگ کو پسند کرتی تھی۔ کہ فتوحات کے ذریعہ سے تجارت کے لئے جدید میدان ہاتھ آئیں گے۔ وہ نہ وسعت سلطنت کے خواہاں تھی نہ انتقام کی۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہُوا کہ اس قوم میں افتراق پیدا ہو گیا۔ صلح پسندوں کی ایک طاقتور پارٹی پیدا ہو گئی جو ہنی بال کی سخت مخالف تھی۔ جب ہنی بال نے لکھا کہ "میں نے دشمن کی فوجیں تہ تیغ کر دی ہیں اب مجھے سپاہی بھیجو۔"

تو مخالفین یہ کہتے ہیں کہ جب دشمن کی فوجیں نیست و نابود ہو گئی ہیں تو پھر فوج کی کیا ضرورت ہے

اگر ہنی بال لکھتا کہ میں نے رسد اور مال غنیمت سے بھرے ہوئے دشمن کے کیمپ فتح کر لئے ہیں مجھے روپیہ اور سامان بھیجو

تو مخالفین کہتے کہ جب کیمپوں کا سامان رسد اور مال ہاتھ آ گیا ہے تو مزید رسد اور روپیہ کی کیا ضرورت ہے

جب وطن سے ہنی بال کو مدد نہ پونچی تو اب صرف یہ امید باقی رہ گئی کہ اپنے ہسپانوی مستقر سے مدد طلب کی جائے۔ لیکن اس میں رومیوں نے مزاحمت کی یعنی باوجودیکہ اس وقت رومیوں کو خود اپنا گھر بچانے کے لئے فوجوں کی سخت ضرورت تھی۔ مگر اُنہوں نے ہسپانیہ میں برابر اپنی بڑی بڑی فوجیں قائم رکھیں۔ اور دو مشہور رومی جرنیلوں نے کارتھیج کی فوجوں کو ہسپانیہ میں پوری طرح مصروف رکھا۔

اب ہنی بال کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ کیونکہ رومی فوجوں نے اُسے جنوبی اطالیہ میں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ اور روز بروز یہ حلقہ تنگ ہوتا جاتا تھا۔

۵

کنّا کے میدان جنگ سے چند میل کے فاصلہ پر مقام کانوسیم ہنی بال کا کیمپ پڑا ہوا ہے۔ اور اس کے سامنے ہی رومی سپاہ خیمہ زن ہے جس کی کمان اس وقت نیرو Nero کے ہاتھ میں ہے۔ ایک نیرو یہ ہے۔ جو اس وقت کارتھیج کی تباہی پر کمر بستہ ہے اور اب سے

تین صدی بعد ایک اور شیر پیدا ہوگا۔ جو خود روم کو تباہ کر دیگا۔ ہنی بال کی فوج نے دیکھا کہ رومی کیمپ سے ایک جماعت برآمد ہوئی۔ اور جب وہ آگے بڑھی تو ہنی بال کی فوج نے شناخت کیا۔ کہ ایک فوجی دستہ کی حراست میں پابزنجیر افریقی قیدیوں کی ایک جماعت ہے۔ اس کے بعد بدرقہ کے سپاہیوں میں سے ایک جوان آگے بڑھا۔ اور اس نے زمین پر ایک کٹا ہوا سر پھینکا۔ اس کے بعد یہ جماعت واپس ہوگئی۔ یہ تماشہ دیکھ کر ہنی بال کی فوج کو تحقیقات حالات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور چند سپاہیوں نے آگے بڑھ کر وہ سر اٹھا لیا۔ اور ہنی بال کے پاس لے گئے۔ ہنی بال نے جب یہ سر دیکھا۔ تو اپنے بھائی سے مشابہ پایا۔ اسوقت گویا ہنی بال کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا۔ کہ اُس کا بھائی ہدروبال بھی اطالیہ میں موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد رومیوں نے دو قیدی رہا کر دئے۔ جنہوں نے ہنی بال کے پاس آکر کاریخنیج رومیوں کے حملہ اور اس کے ہدروبال کی شکست اور قتل کا مفصل حال بیان کیا۔

اب ہنی بال نے سمجھ لیا۔ کہ فتح کی آخری اُمید بھی زائل ہوگئی اسلئے اس نے وہ مقام چھوڑ دیا۔ جہاں نو برس پیشتر اس نے رومیوں کو اس قدر ذلیل شکست دی تھی۔ اب وہ برو ٹیم پہنچ گیا۔ جو اطالیہ کے جنوب میں واقع ہے۔ یہاں رومیوں نے اُسپر چاروں طرف سے نرغہ کیا اور گھیر لیا۔ وہ اس ایک زخمی شیر کی مانند تھا جسے شکاریوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا مگر سامنے کوئی نہیں آتا تھا۔ سوائے ہنی بال کے مقابلہ کے اب رومیوں کو ہر جگہ فتح حاصل ہوتی تھی۔ لیکن ہنی بال کے سامنے وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ سولہ برس تک ہنی بال ایک غیر ملک میں چاروں طرف شمشیر زنی کرتا پھرا اور کسی جگہ اس نے پشت نہ دکھائی۔ اور واقعہ کتنا

کے بعد تو اس سے کبھی اُنکو ملانے والا نہ ہوتا تھا اُنکو کسی طرف سے مدد نہیں ملتی تھی مگر وہ جنگ کو جنگ ہی کے ذریعے سے جاری رکھتا تھا اور یہ وہ کارنامہ ہے جسکی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ایک مختلف الطبائع سپاہ کو اسطرح متفق و متحد رکھنا کوہستان ایلپس کی برف پوش چوٹیوں کو طے کر کے اطالیہ کے قلب میں گھس جانا ہنی بال ہی کا کام تھا سپاہی گھوڑوں کی تحلیل پر باشت کرتے تھے رسد نہ ملنے پر فاقہ کشی کرتے تھے لیکن وہ اپنے سپہ سالار کے ایسے وفادار اور جان نثار تھے کہ اس سے دغا کرنا تو درکنار اس کا ساتھ چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہ لاتے تھے۔ حالانکہ اس وقت چودہ سال سے ہنی بال کا اقبال مسلسل طور پر زوال پذیر تھا۔ ہنی بال اگرچہ چاروں طرف سے گھر گیا تھا مگر رومی فوجیں اس سے دور رہتی تھیں۔ اور جس وقت وہ اطالیہ سے روانہ ہوا۔ تو کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ اُسے روک سکے۔

اطالیہ میں رہ کر رومیوں سے انتقام لینے کا منصوبہ پورا نہ ہونے پایا تھا۔ کہ کارتھیج میں اس کو فوراً طلب کر لیا گیا۔ کیونکہ اس وقت سیپیو رومی جنرل کی طرف سے خود کارتھیج کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ یہ وہی نوجوان رومی جنرل ہے جس نے اہل کارتھیج کو ہسپانیہ میں شکست پر شکست دی۔ تمام ملک فتح کر لیا۔ اور جو سلطنت جنرل ہملکار برقہ نے اسی قدر محنت سے قائم کی تھی۔ اُسکی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور اب وہ خود افریقہ میں جا گھسا تھا۔ تاکہ کارتھیج پر حملہ کر کے ہنی بال سے انتقام لے۔ رومہ کے دارالاعیان نے سیپیو کو ہر چند منع کیا۔ کہ وہ افریقہ نہ جائے۔ اور جہاں تک ہو سکے احتیاط سے کام لے۔ مگر اس نے کچھ پرواہ نہ کی اور خود ہنی بال کے گھر پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ دارالاعیان کی یہ ہدایت تھی۔ کہ اطالیہ میں دشمن کے تعاقب میں تمام طاقت صرف کی جائے مگر سیپیو نے یہی پسند کیا۔ کہ دشمن پر عقب

سے حملہ کیا جائے۔ جب جنرل سیپیو نے دار الاعیان کا حکم نہ مانا تو وہ اُسکی اس گستاخی پر سخت برافروختہ ہوئے تو انہوں نے اس کے خلاف ایک لغو سا الزام عاید کرکے سیپیو کو برخاست کر دینا چاہا لیکن جب وہ اس میں بھی کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے یہ طے کیا کہ سیپیو کو روم کی طرف سے اتنی ہی مدد دی جائے جتنی مدد کارتھیج نے اس کے حریف ہنی بال کو دی تھی۔

سیپیو جزیرہ صقلیہ سے چل کھڑا ہوا۔ اور ساحل افریقہ پر اپنے قدم جما لئے۔ اس کے بعد آگے بڑھا۔ اور اس نے کارتھیج اور اس کے حلیفوں کی فوجوں کو شکست پر شکست دینا شروع کر دی۔ اور قبل اس کے کہ ہنی بال کارتھیج کی مدد کو پہنچے سیپیو نے اہل کارتھیج کو اس قدر زکیں دیں کہ وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن جب یہ خبر معلوم ہوئی کہ ہنی بال افریقہ میں آ گیا ہے۔ تو اہل کارتھیج کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور انہوں نے صلح نامہ توڑ دیا۔ اس وقت سیپیو کی حالت جو غیر ملک میں گھسا ہوا لڑ رہا تھا۔ اس قدر خراب ہو گئی کہ وہ پریشان ہو گیا۔ لیکن اس نے جنگی نقطہ نظر سے اس قدر عمدہ چال چلی کہ بہت جلد قسمت کا پانسہ اس کے موافق پڑنے لگا یعنی بجائے اس کے کہ وہ پسپا ہو کر اپنے ساحلی مستقر پر واپس آ جائے حوصلہ کر کے اندرون ملک کیطرف اور آگے بڑھ گیا۔ سیپیو کی اس نقل و حرکت سے کارتھیج کا ذریعہ رسد رسانی خطرہ میں پڑ گیا۔ لیکن فوراً ہی ہنی بال نے پہنچ کر اسے ایک میدان میں گھیر لیا۔ جہاں سے اس کو اہل بربر کی طرف سے بھی کمک پہنچنے کی اُمید تھی۔

۶

سنہ ۲۱۶ ق م کا زمانہ ہے۔ اور دامہ کے میدان جنگ پر آفتاب غروب ہو رہا ہے ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف لاشوں کی قطار کے پیچھے سے رومی فوج کی ایک قطار بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جو غیر متوقع طور پر بہت لمبی ہے اور ہر شخص اس خوف سے کہ اس زمین میں جہاں خون کے دریا بہہ گئے تھے۔ پاؤں پھسل جائے پھونک پھونک کر قدم آگے ڈال رہا تھا۔ دن بھر کشت و خون میں گزر گیا تھا۔ اور ہنی بال عرصہ دراز سے اسی وقت کا منتظر تھا۔ اس نے اپنی پرانی اور جنگ آزمودہ چوبیس ہزار فوج کو جو اطالیہ سے اس کے ساتھ آئی تھی۔ آگے بڑھایا۔ دونوں فوجیں گتھ گئیں۔ اور گھمسان کا رن پڑنے لگا۔ اتنے میں کارتھیج کی سپاہ کی عقبی صفیں اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنتی ہیں۔ یہ آوازیں سیپیو کی سوار فوج کی تھیں۔ جو عین وقت پر دشمن کا تعاقب کر کے واپس آ گئی تھیں۔ اور یہی وہ چال تھی۔ جو رومی جرنیل نے خوب سوچ سمجھ کر چلی تھی۔ اب جو حالت معرکہ کنتا میں رومی فوج کی ہوئی تھی۔ وہی حالت اب کارتھیج کی فوج کی ہوئی۔

۷

چند ہفتہ بعد ـــــ شہر کارتھیج میں کیا ہو رہا ہے مجلس ملیہ میں ان شرائط صلح پر بحث ہو رہی ہے۔ جو نوجوان رومی جنرل سیپیو کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔ شرائط خلاف توقع بہت نرم ہیں۔ باوجودیکہ اس وقت کارتھیج کی حالت بہت خراب ہے۔ مگر ایک فصیح البیان مقرر ابھی تک اسی بات پر زور دے رہا ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے۔ ہنی بال ایسی باتیں

سنتے سنتے تھک گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس نے اُس شخص کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا جب ہنی بال کی اس حرکت پر اسمبلی میں ہر طرف سے اظہار ناراضی ہونے لگا۔ تو اس نے یہ کہہ کر معافی مانگ لی کہ چونکہ اسے ۳۶ برس ملک سے باہر جنگ کرتے گذرے ہیں۔ اس لئے وہ آداب مجلس سے واقف نہیں۔ اس کے بعد ہنی بال نے مجلس سے درخواست کی کہ سیپیو کی پیش کردہ شرائط صلح منظور کرلی جائیں۔

صلح ہوگئی۔ اور ہنی بال نے شرائط صلح کی سات برس تک حرف بحرف پابندی کی۔ اور اپنی خداداد قابلیتوں سے جنگ کی بجائے ملکی نظم و نسق کی درستی کا کام لینے لگا۔ اور چند روز میں کارتھیج پہلے کی طرح پھر خوشحال ہوگیا۔ روم سے انتقام کی جو زبردست اسکیم اس نے سوچی تھی۔ کیا اس کے غیر کامیاب ہونے کے ساتھ ہی اس کی طبیعت بھی بدل گئی۔ یعنی تخریبی مشاغل کو فضول سمجھ کر اب وہ ہمیشہ کے لئے تعمیری مشاغل میں مصروف رہیگا۔ یا اس کا مقصد یہ ہے کہ فرصت کا وقت غنیمت سمجھ کر وہ خود کو اس قدر طاقتور بنالے کہ پھر روم سے انتقام لینے پر آمادہ ہوجائے؟ یہ راز کبھی نہیں کھل سکتا۔ کیونکہ اب ایک جدید جذبۂ انتقام پیدا ہوگیا تھا۔ اور روم کا جذبہ انتقام ہنی بال کے خلاف تھا۔ جنرل سیپیو نے ہر چند سفارش کی کہ شخص واحد کے خلاف اس قدر شدید جذبۂ انتقام پیدا کرنا روم کی شان کیخلاف ہے۔ مگر کسی نے نہ سُنا۔ اور کیٹو نے اہل کارتھیج کو ہر طرح ستانا شروع کردیا۔ جب ہنی بال کو اپنی جان کا خوف ہوا تو وہ جہاز میں سوار ہوکر کارتھیج سے روانہ ہوا۔ اور اس نے پھر رومیوں سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ ممالک مغرب کو رومیوں کے

خلاف اُبھارنے میں تو وہ ناکام رہا تھا۔ اب اس نے ممالک مشرق کو روم کا دشمن بنانے کی کوشش کی۔ اور وہ بقیہ عمر اسی فکر میں گذارتا رہا کہ جس ملک سے اس کے آباء واجداد آئے تھے۔ اُسی ملک کو روم کےخلاف صف آرا کیا جائے۔ وہ بادشاہ شام ملک انطیوکس کے دربار میں جاتا ہے۔ (جو اس فکر میں ہے کہ رومیوں کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے کے لئے ملک یونان پر حملہ آور) اور یہ تجویز پیش کرتا ہے۔ کہ ملک انطیوکس یونان کی طرف سے اور وہ خود کارتھیج کیطرف سے اطالیہ پر حملہ آور ہو۔ اور اس طرح رومیوں پر دو طرف سے ضرب لگائی جائے۔ لیکن انطیوکس کسی قدر تنگ مزاج آدمی واقع ہوا تھا۔ اس لئے یہ سکیم پوری نہ ہوئی کچھ دنوں بعد ایک رومی فوج نے ایشیاء کوچک پر حملہ کیا۔ اور اس طرح ملک انطیوکس بھی مغلوب ہو گیا۔ رومیوں نے جو شرائط صلح پیش کی ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہنی بال کو حوالہ کر دیا جائے۔ لیکن ہنی بال کو عین وقت پر خبر ہو گئی اور وہ پہلے جزیرہ کریٹ کو اور بعد ازاں ملک بیتھنیا کی طرف چلا گیا۔ جہاں کے بادشاہ پروسیاس نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔

۵

غروب آفتاب کا وقت ہے۔ شام کے دھندلکے پر رات کی تاریکی غالب آتی جاتی ہے۔ جو محل شاہ پروسیاس نے ہنی بال کے رہنے کے لئے دیا تھا۔ اس کا ایک سیاہ پوش جماعت محاصرہ کر رہی ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک مسلح جماعت اندر داخل ہو جاتی ہے۔ ہنی بال جانتا تھا کہ چند روز سے رومیوں کا ایلچی شاہ پروسیاس کے دربار

میں آیا ہوا ہے۔ اس لئے وہ خوب سمجھتا تھا۔ کہ کوئی کارروائی ضرور ہونے والی ہے اور وہ یہ بھی خوب جانتا تھا۔ کہ بادشاہوں کے وعدے کس قدر پختہ اور استوار ہوتے ہیں۔ ہنی بال کے ملازم دوڑ کر جاتے ہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ بچنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں انہوں نے اس دن کیلئے محل سے باہر نکلنے کا ایک خفیہ راستہ بھی بنا لیا تھا۔ مگر ہر جگہ شاہی سپاہیوں کو متعین دیکھا۔ لیکن اس وقت ہنی بال کے سامنے ایک راستہ ضرور کھلا ہوا تھا۔ اور یہ وہ راستہ تھا۔ جسے کوئی بند نہ کر سکتا تھا ہنی بال نے فوراً زہر طلب کیا جو اسی مقصد کے لئے عرصہ سے تیار کر لیا گیا۔ اور پورے اطمینان سے ساتھ زہر ہاتھ میں لے کر اس نے یہ کہا۔

"مجھے اب اس خطرہ کا خاتمہ کر دینا چاہیئے جس میں اہل روما عرصے سے گرفتار رہے ہیں۔ کیونکہ شاید وہ اس قدر انتظار نہیں کر سکتے۔ کہ میں اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ان کو مطمئن کر دوں"

یہ کہہ کر اس نے جام زہر خالی کر دیا۔ آخر کار اس طرح اس شخص کا خاتمہ ہوا۔ جو دنیا کی تاریخ کو یقیناً بدل دیتا۔ اگر اس کی مدد اہل ملک نے وقت پر کی ہوتی۔

نگار اکتوبر ۱۹۳۱ء

تصویرِ افکار

موت کا فرشتہ ایک چھوٹے بچے کے بستر مرگ پر اپنے بازو پھیلائے ہُوئے کھڑا ہے۔

یہ بچہ جو سارے گھر کا چراغ اور تمام خاندان کے دِل کا سرور تھا ، بیمار ہے ——

عمر کے تین سال گزرے تھے کہ بیمار ہوگیا۔

اس مرنے والے بچّے کے کمرے میں ایک ہیبت ناک سکوت طاری ہے اور سوائے

غمگین ماں کی ٹھنڈی سانسوں کے وہاں کوئی آواز نہیں سُنائی دیتی ۔

ماں نے اپنا سر ہاتھوں پر ڈال دیا ۔ اور زمین کی طرف دیکھ کر رونے لگی ۔

کیسا ہولناک منظر تھا۔ کہ موت کا فرشتہ خدا کی ودیعت کو خدا کے پاس لیجانے کے لئے آمادہ تھا۔

..... " اے موت! رحم کر۔ اس بچّہ پر شفقت کر۔ اس کی ماں کے دل کو نہ دکھا۔ مجھے اس کے عوض لے جا۔ اور اس ننھے بچے کو چھوڑ جا تاکہ بعد کو اس کی ماں کی زندگی تباہ وبرباد نہ ہو۔ اس کی زندگی کے فدیہ میں میری جان کو قبول کرلے "

موت کا سایہ آہستہ آہستہ ہٹا اور باپ سے اشارہ کیا کہ ایسا ہے تو میرے پیچھے آؤ "میں اس کائنات کی اخیر حد تک تیرے ساتھ چلوں گا۔ اور وادیٔ مرگ میں تیرے ساتھ رہونگا۔ کیونکہ مجھے بچہ کی جان زیادہ عزیز ہے پس اے موت چل، آگے ہو "

موت کا سایہ سرعت برق کیساتھ ہوا کے بازوں پر چلا اور غمگین باپ اسکے پیچھے ہولیا۔ موت اس کو پہلے ایک باغ میں لیگئی۔ اونچے اونچے درختوں کے نیچے سے گھنے درختوں کے سایہ سے، کنجوں اور پھولوں کے درمیان سے اسے لے گئی۔ اور شہر میں اس کے کارخانوں کے سامنے سے گزرا پھر یہاں سے دوسری سڑک پر لے گئی۔ اس کے دوست احباب کو دکھایا۔ ان کی آواز سنائی۔ اور ایک بنک کے سامنے لیجاکر کھڑا کردیا۔ تاکہ وہ محنت وکوشش، نفع ونقصان اور دنیاوی جد وجہد کا تماشہ دیکھے۔

انسانی اغراض ایک دوسرے سے قریب ہو کر باہم متعارف ہوتے ہیں پھر ان میں اختلاف ہوتا ہے۔ تو ایک دوسرے کو شکست دینا چاہتا ہے۔ حرص وطمع۔ عقل انسانی کو مبتلا فریب کرکے اس عالم کے ساتھ محبت کی ریشمی زنجیر سے جکڑ دیتی ہے حالانکہ یہ

عالم خاموشی کے ساتھ، دقائق حیات کو ہضم کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔

موت کا سایہ پھر شہر کے دروازہ پر جاتا ہے کہ وہاں سے روحوں کے مستقر پہ لیجائے

آفتاب کی طلائی کرنیں شہر کے برجوں پر لوٹ رہی تھیں کہ باپ نے وداعی نگاہ شہر پہ

ڈالی۔ اس کی پنڈلیاں کانپنے لگیں اور وہ بولا۔

"اے موت مجھ پہ رحم کر۔ میرے لئے مرنا ممکن نہیں ہے اور نہ اپنے سوا کسی اور کیلئے

اپنی قربانی چڑھا سکتا ہوں۔ میں ابھی جوان ہوں اور اس دنیا کی لذتیں مجھے ابھی زندہ رہنے کی دعوت

دے رہی ہیں پس اے موت مجھے چھوڑ دے اور جس کو تیرا جی چاہے لیجا۔"

موت واپس آئی اور پھر بچہ کے بستر پہ بازو پھیلا کر چھا گئی۔

بھائی آیا اس حال میں کہ اس کے چہرہ سے رنج و ملال ٹپک رہا تھا۔

"ماں!"

لیکن ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بدستور روتی رہی۔

بھائی نے نگاہ اٹھائی تو موت کو دیکھ کر کانپ گیا۔ پھر اپنے بھائی کے چہرہ کو دیکھا تو

اُسے زرد پایا۔

"اے موت! شہر میں اور بہت سے بچے ہیں۔ ان میں سے کسی کو لیجا۔ تو اسی بچہ کا انتخاب

کیوں کرتی ہے۔ جس کو ہم لوگ اس قدر چاہتے ہیں۔ یا پھر اسی گھر میں سے کسی کو معاوضہ میں

قبول کرلے۔ میں اپنے بھائی کی جگہ مرنے کو تیار ہوں مجھے لیجا۔"

موت نے اشارہ کیا کہ میرے پیچھے آؤ۔ اور وہ ساتھ ساتھ ہو لیا۔

موت شہر کی سڑکوں پر اُسے لیگئی۔ اس کے ساتھیوں کو مدرسہ سے واپس آتے ہوئے کھیلتے ہوئے، گاتے ہوئے دکھایا۔ پڑوس کے لڑکے کو وہی گیت گاتے سنوایا۔ جیسے وہ خود بھی گایا کرتا تھا۔ پھر اس گھر کے پاس لے گئی جہاں اُس کی ایک ہمجولی لڑکی رہا کرتی تھی۔ اور جس کے ساتھ آج ہی صُبح کو اس نے ایک تصویر بنائی تھی۔ اس کے بعد وہ پھولدار درخت دکھائے جن کی تربیت میں وہ اس کا ساتھ دیا کرتا تھا۔ اور پھر اسی لڑکی کو ایک سایہ دار درخت کے نیچے دکھایا اس حال میں کہ وہ ایک کتاب کھولے ہوئے پڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد موت اسے تماشہ گھر میں لیگئی۔ جہاں اس نے اپنے ایک سلطی کو بکھیر گفتگو کرنی چاہی لیکن موت سرعت کی تھا چلی جا رہی تھی بھائی زمین پر غش کھا کر گر پڑا۔

موت نے مرعوب کن آواز سے کہا۔ "اُٹھ"

"نہیں اے موت رحم کر جس کو جی چاہے لیجا۔ مجھے چھوڑ دے"۔

موت پھر واپس آئی۔ اور بچّہ کے بستر پر اپنے بازو پھیلا کر قائم ہوگئی۔

بہن مدرسہ سے آئی اور اپنی ماں کے قریب پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ موت کا سایہ اس کے بھائی پر چھایا ہوا ہے۔ بولی۔

"اے ڈراؤنی موت تو یہاں کیوں آئی ہے۔ اور اس گھر سے کسے چاہتی ہے کیا تو میرے چھوٹے بھائی کی روح لیجانا چاہتی ہے۔ نہیں ایسا نہ کر۔ اس کے عوض مجھے لیجا"۔

موت نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ "میرے پیچھے آ"

بہن اس کے پیچھے ہولی۔

وہ اسے باغ میں لیگئی اور اس فوارہ کے پاس سے گذری جس کا پانی اسی طرح اچھل رہا تھا جیسے حیات کی تازگی اس کے رخساروں سے، اس نے بنفشہ کے درخت کو دیکھا جسے اس نے بویا تھا۔ اور ان پودوں پر نگاہ ڈالی جو اس کے ہاتھوں پھلے پھولے تھے پھر موت اس کو شہر کے ہر اس راستہ میں لے گئی جس سے وہ آگاہ تھی۔ اور آخر کار مدرسہ کے اس میدان میں لاکر کھڑا کر دیا۔ جہاں اس کی ہمجولی لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔ جب ان سب سے رخصت ہونے کیلئے اس نے اپنی آخری نگاہ ڈالی تو بیتاب ہوگئی۔ اور بولی کہ نہیں اے موت! نہیں میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی اور جس کو تیرا جی چاہے ساتھ لیجا۔"

موت پھر بچہ کے بستر کے قریب آگئی۔

اب اس کے دل کی دھڑکن بہت ضعیف ہوگئی تھی۔ اور نزع کا عالم طاری تھا۔ ماں نے چاہا کہ جھک کر اس کا آخری بوسہ لے لے لیکن پھر منہ ہٹا لیا کہ کہیں اسطرح اس کی آخری نبضِ حیات کم نہ ہو جائے۔

اُس نے اپنا سر اُٹھایا تو دیکھا کہ موت اب صرف بوسۂ وداع کی منتظر ہے ماں اپنے مرنے والے بچے کے پاس دو زانو ہوگئی۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی۔

" اے موت! رحم کر یہ ماں کی خاطر اسپر رحم کر۔ یہ بچہ میرے دل کا ٹکڑا ہے اس لئے مجھے اسکی قبر دیکھنے کیلئے زندہ نہ رکھ بلکہ مجھے یہ سعادت نصیب کر کہ وہ میری قبر پر آ کر کسی وقت کھڑا ہو۔"

موت نے اشارہ کیا اور ماں اس کے پیچھے ہولی۔

موت اُسے باغ میں لے گئی۔ تاکہ اپنے ہاتھ کے بوئے اور سنوارے ہوئے

درخت دیکھے۔ اس نے دیکھے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

پھر اسے شہر کی سڑکوں اور تفریح گاہوں میں لیگئی۔ لیکن یہ بھی بے اثر ثابت ہوا۔ اس کے بعد وہ اس انجمن میں لیگئی۔ جس کی یہ بھی ایک ممبر تھی۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

پھر وہ اُسے اس کی بہن کے گھر لیگئی جس سے وہ بہت محبت کرتی تھی۔ اس نے وہاں بچوں کا کھیلنا دیکھا۔ اور اپنی بہن کے کمرہ کے پاس سے جب کہ وہ پیانو بجا رہی تھی گزر گئی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لیکن موت سے برابر یہ تقاضا تھا۔ کہ "جلدی کے گراور ابدیت دروازہ پر مجھے جلد پونچا دے تاکہ میرا بچہ تندرست ہو جائے"

موت مسکرائی اور دفعتہً نظروں سے غائب ہوگئی۔

ہاں واپس آئی تو دیکھا کہ بچہ کی حالت بہتر ہے اور وہ کھیل رہا ہے۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء

ایک مدھک اور دو افسر

ایک زمانہ میں دو افسر تھے۔ جو اتنے کھلے دماغ کے تھے۔ کہ ایک دن وہ یکایک ایک غیر آباد جزیرہ میں اس طرح پہنچ گئے۔ کہ گویا وہ جادو کے قالین پر بیٹھ کر آ گئے ہیں۔ ان کی تمام زندگی ایک ایسے سرکاری محکمہ میں گزری تھی۔ جہاں ریکارڈ رکھے جاتے تھے۔ وہ دونوں وہیں پلے۔ وہیں ان کی پرداخت ہوئی، وہیں بڈھے ہوئے اور اسی وجہ سے اس محکمہ کے باہر کسی چیز کے بارے میں بھی وہ مطلق نہ جانتے تھے۔ اور جو الفاظ ان کو معلوم تھے وہ صرف یہ ہے۔

"آپ کی پوری عزت کا یقین دلاتے ہوئے میں ہوں آپ کا ادنیٰ خادم"

لیکن محکمہ تخفیف میں آ گیا۔ اور چونکہ ان دونوں کی خدمات کی اب ضرورت باقی

نہ رہ گئی تھی۔ اس لئے ان کو آزادی دے دی گئی۔ اس کے بعد یہ دونوں افسر سینٹ پیٹر برگ کی پوڈیا چکیا سٹریٹ میں اقامت گزیں ہو گئے۔ ہر ایک کا الگ مکان تھا، الگ ملازم اور علیحدہ پنشن۔

بہر حال اُس غیر آباد جزیرہ میں جب اُن کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ دونوں کے دونوں ایک ہی چھت کے نیچے لیٹے ہیں پہلے تو ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ کیا ہوا اور آپس میں اس طرح گفتگو کرتے رہے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"یور اکسلنسی! رات کو میں نے بھی کیا عجیب خواب دیکھا ہے"۔ ایک افسر نے کہا "ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ایک غیر آباد جزیرہ میں آگیا ہوں۔

وہ یہ الفاظ اچھی طرح سے کہنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ یکایک اُچھل پڑا۔ دوسرا افسر بھی اسی طرح گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے غضب، یہ سب کیا ہے؟ ہم ہیں کہاں؟ وہ دونوں نہایت استعجاب کے عالم میں چلانے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو چھوا تاکہ یہ یقین ہو جائے کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اور پھر اس تلخ حقیقت کا انہیں یقین کرنا ہی پڑا۔

اُن کے سامنے سمندر لہریں مار رہا تھا۔ اور ان کی پشت پر زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ جس کے بعد پھر سمندر ہی سمندر تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ رونے لگے ـــــ اپنے محکمہ کی تخفیف میں آنے کے بعد پہلی مرتبہ ـــــ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ دونوں اپنی شب خوابی کی قمیض کے علاوہ اور کچھ نہیں پہنے ہیں۔ البتہ ان کا تمغہ ضرور

گلے میں اٹک رہا ہے۔

" اب اس وقت کافی آجانا چاہیئے"۔ ایک افسر نے کہا مگر اسے پھر اپنی حالت کا خیال آگیا اور رونے لگا۔

" اب ہم کریں تو کیا کریں" اس نے روتے ہوئے کہا "اگر ہم یہ بھی فرض کرلیں کہ ہمیں ایک رپورٹ تیار کرنا ہے تو بھی ہم کو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

" اب آپ کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ یور اکسلنسی"۔ دوسرے افسر نے جواب دیا۔ "آپ مشرق کی طرف جائیے۔ اور میں مغرب کی سمت جاؤنگا۔ شام کیوقت ہم لوگ پھر یہیں ملیں گے۔ اور ممکن ہے کہ اس درمیان میں کسی بات کا پتہ چل جائے"۔

چنانچہ پہلے تو انہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ مشرق کدھر ہے۔ اور مغرب کدھر۔ پھر انہیں خیال آیا۔ کہ ان کے محکمہ کے افسر اعلیٰ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "اگر تمہیں یہ جاننا ہے کہ مشرق کس طرف ہے تو اپنا منہ شمال کی سمت کرلو۔ اور مشرق تمہارے داہنے طرف ہوگا"۔ مگر جب انہوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کہ شمال کدھر ہے تو وہ داہنی طرف بھی گھومے، بائیں طرف بھی اور چاروں طرف دیکھا بھی۔ مگر زندگی بھر تو ریکارڈ کے محکمہ میں رہے تھے۔ ان کی یہ تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

" یور اکسلنسی، میرے خیال میں تو بہتر یہ ہوگا۔ کہ آپ داہنی طرف جائیے اور میں بائیں طرف"۔ ایک افسر نے کہا جس نے نہ صرف ریکارڈ کے محکمہ میں کام کیا تھا۔ بلکہ اسکول میں خوشنویسی کا استاد بھی رہ چکا تھا۔ اور اسی وجہ سے کچھ زیادہ ہوشیار بھی تھا۔

خیر۔اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ ایک افسر اپنے داہنے سمت چلا۔ چلتے چلتے وہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب پونچا جن میں ہر قسم کے پھل لگے تھے۔ وہ ایک امرود ضرور توڑ لیتا۔ مگر وہ اتنے اونچے تھے۔ کہ اُسے اُوپر چڑھنا پڑتا۔ اُس نے چڑھنے کی کوشش کی مگر بے سود، بلکہ اور نقصان یہ ہوا کہ اس کی قمیض بھی پھٹ گئی۔ اس کے بعد وہ ایک چشمہ کے پاس پہنچا۔ اس میں مچھلیاں کثرت سے تھیں۔

"کیا عمدہ بات ہوتی اگر یہ تمام مچھلیاں ہمارے پاس پوڈیا چکیا اسٹریٹ میں ہوتیں!" اُس نے خیال کیا اور اس خیال کے آتے ہی اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ پھر وہ جنگل میں داخل ہوا۔ اور یہاں اُسے تیتر، جنگلی مُرغ اور خرگوش دکھائی پڑے۔

"ارے اللہ۔ اس قدر افراط سے کھانا" اُس کو بھوک شدت سے لگ رہی تھی۔ لیکن آخر کار اُسے خالی ہاتھ واپس ہونا پڑا۔ دُوسرا افسر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

"یور اکسلنسی! فرمایئے کیسی گزری کچھ ملا؟"

"ماسکو گزٹ کے ایک پُرانے نمبر کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔"

دونوں افسر سونے لیٹ گئے، مگر اُن کے خالی پیٹوں کی بدولت انہیں آرام نہ ملا۔ ان کی نیند کچھ تو اس خیال سے دور بھاگ رہی تھی کہ اب ان کی پنشن سے کون مزہ اُڑا رہا ہو گا۔ اور کچھ ان پھلوں، مچھلیوں، تیتروں، مرغوں اور خرگوش کے خیال سے جنہیں دونوں نے جنگل میں دیکھا تھا۔

"غذائے انسانی اپنی اولین صورت میں اُڑتی ہے، تیرتی ہے اور درختوں پر اُگتی

ہے۔ بھلا کس کو یہ خیال ہو سکتا تھا۔ یور اکسلنسی" ایک افسر نے کہا۔

" یقیناً دوسرے نے جواب دیا " اس کا تو میں بھی اقرار کرتا ہوں کہ مجھے بھی یہی خیال ہوتا تھا کہ ہمارا ناشتہ دنیا میں ٹھیک اسی طرح نازل ہوتا ہے۔ جیسا وہ ہمارے سامنے میز پر آتا ہے"

" تو اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اگر ہمیں تیتر کھانا ہے۔ تو ہمیں پہلے اُسے پکڑنا چاہیئے اُسے مارنا چاہیئے۔ اُس کے پر نوچنا چاہیئں اور پھر اُسے بھوننا چاہیئے۔ مگر یہ ہو تو کیسے ہو؟"

" ہاں! یہ کیسے ہو" دوسرے افسر نے بھی کہا۔

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے اور کوشش کی کہ سو رہیں مگر بھوک ان کی نیند کو دور بھگا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تیتروں اور بطخوں کے جھنڈ اور سور کے گلّے آ رہے تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کے سب نہایت چربیلے اور زیتون میں تیار کی ہوئی غذائیں ہیں

" مجھے تو اتنی بھوک لگی ہے کہ اپنا جوتہ بھی کھا سکتا ہوں" ایک افسر نے کہا۔

" دستانے بھی بُرے نہیں ہیں خصوصاً جب وہ نرم نرم ہوں" دوسرے افسر نے کہا۔

دونوں افسر ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے مصیبت کی پیشین گوئی کرنے والی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ دانت کٹکٹا رہے تھے۔ اور ان کے سینوں سے آہیں نکل رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ اور یکایک ان میں وحشت پیدا ہو گئی۔ یکایک غرّانے کی آواز آئی۔ اور جو افسر خوشنویسی کا اُستاد رہ چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کا تمغہ کاٹ کر چبا لیا۔ مگر خون دیکھتے ہی اُن کے

ہوش و حواس پھر درست ہو گئے۔

"خدا خیر کرے"۔ انہوں نے بیک وقت نہایت گھبراہٹ میں کہا۔ ہم ایک دُوسرے کو کھا جانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ یہ آخر ہم کو ہو کیا گیا ہے۔ کونسی بلا ہم لوگوں پر مسلط ہو گئی"۔

"اچھا تو اب ہم کو وقت کاٹنے کے لئے کوئی دلچسپ گفتگو کرنا چاہئیے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ کوئی واردات قتل کی نہ ہو جائے"۔ ایک افسر نے کہا۔

دوسرے نے جواب دیا۔ "اچھا آپ شروع کیجئے"۔

اس نے کہا۔ "کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ سورج پہلے طلوع ہوتا ہے۔ اور بعد کو غروب۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کے برعکس کیوں نہیں ہوتا"؟

"آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ یور ایکسلنسی۔ آپ پہلے بیدار ہوتے ہیں پھر دفتر جاتے ہیں وہاں کام کرتے ہیں۔ اور رات کو سونے کیلئے لیٹتے ہیں"؟

"لیکن اس کے برخلاف کیوں نہ فرض کیا جائے۔ یہ کہ ایک شخص پہلے سوتا ہے۔ سونے کی حالت میں ہر قسم کے خواب اور شکلیں دکھائی پڑتی ہیں اور اس کے بعد بیدار ہوتا ہے"

"ہاں خیر۔ لیکن جب میں افسر تھا تو میں ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا۔ کہ اب صبح ہوئی ہے پھر دن ہوگا پھر رات کے کھانے کا وقت آئیگا۔ اور پھر سونے کا وقت آ جائیگا۔

"رات کے کھانے" کے الفاظ نے دن کی سرگرمیاں دونوں کو یاد دلا دیں اور اس خیال نے دونوں افسروں کو افسردہ کر دیا جس سے گفتگو رک گئی۔

"ایک ڈاکٹر نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا۔ کہ انسان صرف اپنے جسم کے عرق پر عرصہ

تک زندہ رہ سکتا ہے"۔

" ایک افسر نے کہا۔

" اُس کا کیا مطلب ہے؟

" یہ تو بالکل آسان ہے آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کی ذاتی رطوبتیں اور مزید رطوبتیں پیدا کرتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ سب عرق ختم ہو جاتے ہیں"۔

" پھر کیا ہوتا ہے؟

" اس کے بعد پھر غذا پہنچانا ضروری ہوتی ہے"۔

لاحول ولا۔۔۔۔۔!

غرضیکہ دونوں افسر جس موضوع پر بھی گفت گو کرتے تھے۔ سلسلۂ کلام کھانے پر جاکر ختم ہوتا تھا جس سے ان کی بھوک میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ گفتگو کا سلسلہ ہی ختم کر دیا جائے۔ اتنے میں انہیں "ماسکو گزٹ" کا خیال آیا جو ایک افسر کو مل گیا تھا۔ اور دونوں نے اسے اٹھا کر نہایت اشتیاق سے پڑھنا شروع کیا۔

میئر کی دعوت"

" سو آدمی کھانے پر مدعو کیے گئے تھے۔ دعوت اتنے شاندار پیمانہ پر تھی۔ کہ اس کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ دیوتاؤں کی اس دعوت میں مختلف صوبوں کے نمائندوں کی سوغات بیش بہا تحائف سے کی گئی۔

شکسنا کی سنہری مچھلی، قاف کے جنگلوں کا نقرئی تیتر اور ماسٹرابری وغیرہ نے مل کر

ایسا دلچسپ سامان مہیا کیا تھا۔ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

" بدمعاش! خدا کے لئے پڑھنا بند کر دیجئے۔ یور اکسلنسی۔ کیا آپ کو اور کچھ پڑھنے کو نہیں ملتا تھا؟"

دوسرے افسر نے نہایت ناامیدی کی حالت میں اس سے کہا۔ اور اپنے ساتھی کے ہاتھ سے اخبار چھین کر کچھ اور پڑھنا شروع کیا۔

" ہمارا نامہ نگار مقیم تولا ہم کو مطلع کرتا ہے کہ دریا میں ایک اسٹرجن مچھلی پائی گئی ہے یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو یہاں کے بڈھے لوگوں کو بھی یاد نہیں اور سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ انہوں نے اس اسٹرجن میں اپنے سابقہ پولیس افسر کو پہچانا چنانچہ اس چیز کے اعزاز میں کلب میں ایک دعوت دی گئی۔ دعوت کی خاص چیز لکڑی کی ایک کشتی میں جس کے چاروں طرف اچار اور مربے وغیرہ رکھے ہوئے تھے پیش کی گئی ڈاکٹر پی۔۔۔ جو کھلانے کے مہتمم (ٹوسٹ ماسٹر) تھے۔ ایسا انتظام کیا تھا کہ ہر شخص کو اسٹرجن کا ایک ٹکڑا ضرور مل جائے اس کے ساتھ مختلف قسم کی اور بہت لذیذ چٹنیاں "

" معاف کیجیئے گا۔ یور اکسلنسی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی پڑھنے والی عبارت کے انتخاب میں کچھ ملکہ نہیں ہے۔" پہلے افسر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا اور خود گزٹ لے کر پھر پڑھنا شروع کیا۔

ویانکا کے ایک بہت بوڑھے آدمی نے مچھلی کے شوربے کیلئے ایک تازہ اور بالکل نئے نسخہ کی تحقیق کی ہے۔ ایک زندہ (کاڈ فش) مچھلی لی جاتی ہے اور اس کو ایک ڈنڈے سے

سے اتنا پیٹا جاتا ہے کہ اس کا جگر غصہ سے پھول جاتا ہے . . . ."

افسروں کا سر جھک گیا جس چیز پر ان کی نظریں پڑتی تھیں۔ ان کا کچھ نہ کچھ کھانے سے تعلق ضرور ہوتا تھا۔ انہوں نے کھانے کی چیزوں کو اپنے دماغ سے بہت دور رکھنے کی کوشش کی۔ مگر سب بیکار۔ ان کے خیالات کسی مقناطیسی قوت کی وجہ سے گھوم گھوم کر پھر اسی چیز پر مجتمع ہو جاتے تھے۔ جس کے لئے وہ اس قدر بیتاب تھے۔

یکایک اُس افسر کو جس نے ایک زمانہ میں خوشنویسی سکھائی تھی۔ ایک الہام ہُوا۔

" وہ مارا" اُس نے نہائیت مسرت کے لہجہ میں پکار کر کہا۔ "کہئے آپ کا اس بارہ میں کیا خیال ہے۔

یور ایکسلنسی ـــ اگر ہم لوگ کسی " مذھک[1] " کو ڈھونڈھ لائیں تو آپ کی کیا رائے ہے"۔

" مذھک " ! یور ایکسلنسی ۔کس قسم کا" مذھک" ؟

" ارے بھئی ! یہی معمولی" مذھک" ویسا ہی" مذھک" جیسے سب" مذھک" ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے ناشتہ بھی لے آیگا اور تیتر اور مچھلیاں بھی"۔

" ہوں مذھک ! لیکن اگر یہاں کوئی مذھک نہ ہُوا تو کہاں سے لائیں گے" ؟

کیوں صاحب۔ کیوں نہ ہو گا۔" مذھک" ہر جگہ ہوتے ہیں۔ صرف ان کی تلاش شرط ہے۔ یہاں بھی کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوا ہو گا تاکہ اُسے کام نہ کرنا پڑے"۔

اس خیال نے دونوں افسروں کو اتنا مسرور کر دیا کہ وہ مذھک کی تلاش کے لئے

---

(۱) ایک ایسا ملازم جس کے سپرد تمام خدمتیں ہوتی ہیں۔

فوراً تیار ہو گئے۔ عرصہ تک وہ جزیرہ میں مقصود دلی حاصل کئے بغیر یونہیں گھومتے رہے لیکن کچھ دیر کے بعد کالی روٹی اور بھیڑ کی کھال کی خوشبو ان کی ناک میں آنے لگی۔ اور دونوں اسی خوشبو کی سمت چلنے لگے تھوڑی دور چلنے کے بعد درخت کے نیچے ایک منڈھک نظر آیا جو اپنے سر کے نیچے ہاتھ رکھے سو رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ شخص کام سے بچنے کے لئے وہ اس جزیرہ میں بھاگ آیا تھا۔ چنانچہ اُس پر افسروں کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"کیوں یہاں سو رہا ہے کاہل کہیں کا" دونوں افسر بگڑ کر کہنے لگے "کیا تجھے اتنا بھی خیال نہیں۔ کہ یہاں دو افسر بھوک کے مارے مرے جا رہے ہیں۔ اُٹھ کھڑا ہو چل کام کر" منڈھک کھڑا ہو گیا۔ اور ان دو آدمیوں کی طرف دیکھا جو اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے اُس کو خیال ہوا کہ وہ بھاگ جائے مگر افسروں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

اُسے اپنی قسمت کے آگے سر جھکانا اور کام کرنا پڑا۔

پہلے تو وہ ایک درخت پر چڑھا۔ اور افسروں کے لئے کئی درجن عمدہ امرود توڑے اور ایک سڑا ہوا سا اپنے لئے لے لیا۔ اس کے بعد اُس نے زمین کھودی اور کچھ آلو نکالے پھر اُس نے لکڑی کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے گھس کر آگ بنائی۔ اپنے بالوں کا اُس نے جال بنایا اور اُس سے تیتر پکڑے۔ اور اس آگ پر جو اب خوب جلنے لگی تھی۔ اُس نے اتنے اقسام کے کھانے پکائے کہ افسروں کے دلوں میں یہ خیال آنے لگا۔ کہ اس کاہل کو بھی کچھ دینا چاہئے منڈھک کی کوششوں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔ وہ یہ بھول چکے تھے۔ کہ اس سے قبل دن میں وہ کس قدر بھوکے تھے۔ اب ان کے دل میں صرف یہ خیال تھا۔

"افسر ہونا بھی کیا عمدہ چیز ہے کسی افسر پر کبھی کوئی مصیبت نہیں پڑ سکتی۔"

"اب آپ لوگوں کو اطمینان ہوا۔" مدھک نے دریافت کیا۔

"ہاں ہم تمہاری محنت کی داد دیتے ہیں۔" افسروں نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ مجھے تھوڑی دیر آرام کر لینے کی اجازت دیجئے گا؟"

"ہاں جاؤ، کچھ آرام کر لو مگر پہلے ایک مضبوط رسی بنا دو۔"

مدھک نے تیاور کے گٹھے اُٹھائے، ان کو پانی میں ڈالا۔ انہیں پیٹا، توڑا اور شام کو ایک نہایت عمدہ مضبوط رسی تیار کر دی۔ افسروں نے رسی لیکر مدھک کو ایک درخت سے باندھ دیا تاکہ وہ کہیں بھاگ نہ سکے اور پھر خود سو گئے۔

اسی طرح کئی روز گزر گئے اور مدھک اتنا ہوشیار ہو گیا کہ وہ افسروں کے لئے شوربہ تیار کرنے لگا۔ ادھر دونوں افسر کھا کھا کر خوب مگن رہنے لگے۔ ان کو اس بات کی اور خوشی تھی کہ یہاں انہیں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ ادھر سینٹ پٹرسبرگ میں ان کی پنشنیں جمع ہو رہی ہیں۔

"آپ کی کیا رائے ہے یور ایکسلنسی!" ایک دن ناشتہ کے بعد ایک افسر نے دوسرے سے کہا۔ "کیا منارہ بابل کا قصہ سچا ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال نہیں ہے کہ یہ محض ایک استعارہ ہے؟"

"کبھی نہیں یور ایکسلنسی! میرے خیال میں یہ واقعہ تھا۔ دنیا میں اتنی زبانوں کے وجود کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"تو سیلاب بھی آیا ہوگا؟"

"یقیناً۔ ورنہ پھر قبل سیلاب کے جانوروں کے وجود کی تشریح کیونکر کیجئے گا۔ اس کے علاوہ

"ماسکو گزٹ" لکھتا ہے۔ انہوں نے ماسکو گزٹ کے اسی پرانے نمبر کو پھر تلاش کیا اور سایہ میں بیٹھ کر اس کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھ ڈالا۔ انہوں نے ماسکو، ٹولا، تیزا اور ریازن کی دعوتوں کا تذکرہ بھی پڑھا اور تعجب ہے کہ اطعمہ لذیذہ کے بیان پر ان کو کچھ بھی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ زندگی کتنے عرصے تک بسر ہوتی لیکن انجام کار اب افسروں کے لئے وہ وبالِ جان ثابت ہونے لگی۔ وہ اکثر سینٹ پیٹرسبرگ میں اپنے باورچی کا خیال کرتے اور تنہائی میں دو آنسو بھی بہا لیتے۔

"معلوم نہیں پوڈیا چکیا اسٹریٹ میں کیا ہو رہا ہوگا۔ یور ایکسلنسی!" ایک افسر نے کہا۔

"اب اس کی یاد نہ دلائیے یور ایکسلنسی! مجھے تو گھر کا خیال مارے ڈالتا ہے۔"

"ہے تو یہ جگہ بہت اچھی مگر بھیڑ کے بچے کو اپنی ماں کے پاس جانے کی خواہش ضرور ہوتی ہے اور ان خوبصورت یونیفارموں کا خیال بھی رنجدہ ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو واقعہ ہے۔ چوتھے درجہ کا یونیفارم مذاق نہیں ہے۔ اس میں سنہری کارچوبی کا کام ہی ایسا ہے۔ کہ آدمی کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔"

اب یہ دونوں مذھک کا اس پر ناطقہ بند کرنے لگے کہ ہم کو پوڈیا چکیا اسٹریٹ پھر واپس لے چل۔ مذھک پوڈیا چکیا اسٹریٹ سے واقف تھا ایک مرتبہ اس نے وہاں شراب بھی پی تھی۔ مگر جیسا کہ مشہور ہے۔ اس کے منہ میں کچھ نہ گیا۔ البتہ داڑھی کی طرف سے سب بہہ گیا۔ بہرحال افسر خوش ہو گئے۔ اور کہنے لگے "ہم دونوں پوڈیا چکیا اسٹریٹ

کے رہنے والے افسر ہیں۔"

"اور میں ان میں سے ہوں — آپ کو یاد ہے؟ — جو مچان پر بیٹھتے ہیں اور باہر کی دیواروں پر سفیدی پھیرتے ہیں۔ میں ان میں سے ہوں جو چھتوں پر مکھیوں کی طرح چلتے ہیں"۔ مذھک نے جواب دیا۔ اب مذھک اس فکر میں پڑ گیا۔ کہ اپنے افسروں کو جو اس کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے رہے ہیں۔ اور اس کے کام کو کبھی برا نہیں کہا۔ اور زیادہ کیونکر خوش کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک جہاز بھی تیار کر لیا۔ اگرچہ وہ صحیح معنی میں جہاز نہ تھا۔ مگر کم از کم ایک ایسی کشتی تھی۔ جو انہیں سمندر سے نکال کر پوڈیاچکیا اسٹریٹ تک پونچا دے۔

"دیکھ بے کتے! ہوشیار رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم کو تو گرا دے"۔ افسروں نے کہا۔ جب کہ انہوں نے کشتی کو لہروں پر تھپیڑے کھاتے دیکھا۔

"ڈریئے نہیں۔ ہم مذھکوں کو اس کا بہت تجربہ ہے"۔ مذھک نے سفر کے سامان کی تیاری کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے اونی کپڑا جمع کر کے اپنے افسروں کے لئے دو نشستیں بنائیں۔ اور خود بھی بیٹھ کر کشتی چلانا شروع کر دی۔

راستہ میں دونوں افسر کتنے خوفزدہ رہے۔ طوفانوں میں وہ کتنے بیمار رہے۔ اور مذھک کو اسکی کاہلی پر انہوں نے کس کس طرح ڈانٹا۔ اس کی تفصیل مشکل ہے۔ مذھک راستہ بھر کھیلتا رہا اور اپنے افسروں کو مچھلیاں کھلاتا رہا۔ آخر کار انہیں نیوا دکھائی پڑی پھر کیتھرائن پونچے یہاں تک کہ پوڈیاچکیا اسٹریٹ بھی آگئی جب باورچیوں نے اپنے افسروں کو

کو ایسا موٹا تازہ اور خوش و خرم دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے ۔

افسروں نے کافی پی - رول کھایا - اور پھر اپنے یونیفارم پہن کر پنشن کے دفتر گئے
اس دو سال میں انہوں نے کتنا روپیہ جمع کر لیا تھا یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ مگر انہوں نے
ندھک کو بہلایا نہیں ۔ افسروں نے اُسے بھی وسکی کا ایک گلاس اور پانچ کوپک بھیجے !

میں اور ایک بچّہ

شہر اور اُس کے ہنگاموں سے دُور اُس راستہ پر جو خدیو اسماعیل کے قصر تک پہنچتا ہے۔ دریائے نیل کے ساحل پر ــــــ وہ دریائے نیل جو اپنی گہرائیوں میں گم ہو جانے والی بہت سی دوشیزہ لڑکیوں کی لاشوں کا سوگوار ہے ــــــ ایک باغ ہے جو عام تفریحگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک دن صبح کو میں نے اس باغ کا قصد کیا۔ اور اپنی شہری عادت کیخلاف اہلِ بادیہ کی طرح جن کا بستر صرف صحرا کی ریگ ہوا کرتا ہے۔ میں بھی زمین پر بیٹھ گئی۔ اور درخت کے سایہ میں ایک مجسمہ کے قدموں کے پاس سبز گھاس پر دراز ہو گئی۔

اس وقت یہاں سوائے دو انگریزی خاتونوں کے جن میں سے ایک کیساتھ تین بچے

بھی تھے۔ اور کوئی نظر نہ آتا تھا چند منٹ نہ گزرے تھے۔ کہ ان میں سے ایک بچہ جس کی عمر چار سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ مجھ سے قریب ہوکر گزرا۔ اور میں نے اُسے" اے ننھے ادھر آ" کہہ کر آواز دی۔

وہ مسکراتا ہوا میرے پاس آیا اور میں نے اُس سے پوچھا کیا تم میرے زانو پر نہ بیٹھو گے۔ وہ یہ سُنکر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جب اُس کے ننھے جسم کا بوجھ میں نے محسوس کیا تو مجھے اپنا مر جانے والا ننھا بھائی یاد آ گیا کلیجہ منہ تک آنے لگا۔ اور آنسو پلکوں تک پونچ گئے۔ میں جھکی اور اُس کے رخساروں کی شیرینی سے اپنے ذوق کو آسودہ کیا۔ بچوں کے رخسار بھی کس قدر شیریں ہوتے ہیں۔ اور اُن کے تبسم کا ذائقہ بھی کیسا لذیذ

میں نے پوچھا" تمہارا نام کیا ہے"؟

اس نے جواب دیا" رابرٹ"

میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا۔ تو اس میں انگریزی حُسن کے بہت سے نشانات پائے جاتے تھے شفاف چہرہ گویا کہ گلاب اور یاسمن کے افشردہ کو منجمد کر کے طیار کیا گیا تھا۔ منہ کلی کی طرح، پیشانی بڑی اور اونچی جسکو سنہرے بال چھپائے ہوئے تھے۔ آنکھیں گہری نیلگوں ـــ میں نے ان چیزوں کو غور سے دیکھا اور بولی" ارے رابرٹ یہ آنکھیں تو کہاں سے لایا اور یہ رنگ کس نے دیا"؟

وہ صرف یہ سمجھ سکا کہ" کس نے دیا" اور جواب دیا کہ" ماما نے"

میں نے کہا" تیری ماں کی آنکھیں تجھ سے ٹھنڈی رہیں تیرا باپ کیا کام کرتا ہے"؟

اُس نے اپنی توتلی زبان سے کہا کہ "میرا باپ سپاہی ہے اور میں بھی باپ کی طرح سپاہی ہوں"۔

میں نے کہا "اے رابرٹ تو بڑا پیارا بچہ ہے ذرا مجھے اپنا ہاتھ تو دکھا"۔

بچوں کے ہاتھ بھی اُن کے تبسم کی طرح عجیب و غریب شیرینی اپنے اندر رکھتے ہیں میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تاکہ نقوشِ مقدرات کا مطالعہ کروں۔ ایک مربع ہاتھ بڑا انگوٹھا رکھنے والا، جس میں زندگی، عقل اور قلب کی تمام لکیریں نہایت واضح و جلی نظر آ رہی تھیں اور اس چھوٹی سی ہتھیلی میں تل المریخ[1] (Mount) اُبھرا ہوا۔ اُس کے مستقبل کو خوفناک ظاہر کر رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور جی ہی جی میں کہنے لگی۔

"یہی ہاتھ جو اس وقت صرف گل و شبنم سے کھیلنا جانتا ہے عنقریب ایک سپاہی کا ہاتھ بن جائیگا جس میں تیغ و تفنگ نظر آئیں گے۔ اور جو انسانوں کی جانوں کو ہلاک کریگا خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے . . . ."

میں یہ سوچ رہی تھی۔ اور رابرٹ زمین پر پاؤں مار مار کر کہہ رہا تھا کہ میں بھی باپ

---

[1] علم فراست الید میں ہتھیلی کے وہ ابھرے ہوئے حصے جہاں انگلیاں ختم ہوتی ہیں ماؤنٹ (Mount) کہلاتے ہیں جنہیں عربی میں تل کہتے ہیں۔ ان کا نام علیحدہ علیحدہ ہے چنانچہ چھنگلیا اور کلائی کے درمیان کنارے کی طرف کا حصہ "تل المریخ" کہلاتا ہے۔ اور جس کے ہاتھ کا یہ حصہ زیادہ اُبھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ جنگجو خصائل رکھتا ہے (نیاز)

کی طرح سپاہی ہوں۔"

میں نے کہا "ہاں رابرٹ جب وقت تو بڑا ہوگا۔ تو سپاہی بن جائیگا اور اپنے عسکری لباس میں حسین نظر آئیگا لیکن نہ اتنا حسین جتنا اس وقت اس لباس طفلی میں نظر آتا ہے جب یہ تیرے ننھے ننھے ہاتھ بڑے ہو کر ایذا رو ہلاکت پھیلانے کے قابل ہو جائیں گے۔ تو عزم و ثبات کیساتھ تو آلات ہلاکت و بربادی ان سے سنبھالنے لگے گا یہ تیری خوبصورت آنکھیں جلاد کی اُن آنکھوں کی طرح ہو جائیں گی۔ جو خون اور آنسو کو دیکھتی ہیں۔ لیکن انہیں رحم نہیں آتا۔ اور تو دیکھے گا۔ کہ تیرا قلب کیا "آج" کو بھلا دیتا ہے۔

کیا واقعی تو انہیں اکثر لوگوں کی طرح ہو جائیگا۔ جن کیلئے حیات انسانی میں "عواطف" (   ) کا وجود نہیں ہوتا۔ جو کھیلتے ہیں ہنستے ہیں، لطف اٹھاتے ہیں۔ اور ان کے دلوں پر کسی واقعہ کا بالکل اس طرح کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے شیشہ پر بارش کا۔

کیا تو انہیں لوگوں میں سے ہوگا۔ جو صرف قوت و شدت کی عینک سے ہر چیز کو دیکھنا جانتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ کسی عورت کا ہاتھ تجھے پالے اور تیری آنکھوں میں محبت کے آنسو پیدا کر دے اور دل میں یاس کا خنجر پیوست۔

کل اے رابرٹ! جب تو بڑھ جائیگا تو معرکۂ حیات میں اپنے آپ کو تنہا پائیگا۔ ذمہ داری کا عذاب تجھے تکلیف دیگا۔ محنت تجھے تھکا رہی ہوگی۔ فکر کی آگ تجھے پھونک رہی ہوگی اور مصائب کے شعلے تجھے گھلائے دے رہے ہوں گے۔ کل تو اپنی روح

کی پیاس کا مزہ چکھے گا۔ کل تو انسان ہو جائیگا۔۔۔
کیسا ہولناک کلمہ ہے!۔۔۔ ہاں کل تو انسان ہو جائیگا یعنی حیوان و خدا دونوں!

میں دیر تک خاموش رہی۔

اور اسی سکوت کے عالم میں باغ کے اطراف سے ایک شیریں نغمہ بلند ہوا۔ اور چاروں طرف منتشر ہو گیا۔ یہ موذن کی آواز تھی۔ جو غروب آفتاب کے وقت بھی اسی بات کا اعادہ کرے گی۔ جیسے اس وقت کہہ رہی ہے۔

میں نے پوچھا "اے رابرٹ تو نے اس آواز کو سنا؟"

اس نے جواب دیا "ہاں"۔

میں نے کہا "وہ زمانہ بھی دور نہیں جب تجھے معلوم ہوگا کہ یسوع مسیح کیا چیز ہے۔ نصرانیت کس کا نام ہے اور اسلام کسے کہتے ہیں۔ ہاں وہ وقت جلد آنیوالا ہے۔ جب تو تعصب دینی اور تعصب جنسی کو اچھی طرح جان لیگا۔ عنقریب تجھے معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ دھاگے جن سے دلہنوں کے لباس تیار ہوتے ہیں ان سے شہیدوں کے کفن بھی بنائے جاتے ہیں۔ اور جلد ہی تو دیکھ لیگا۔ کہ ایک قوم دوسری قوم کو کس طرح ہلاک کرتی ہے کیونکہ ان میں سے ایک ایسے پرچم کے نیچے ہے جس کا رنگ دوسری قوم کے پرچم سے جدا ہے۔

تو یہ سب کچھ بہت جلد دیکھیگا۔ اے رابرٹ! اور ان سب میں شریک ہوگا کیونکہ تو بھی اپنے باپ کی طرح ایک سپاہی ہے!"

میں رابرٹ سے جُدا ہو گئی بغیر اس کے کہ اس کا رخصتی بوسہ لیتی کیونکہ اب میں اپنے آپ کو مستقبل کے ایک خوفناک اور درندہ صفت آدمی کے سامنے پاتی تھی۔

(نگار مئی ۱۹۲۵ء)

عمرِ برق خرام

اگر کوئی شخص خوش قسمت ہو تو ایسا جیسے ہمارے دوست پروفیسر جبّرن ہیں کہ ہاتھ ڈالیں مٹی پر تو بن جائے سونا۔ میں نے اکثر محققین کا حال سنا ہے جنہوں نے دنیا میں بڑے بڑے نمایاں کام کئے ہیں۔ مگر جو کارنامہ ہمارے دوست کا ہے اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہیں۔ انہوں نے ایک ایسی چیز دریافت کی ہے۔ جس سے حیات انسانی میں انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ چیز ان کو اتفاق سے اس وقت حاصل ہو گئی جب کہ ان کا ارادہ محض ایک مقوی اعصاب نسخہ تجویز کرنے کا تھا۔

——— میرا گھر ناکسٹون میں ہے۔ اور پروفیسر جبّرن صاحب میرے ہمسایہ ہیں تقریباً سال بھر کا عرصہ گزرا کہ مجھ سے پروفیسر صاحب کی ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے

کہ میں ابھی ان چھوٹی چھوٹی ایجادوں سے ہرگز مطمئن نہیں ہوا۔کیونکہ یا دویہ یا تو اعصاب پراثر کئے بغیر مرکزی طاقت کو بڑھا دیتی ہیں یا وہ نظام عصبی کے مادہ موصلیت (
الکم کمکے جسم کی بچی ہوئی طاقت کو بڑھا دیتی ہیں اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اگر معدہ اور قلب کے فعل کو تقویت دیتی ہے تو دماغ کو مختل چھوڑ دیتی ہے یا اگر شمپین شراب کی طرح دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ دیگر اعضائے رئیسہ کو چھوڑ دیتی ہے۔ مگر میں کچھ ایسی چیز چاہتا ہوں۔ جو تمام اعضاء پر اثر ڈالے اور ایسا معلوم ہو گویا آپ میں دو تین آدمیوں کی طاقت آگئی ہے۔

میں :۔ لیکن ایسی دوا تو انسانوں کو تھکا کر اور کمزور کر دے گی"۔

پروفیسر :۔ قطعی نہیں۔ بلکہ اس کے استعمال کے بعد آپ دو چند، سہ چند غذا کھائیں گے اب ذرا غور کیجیئے کہ یہ چیز کیسی ہوگی ؟ (ایک سبز شیشی اپنی جیب میں سے نکال کر) ایسی ہوگی۔ اور اس بیش بہا شیشی کے اندر وہ طاقت ہوگی۔ کہ اس کے استعمال کرنے سے آپ دوگنا سوچیں گے۔ دوگنی تیزی سے حرکت کریں گے۔ اور ایک مقررہ وقت میں اوروں سے دگنا کام کریں گے"۔

میں :۔ مگر ایسی چیز ممکن بھی ہے ؟

پروفیسر :۔ میرے خیال میں ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنا ایک سال اس فکر میں کیوں ضائع کرتا۔ مثلاً ہاپوناسفیٹ کے مختلف مرکبات سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور تیار کی جاسکتی ہے۔ دوگنی نہیں اگر ڈیوڑی قوت کی بھی

دوا تیار ہو گئی تو ہمارا مقصد پورا ہو جائیگا"

میں :۔ "مقصد پورا ہو جائے گا! کیونکر"

پروفیسر :۔ "فرض کیجیئے کہ آپ ایک سیاستدان اور مدبر ہیں۔ آپ کا وقت گذرا جا رہا ہے اور کام ابھی تک نہیں ہوا۔ اور وہ کام بہت ضروری ہے۔ تو ایسی حالت میں کیا ہونا چاہیئے۔

میں :۔ "پرائیویٹ سیکرٹری کو دوا کی ایک خوراک دیدینی چاہیئے"

پروفیسر :۔ "اور اس طرح دو چند کام لینا چاہیئے۔ اور غور کیجیئے مثلاً آپ کوئی کتاب ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ہے جس پر سکرات موت طاری ہیں۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اٹھ بیٹھے اور کسی مریض کے معاملہ میں غور کرے یا کوئی بیرسٹر ہے یا کوئی ایسا شخص ہے جو امتحان دینے کے لئے کتابوں کا کیڑا بنا ہوا ہے"۔

میں :۔ "ایسے لوگوں کیلئے آپ کی دوا یقیناً بڑی بیش قیمت چیز ہوگی"۔

پروفیسر :۔ "یا کوئی جنگ ہو رہی ہے جس میں کامیابی کا انحصار اس امر پہ ہے کہ جلد سے جلد پستول کی لبلبی دبائی جائے"۔

میں :۔ "یا پٹہ بازی یا چھری گدکا ہے"۔

پروفیسر :۔ "الغرض اگر میں کوئی ایسی دوا ایجاد کر لوں تو اس میں سوائے اس کے اور کوئی نقصان ہوگا کہ آپ ایک نہایت خفیف حد تک بڑھاپے کے قریب ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کی زندگی اور دن کے مقابلہ میں دو چند ہو جائے گی"۔

ہیں ؟" کیا واقعی آپ کے خیال میں ایسی دوا ایجاد ہو سکتی ہے ؟

پروفیسر صاحب نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر اس سبز شیشی سے اپنی میز کا کنارہ کھٹکھٹا کر بولے : "میں خیال کرتا ہوں کہ میں یہ دوا معلوم کر چکا ہوں"۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد بھی اس دوا کے متعلق ہم دونوں میں کئی بار گفتگو ہوئی۔ اور جب کبھی وہ اس کے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ ان کے لب و لہجہ میں بہت زیادہ یقین ظاہر ہوتا تھا۔ دنیائے حیات میں اس جدید دوا کے استعمال سے جو غیر متوقع نتائج پیدا ہونے والے تھے۔ ان کی نسبت گفتگو کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی گھبرا جاتے تھے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ وہ ملول و حزیں نظر آنے لگتے تھے۔ اور کبھی کبھی وہ اس بارہ میں بھی گفتگو کرنے لگتے تھے۔ کہ اس دوا کی ایجاد سے کس قدر منافع حاصل ہو سکیگا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ہم دونوں اس بات پر طویل بحث کرتے رہے کہ تجارتی طور پر اس عجیب دوا سے کیونکر فائدہ حاصل کیا جائے۔

وقت گزر گیا۔ مگر مجھے جو دلچسپی اس سنہ ایجاد دوا سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بدستور قائم رہی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی پروفیسر جبرن کوئی ایسی چیز تیار کر رہے ہیں۔ جس سے انسان کی زندگی پر بڑا اثر پڑے گا۔ فرض کیجیئے کہ ایک شخص نے اس دوا کو بار بار استعمال کیا تو اس میں شک نہیں کہ اسکی زندگی نہایت سرگرمی سے گزرے گی۔ لیکن گیارہ ہی برس کی عمر میں وہ جوان، اکیس برس کی عمر میں ادھیڑ، اور تیس برس کے لگ بھگ . . . . اس کا انحطاط شروع ہو جائے گا۔

اگست کے مہینے کی سات تاریخ ہوگی۔ یا آٹھ کہ پروفیسر صاحب نے مجھ سے بیان کیا۔ کہ وہ کچھ عرصہ سے دوا تیار کر رہے ہیں۔ اور اسی پر ان کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے ۱۰ اگست کو جوان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ فرمانے لگے۔ کہ اب جدید اکسیرِ حیات کا مادی وجود دنیا میں آگیا ہے جس روز پروفیسر صاحب سے میری یہ ملاقات ہوئی اس روز میں غالباً کسی کام سے فاکسٹون کی طرف جا رہا تھا۔ دیکھ کہ جھپٹے ہوئے آئے میرے خیال میں شاید وہ مجھ سے اپنی کامیابی کا حال بیان کرنے میرے گھر آ رہے تھے مجھے یاد ہے کہ آج ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن تھیں۔ ان کے چہرے پر سرخی دوڑ رہی تھی۔ اور ان کی رفتار میں تیزی اور لچک بھی تھی۔ پروفیسر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جلدی سے بولے۔

"ہو گیا جناب کام ہو گیا۔ بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ ہو گیا۔ آپ میرے یہاں تشریف لائیں اور دیکھیں"۔

میں :۔ واقعی ؟"

پروفیسر :۔ "جی ہاں واقعی۔ آپ میرے ہاں تشریف لائیں اور دیکھیں"۔

میں :۔ "اور وہ اسی طرح دہ چند کام کرتی ہے ؟"

پروفیسر :۔ اس سے بھی زیادہ بلکہ بہت زیادہ۔ میں اس دوا کو دیکھ کر گھبرا گیا آئیے اور خود اس دوا کو ملاحظہ فرمائیے بلکہ چکھ کر اس کا تجربہ کیجئے۔ دنیا میں اس سے زیادہ حیرت انگیز چیز کوئی نہ ہوگی"۔

پروفیسر صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے پہاڑی کی طرف لے چلے۔ موسم بہت

صاف اور روشن تھا۔ ہر چیز چمکدار اور منور نظر آ رہی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہوا کسی قدر تیز چل رہی تھی جس سے میرا جسم کسی قدر ٹھنڈا اور پسینہ خشک ہو رہا تھا۔ میں نے شور مچایا کہ "پروفیسر صاحب، خدا کیلئے مجھ پر رحم کرو۔ رحم!" اس پر پروفیسر صاحب نے اپنی رفتار کسی قدر دھیمی کر دی۔

پروفیسر:- "میں تیز کہاں چل رہا ہوں"۔

میں:- "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وہ دوا کسی قدر پی لی ہے"۔

پروفیسر:- "نہیں بالکل نہیں۔ مگر ہاں یہ ضرور ہوا کہ جس گلاس میں سے دوا کے چند قطرے باقی تھے اس کو دھونے کے بعد پانی کا ایک قطرہ میں نے ضرور چکھ لیا تھا۔ ہاں بیشک کل رات میں نے وہ دوا ضرور چکھی تھی۔ مگر اب تو وہ پرانی بات ہو گئی"۔

میں:- "اور اس کا اثر دہی دوگنا ہے"؟

پروفیسر:- "اجی دوگنا کیا۔ ہزار گنا کہیے۔ ہزار گنا"۔

اب ہم پروفیسر صاحب کے مکان پر پہنچ گئے، اور انہوں نے پرانی وضع کا لکڑی کا پھاٹک کھولا میں بھی ساتھ میں اندر داخل ہوا۔ اور انہوں نے فرمایا "میں نہیں کہہ سکتا اس میں کتنا زبردست اثر ہے، اس کے پیتے ہی نظام عصبی کے علم پر عجیب قسم کی روشنی پڑنے لگتی ہے، نظریہ رویا کو وہ ایک جدید صورت میں پیش کرتی ہے . . . خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے ہزار گنا . . . . خیر یہ باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔ فی الحال اس دوا کا امتحان کرنا ہے،

میں۔ دوا کا امتحان کرنا؛

اب ہم پروفیسر صاحب کی نشست گاہ میں پونچ گئے، اور پروفیسر صاحب نے فرمایا۔

پروفیسر۔ جی ہاں، وہ دیکھئے اس سبز شیشی میں وہ دوا موجود ہے، بشرطیکہ آپ ڈریں نہیں۔

میں فطرتاً بہت محتاط آدمی ہوں، کسی معاملہ میں بغیر سوچے سمجھے ہاتھ نہیں ڈالتا، میں خود ڈرتا تھا، مگر دوسری طرف کسی قدر اپنی شان کا بھی خیال، بالآخر میں نے کہا۔

آپ تو فرماتے ہیں کہ میں اس کا امتحان کر چکا ہوں۔

ہاں میں نے اسے ضرور چکھا ہے، اور مجھے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ مجھے کوئی نقصان پہنچا ہے؟

میں۔ (کرسی پر بیٹھ کر) اچھا تو لایئے مجھے بھی وہ دوا دیجئے۔

میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور پروفیسر صاحب اپنی میز کے آگے کھڑے ہوئے تھے، میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرہ سے اس وقت فخر و ناز ٹپک رہا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک بہت بڑا ماہر طب سمجھتے تھے۔

پروفیسر:۔ دیکھئے یہ غبالی رنگ کی دوا ہے، مگر میں آپ کو ایک بات سمجھائے دیتا ہوں اور وہ یہ کہ جونہی دوا آپ کے حلق سے نیچے اترے آپ فوراً اپنی آنکھیں بند کرلیں، اور پھر احتیاط کے ساتھ ایک دو منٹ میں آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں کیونکہ پتلی کو ایک قسم کی تکلیف ہوتی ہے، اور آنکھیں کھولنے کے وقت چکر سا آنے

گنتا ہے، اس لئے آپ آنکھیں بند رکھیں "۔

میں :۔ آنکھیں بند رکھوں، خوب!

پروفیسر :۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ بالکل ساکت رہیں کسی قسم کی حرکت نہ کریں کیونکہ آپ یہ دوا پینے کے بعد کئی ہزار گنا تیز ہو جائیں گے، آپ کا دل، دماغ، پھیپھڑے، عضلات وغیرہ ہر چیز ہزاروں گنا تیز کام کرے گی۔ اور آپ کو صرف اس قدر محسوس ہوگا، کہ دنیا بمقابلہ پیشتر کے ہزاروں گنا سست رفتار سے چل رہی ہے، بس یہی اس دوا میں عجیب و غریب تاثیر ہے۔

میں :۔ اللہ اللہ آپ کا یہ مطلب ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

پروفیسر :۔ مطلب وطلب کچھ نہیں، بس آپ خود دیکھ لیں۔

یہ کہہ کر پروفیسر نے ایک چھوٹا پیمانہ اٹھایا، میز پر جو چیزیں رکھی تھیں۔ ان کی طرف دیکھا اور بولے، گلاس بھی ہے، اور پانی بھی ہے، سب چیزیں یہیں موجود ہیں۔ لیکن پہلی مرتبہ زیادہ مقدار میں نہ پینا چاہیئے۔

چھوٹی سی شیشی نے "قلقل" سے فضاء کمرہ میں ترنم پیدا کیا، اور پیمانہ میں ایک سرخ سرخ سی چیز نظر آنے لگی۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے وہ پیمانہ ایک گلاس میں خالی کر دیا، اور فرمایا۔

جو کچھ میں نے سمجھا دیا وہ ہرگز نہ بھولنا، اپنی آنکھیں خوب کس کر بند کر لو، اور دو منٹ تک بالکل بے حس و حرکت اور ساکت بیٹھو، پھر آپ مجھے بولتے سنیں گے"۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے دونوں گلاسوں میں ایک ایک انچ کے قریب پانی ڈالا۔ اور فرمایا۔

ہاں اتنی بات اور بھی سن لیجئے یعنی اپنا گلاس نیچے نہ رکھیں، ہاتھ میں لئے رہیں اور اپنا ہاتھ زانو پہ رکھ لیں، ہاں، ہاں اس طرح، اور اب :۔۔۔۔"

پروفیسر صاحب نے اپنا گلاس اٹھایا اور ادھر میں نے اپنا گلاس ہاتھ میں لے کر کہا:۔

"جدید اکسیر حیات"

اس کے بعد ہم دونوں نے اپنے گلاس ایک دوسرے کے گلاس سے ٹکرائے اور پی گئے، اور میں نے اپنی آنکھیں فوراً بند کر لیں، پروفیسر صاحب نے بھی میرے الفاظ دہرائے۔ جس طرح کوئی شخص گیس سونگھنے کے بعد دنیا و مافیہا سے قطعی بے خبر ہو جاتا ہے اسی طرح ہماری حالت بھی نہ معلوم کتنی دیر تک یونہی رہی، اس کے بعد میں نے پروفیسر جیبری کی آواز سنی جو مجھ سے بیدار ہونے کو کہہ رہے تھے، میں نے بھی ہاتھ پاؤں ہلائے اور آنکھیں کھول دیں، کیا دیکھتا ہوں کہ پروفیسر صاحب ہاتھ میں گلاس لئے ہوئے وہیں کھڑے ہیں، جہاں وہ پیشتر کھڑے ہوئے تھے، فرق صرف اس قدر تھا۔ کہ اس وقت ان کا گلاس خالی تھا۔

میں :۔ کہئے جناب کیا حال ہے؟

پروفیسر :۔ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

میں :۔ کوئی بات نہیں؟ کچھ تو ہوگا، کم از کم یہ تو محسوس ہوتا ہوگا۔ کہ سانسیں ٹھنڈی آ رہی ہیں

پروفیسر:- کچھ آوازیں سنتے ہو؟

میں۔ بالکل سکوت طاری ہے، خدا کی قسم ہر چیز ساکت ہے، ہاں کچھ پٹ پٹ کی آواز آرہی ہے۔ گویا بارش کے قطرے مختلف چیزوں پر پڑ رہے ہیں، یہ کیا بات ہے؟

میرا خیال ہے کہ میرے جواب میں پروفیسر صاحب نے کہا کہ "تجربہ شدہ آوازیں ہیں" مگر مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں کہ یہی کہا تھا یا کچھ اور اس کے بعد پروفیسر صاحب نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اور بولے۔

آپ نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے، اگر کسی کھڑکی میں پردہ اس طرح آویزاں ہو جس طرح سامنے لٹکا ہوا ہے؟

جس طرف وہ دیکھ رہے تھے میں نے بھی دیکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ پردہ کا ایک سرا بہت تیزی کے ساتھ ہوا میں اڑ رہا ہے، اور پھٹ پھٹا رہا ہے۔

میں:- نہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا، یہ بالکل عجیب بات ہے۔"

پروفیسر:- اور یہ بھی دیکھئے۔

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے اپنا وہ ہاتھ کھولا۔ جس میں گلاس تھا میں سمجھا تھا کہ گلاس میز پر گر کر ٹوٹ جائیگا، مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، کہ گر کر ٹوٹنا تو در کنار وہ گلاس حرکت کرتا بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ ہوا میں بالکل ساکن و معلق تھا۔

پروفیسر:- ان عرض البلاد میں ہر چیز پہلے سیکنڈ میں سولہ فٹ زمین کی طرف گرتی ہے چنانچہ یہ گلاس بھی ۱۶ فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے گر رہا ہے، لیکن آپ دیکھتے ہیں

کہ ابھی ایک وہ سیکنڈ کا ۱/۱۰۰ حصّہ بھی نہیں گرا اس سے آپ کو میرے جدید اکسیر حیات کی رفتار کا کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا۔"

گلاس جو آہستہ آہستہ گر رہا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اس کے اوپر، نیچے اور چاروں طرف اپنا ہاتھ گھمایا، اور بالآخر انہوں نے گلاس کا پیندا پکڑ لیا، اور نیچے گھسیٹ لیا، اور احتیاط کے ساتھ میز پر رکھ دیا پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا" دیکھا" اور ہنسنے لگے

میں بہت ٹھیک! ....

اس کے بعد میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی کرسی پر سے اٹھنا شروع کیا۔ میں اپنی حالت پوری طرح محسوس کر رہا تھا طبیعت نہایت ہلکی اور مطمئن تھی۔ میرے تمام اعضا میں تیزی محسوس ہوتی تھی، مثلاً میرا دل فی سیکنڈ ایک ہزار کے حساب سے دھڑک رہا تھا۔ مگر اس بات سے مجھے کوئی تکلیف یا گھبراہٹ محسوس نہ ہوتی تھی۔ میں نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بائیسکل پر سوار ہے، مگر کوئی حرکت نہیں کرتا، نیچے ہے اور پاؤں اوپر اور بائیسکل کے پہیوں کے پیچھے گرد و غبار کا ایک بادل ہے۔ وہ ایک تیز رفتار موٹر لاری کو پکڑنا چاہتا ہے، جو بظاہر ساکن نظر آ رہی ہے۔ میں یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر بے حد متعجب ہوا اور پکار کر کہا۔

میں: "حیرت! اس ملعون دوا کا اثر کب تک باقی رہے گا......"

پروفیسر: "خدا معلوم کب تک رہے گا، پچھلی مرتبہ جب میں نے یہ دوا استعمال کی تھی تو فوراً میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ اور سوتے سوتے اس کا اثر زائل ہو گیا تھا۔ میں صاف

کہتا ہوں کہ میرے دل میں کہیں خوف ضرور پیدا ہوا تھا اگرچہ میری یہ حالت چند منٹ ہی ہوگی، مگر وہ مجھے گھنٹوں معلوم ہوتی تھی، لیکن کچھ دیر بعد یہ حالت رفع ہونے لگی، اور پھر دفعتاً ختم ہوگئی۔

مجھے اس بات پر تو ناز ہے کہ مجھ پر کسی قسم کا خوف طاری نہیں ہوا، ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہوا کہ ہم اس وقت دو آدمی تھے۔

میں:۔ ہم اسوقت باہر کیوں نہ چلیں؟

پروفیسر:۔ بیشک چلنا چاہیئے۔

میں:۔ اگر باہر چلیں گے تو اور لوگ بھی ہماری حالت دیکھیں گے.....!

پروفیسر:۔ لوگ نہیں دیکھ سکیں گے، ہر گز نہیں دیکھ سکیں گے۔ جتنی دیر میں ایک شعبدہ گر مداری اپنا ہتھکنڈا کر جاتا ہے، ہم اس سے بھی ہزاروں درجہ زیادہ چلتے ہوں گے، اچھا اب اٹھیئے، کون سے راستہ سے چلیں، دروازے سے یا کھڑکی سے؟

بہرحال ہم دونوں کھڑکی کی راہ سے برآمد ہوئے۔ اس سے قبل سینکڑوں عجیب واقعات مجھے پیش آچکے ہیں، لیکن یہ ہے کہ آج جو مختصر سی سیر میں نے پروفیسر جیبرن کے ساتھ کی وہ سب سے زیادہ عجیب و غریب تھی، ہم دونوں پھاٹک سے نکل کر سڑک پر پہونچے، اور وہاں کے آنے جانیوالوں پر غائر نظر ڈالی، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھوڑا گاڑی سامنے موجود ہے، پہیوں کے اوپر کا حصہ اور اس کے گھوڑوں کی کسی قدر ٹانگیں، گاڑی بان کے چابک کا سرا، اور اس کے نیچے کا جبڑا اور وہ اسوقت جمائی

لے رہا تھا) تو بظاہر کچھ حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے، ورنہ اس گاڑی کا تقریباً تمام حصہ ساکن نظر آتا تھا، اور لطف یہ ہے کہ کسی قسم کا شور وغل سنائی نہیں دیتا تھا، بجز اس کے کہ ایک شخص نے زور سے کھنکارا جس سے کسی قدر خفیف سی آواز پیدا ہوئی، اسوقت اس جامد ساکن گاڑی میں ایک گاڑی بان، ایک ڈرائیور، اور گیارہ مسافر تھے جسوقت ہم اس گاڑی کے گرد گھومے تو اوّل اوّل تو وہ منظر بہت عجیب نظر آیا، مگر بعد میں ناگوار معلوم ہونے لگا۔ گاڑی میں جو آدمی تھے۔ وہ بھی اگرچہ ہماری جیسے تھے، مگر پھر بھی ایسے نہ تھے، وہ اطمینان کیساتھ جہاں بیٹھے ہوئے تھے بُت معلوم ہوتے تھے اور جو شخص کچھ حرکت کرنے لگا تھا وہ کرتا ہی رہ گیا تھا۔ مثلاً ایک لڑکی اور ایک مرد ایک دُوسرے کی طرف مسکرائے مگر اسطرح گویا ہمیشہ مسکراتے ہی رہیں گے۔ ایک عورت نے گاڑی کے جنگلہ پر ہاتھ رکھا، اور پروفیسر جیبرن کے مکان کی طرف دیکھنے لگی اور دیکھتی ہی رہ گئی ایک شخص اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر چوہے کی دُم کی طرح بناتا ہی رہ گیا، اسی طرح ایک شخص نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنی ٹوپی ٹھیک کرنا چاہی اور وہ گویا ابدالآباد تک یونہی رہ گیا۔ ہم دونوں لوگوں کی طرف دیکھتے تھے۔ اور ہنستے تھے، اس کے بعد ہم کو وہ لوگ کسی قدر ناگوار معلوم ہونے لگے، اس کے بعد ہم وہاں سے ہٹے اور بائیسکل سوار کے سامنے سے ہوکر پارک میں آگئے، یہاں دفعتاً پروفیسر جیبرن چلا اُٹھے۔

پروفیسر:۔ اللہ اللہ یہ دیکھو۔

انہوں نے ایک طرف ہاتھ اُٹھا کر انگلی سے اشارہ کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شہد

کی مکھی آہستہ آہستہ پَر پھڑپھڑاتی ہوا میں جا رہی ہے لیکن اس کی رفتار پرواز ایک گھونگھے کی چال سے بھی کم تھی۔

جب ہم پارک میں پہنچے تو وہاں کا منظر اور بھی عجیب غریب نظر آیا، اس وقت بالائی نشست پر بینڈ باجہ بج رہا تھا۔ مگر اس کی آواز ہمارے نزدیک نہایت دھیمی تھی۔ اور بعض اوقات یہ آواز ایسی معلوم ہونے لگتی تھی، جیسے کسی بہت ہی بڑے گھنٹہ کی ٹک ٹک، لوگ سیدھے کھڑے ہوئے باجہ کے نغمہ کو خاموش سُن رہے تھے، اور بعض آدمی جو سبزہ زار پر ٹہل رہے تھے مطمئن اور بُت کی طرح ساکن دکھائی دیتے تھے، جس کا جو پاؤں جہاں اُٹھ گیا بس وہیں رہ گیا تھا، میں ایک چھوٹے سے کُتّے کے پاس سے ہو کر گذرا جو کودنے کے عمل میں معلق رہ گیا تھا۔ اور جب وہ زمین پر اُترا۔ تو میں نے اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کو آہستہ آہستہ حرکت کرتے دیکھا، اسی اثنا میں پروفیسر جیبرن نے کہا۔ ذرا یہ تو دیکھو ہم لمحہ بھر کے لیئے ایک شاندار اور وجیہہ آدمی کے سامنے ٹھیرے، جس نے مُنہ موڑ کر دو لیڈیوں کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھا جو نہایت نفیس ریشمی لباس پہنے ہوئے تھیں، اس آدمی نے ان خاتونوں کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا۔ لیکن ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک آنکھ ہمیشہ کیلئے نصف بند ہو کر رہ گئی ہے۔

میں۔ پروفیسر صاحب اس وقت سخت گرمی محسوس ہو رہی ہے، ذرا آہستہ آہستہ چلیئے۔

پروفیسر:- اجی آؤ بھی۔
کرسیاں جو راستہ میں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم ان میں ہو کر گزرے بہت سے آدمی اپنے قدرتی طریقہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک شخص جسکا چہرہ سُرخی سے تمتما رہا تھا۔ اپنا اخبار تہ کرنے میں مشغول تھا۔ اور وہ اخبار ہوا سے اُڑا جاتا تھا۔ مگر ہم کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اپنے عمل میں بُت کی طرح ساکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا...... کہ ان تفریح کے شوقین لوگوں کو بہت تیز ہوا لگ رہی ہے۔ لیکن جہاں تک ہم دونوں کے احساس کا تعلق تھا، وہاں تک کہیں ہوا کا پتہ بھی نہیں تھا۔ ہم وہاں سے بھی چل دئے اور کسی قدر دور ہٹ گئے، اور پھر مڑ کر مجمع کو دیکھنے لگے، دیکھا کہ مجمع اسی طرح جامد ساکن بنا ہوا ہے، جیسے مومی مورتیں، یا سطح قرطاس کی تصویریں، زندہ آدمیوں کا بتوں کی طرح بے حس و حرکت نظر آنا ایک حیرت انگیز بات تھی جب سے وہ دوائیں نے استعمال کی تھی اس وقت سے اب تک جو کچھ میں نے کہا۔ یا جو کچھ میں نے سوچا وہ جہاں تک ان لوگوں بلکہ عموماً تمام دنیا کا تعلق تھا سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا یہ جدید اکسیر حیات"......

میں نے کہنا شروع کیا، لیکن پروفیسر نے میرا قطع کلام کیا۔

پروفیسر:- ایک نہایت بیہودہ اور چڑچڑی سی بُڑھیا ہے....

میں:- کون بڑھیا؟-

پروفیسر:- اجی ایک کم بخت ہے۔ جو میرے مکان کے برابر میں رہتی ہے، اس کے لاپلینڈ کا ایک کتا جو بُری طرح بھونکتا ہے.. واللہ اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ.."

بعض اوقات پروفیسر جیبرن کی حالت کچھ عجیب طرح کی ہو جاتی ہے یعنی وہ بالکل بچوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں، میں ان کو روکتا ہی رہا مگر وہ ہاتھ پھیلا کر جھپٹے اور جھپٹ کر کتے کو پکڑ لیا۔ اور آندھی کی طرح پہاڑی کی طرف دوڑے یہ ایک بالکل عجیب او غیر معمولی حرکت تھی۔ کتا بیچارہ نہ بھونکا، نہ تڑپا، نہ چلایا، بلکہ اس نے ذرا سا بھی حرکت نہ کی۔ جو ایک زندہ جانور کرسکتا ہے، بلکہ وہ پروفیسر کے ہاتھ میں اس طرح رہا جیسے کوئی آرام سے لیتا ہو، حالانکہ پروفیسر صاحب نے اس کی گردن پکڑ رکھی تھی، اور وہ بالکل ایسا بے حس و حرکت اور ایسا بے جان معلوم ہوتا تھا۔ گویا لکڑی کا بنا ہوا ہے میں نے چلا کر کہا۔

میں:- جیبرن! چھوڑ دو اس کتے کو، ایک تو ویسے ہی سخت گرمی ہو رہی ہے دوسرے تم نے دوڑتے دوڑتے مار ڈالا۔ خدا کی پناہ اس قدر تیزی کہ دو تین میل فی سیکنڈ کی رفتار سے دوڑ رہے ہو، ہوا کی رگڑ مارے ڈالتی ہے۔

پروفیسر:- (کتے کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا؟

میں:- ہوا کے تھپیڑے! ہوا کی رگڑ آپ بیحد تیز دوڑ رہے ہیں، گویا فضاء بسیط میں شہاب ثاقب ٹوٹ رہا ہے، اور ہو سخت گرمی محسوس ہو رہی ہے، اگر آپ اسی طرح دوڑتے رہیں گے۔ تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگ جائے گی، دیکھئے آپ کی پتلون کا کپڑا بھورا ہوتا جا رہا ہے، میں اس وقت سر سے پاؤں تک پسینہ پسینہ ہو رہا ہوں، تمام جسم میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں، وہ دیکھو مجمع میں کسی قدر حرکت شروع ہو گئی ہے، میرے جہاں میں اب ہماری دوا کا اثر زائل ہونے لگا ہے، پروفیسر اس کتے کو

کو نیچے ڈال دو۔

پروفیسر:۔ کیا؟

میں:۔ دوا کا اثر غالباً زائل ہو رہا ہے۔ امتیاز سخت گرمی معلوم ہو رہی ہے، مجھے میں پسینہ میں بھیگ گیا ہوں

پروفیسر صاحب میری صورت کو تکنے لگے، پھر انہوں نے بلینڈ باجہ کی طرف دیکھا۔ جو یقیناً اب زیادہ تیزی سے بج رہا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے نہایت تیزی سے ہاتھ ہلا کر کتے کو نیچے پھینک دیا۔ جو ایک بے جان کی طرح ہوا میں اڑتا چلا گیا، اور چند آدمیوں کی جماعت جو چھتریاں لگائے ہوئے کھڑے تھے، ان کے سروں پر معلق ہو گیا۔ پروفیسر صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا اور بولے۔

پروفیسر۔ واقعی شدت کی گرمی ہے اور جسم میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں، دیکھو وہ آدمی اپنا رومال بار بار حرکت میں لاتا دکھائی دیتا ہے، چلو یہاں سے جلدی نکل چلو۔

مگر بدقسمتی کہیے یا خوش قسمتی، ہم جلدی نہ جا سکے، کیونکہ اگر ہم دوڑتے تو ہمارے دل میں ضرور شعلے بھڑکنے لگتے، اور ہم پکیہ کاغذی کی طرح جلنے لگتے، دوا پیتے وقت ہم کو اس بات کا خیال تک نہ آیا تھا۔ . . . . بہر حال قبل اس کے کہ ہم دوڑنا شروع کریں اس دوا کا اثر زائل ہو گیا۔ بس یہ سب کچھ ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا اس "جدید اکسیر حیات" کا اثر اس طرح ختم ہو گیا۔ جیسے کوئی پردہ یک لخت اٹھ جاتا ہے اتنے میں پروفیسر صاحب کی آواز سنی جو خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے کہہ رہے تھے، بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ!! آواز سنتے ہی میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا، مگر گرمی کے مارے جھلس گیا تھا

اور جس جگہ میں بیٹھا ہوا تھا وہاں کی گھاس اس طرح جلی کہ آج تک اپنی جگہ گھاس سے خالی ہے، اب وہ جمود و سکون جو دنیا بھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا ختم ہو گیا تمام دنیا و مافیہا بیدار ہو گئی، بینڈ جو اب تک ہم کو بے سرا اور بیہودہ معلوم ہو رہا تھا، اب اس کی سریلی آوازیں کانوں میں آنے لگیں، جو لوگ ساکن نظر آ رہے تھے، اب وہ چلتے ہوئے دکھائی دینے لگے، کاغذ اور جھنڈیاں پھڑپھڑانے لگیں، لبہائے تبسم آمیز سے باتیں نکلنے لگیں، آنکھ سے اشارہ کرنے والے کا اشارہ ختم ہو گیا، اور وہ خاموش نکلا ہوا چلا گیا، اور جس قدر آدمی کرسیوں اور بنچوں پر ساکت و ساکن بیٹھے ہوئے تھے وہ حرکت اور باتیں کرنے لگے۔

اب گویا تمام دنیا زندہ ہو گئی تھی، اور جو رفتار اسکی تھی وہی اب ہماری تھی، یا یوں کہیے کہ اب ہم دنیا سے زیادہ تیز رفتار نہیں تھے، یہ حالت بالکل ایسی تھی جیسے اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے ایک ٹرین سست ہوتے ہوتے ایک دفعۃً رک جاتی ہے، میری طبیعت میں اس وقت سخت امتلا پیدا ہوا، کیونکہ میرے نزدیک دنیا بھر چکر کھا رہی تھی، اور اب وہ کتّا جو بے جان کیطرح ہوا میں معلق نظر آ رہا تھا، ایک لیڈی کی ریشمی چھتری پر گرا جس کے صدمہ سے چھتری میں سوراخ ہو گیا، اور وہ کتا لیڈی صاحب کے منہ پر اس طرح پڑا جیسے بندوق کی گولی کسی سے پار ہو کر لگتی ہے، اس غیر متوقع واقعہ سے اس قدر شور و غل مچا، اور اس قدر بھل بھل ہوئی کہ عیاذاً باللہ، کتنے نے شور مچاتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیا، اور سچ پوچھیے تو کتا بیچارہ اس قدر تیزی

سے پھینکا گیا تھا کہ ہوا کی رگڑ سے اس کے بال تک جھلس گئے تھے، اس وقت تہلکہ مچ گیا۔ لوگ اُدھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے، بیسیوں کے پاؤں کچل گئے، بیسیوں کرسیاں اُلٹ گئیں، پولیس بھی وہاں تعینات تھا، وہ دوڑا ہوا موقعہ پر پہنچا، یہ تو معلوم نہیں کہ معاملہ کیونکر رفع دفع ہوا کیونکہ ہم دور ہی کھڑے رہے، جب ہم نے دیکھا کہ ہماری حالت بہت کچھ درست ہو گئی ہے تو ہم بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے الگ ہی الگ رہتے ہوئے ہم نے اور پروفیسر صاحب نے گھر کا راستہ لیا، لیکن مجمع میں جو کچھ شور و غل ہو رہا تھا، اس میں ہم نے ایک شخص کی آواز سُنی جو ٹوٹی ہوئی چھتری والی لیڈی صاحبہ کے پاس کھڑا تھا، وہ پارک کے ایک خادم کو بُری بُری گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا، اور کہتا تھا کہ "اگر یہ کتا تم نے نہیں پھینکا تو اور کس نے پھینکا۔ اور وہ بیچارہ دم بخود کھڑا ہوا ان صاحب کی صورت کو تک رہا تھا۔

یہ چیخ پکار کی وجہ سے بلکہ درحقیقت اس خوف کی وجہ سے کہ کہیں ہم لوگ کسی آفت میں نہ پھنس جائیں، سیدھے گھر کی طرف چلے، اب اس بائیسکل سوار کا پتہ تھا نہ اس گاڑی کا کہیں نشان تھا، جب ہم مکان پہنچے تو ہم نے یہ بھی حیرت انگیز بات دیکھی کہ جس کھڑکی میں سے ہم ہو کر نکلے تھے وہ بھی کسی قدر جھلس گئی تھی، اور راستہ میں بچھے ہوئے سنگریزوں پر ہمارے پاؤں کے نشانات غیر معمولی طور پر گہرے تھے . . .

(نگار نومبر ۱۹۲۱ء)

یورپ کا فطری انسان

حوا کی بیٹیوں کی خلد فروش عریانیاں

"نوجوان لڑکیوں کے گورے گورے سڈول بدن کو بالکل عریاں دیکھنا
ایک ایسی لذت ہے جس میں دماغ و نگاہ دونوں برابر کے شریک ہیں"

اقتصادی دشواریاں کتنی ہی بڑھ جائیں جنسی آزادیاں خواہ کسی حد تک وسیع ہو جائیں لیکن یہ بات ذہن انسانی میں کبھی نہیں آسکتی تھی۔ کہ یورپ کا انسان جو تصنعات کا پُتلا اور یورپ کی عورت جو اسباب آرائش و زیبائش کی پرستار ہے کسی وقت تکلفات کی زندگی سے اس درجہ بیزار ہو جائے گی۔ کہ جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی اُسے گوارہ نہ ہوگا یقیناً یہ نتیجہ فرطِ نزاکت کا نہیں ہے۔ بلکہ کرشمہ ہے اس نظام قدرت کا جو ایک بار ماضی کو بھی گردش میں لا کر حال بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔

انسان کے عُریاں پھرنے کا زمانہ وہ ہے جسے ہم "عہدِ قبل تاریخ" سے تعبیر کرتے ہیں جب وہ کچا گوشت کھاتا تھا جنگلوں میں آزاد پھرتا تھا چوپایوں کی طرح وہ ننگا پھرتا تھا لیکن آج دنیا کے روشن ترین عہد کو بھی آخر کار پھر اسی عہدِ تاریک کا سہارا لینا پڑا۔ اور انسان کی فطری خواہشوں نے اُسے نہ صرف ملبوس سے بے نیاز کر دیا۔ بلکہ مختلف اطراف سے یہ آوازیں بھی آنے لگیں کہ انسان کو غلہ و گوشت خام حالت ہی میں کھانا چاہیئے۔ اور قیامِ صحت کیلئے جانوروں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں ٹیک کر روزانہ کچھ دیر چلنا ازبس ضروری ہے۔

اس سے قبل بعض مقامات میں مغرب کے فلسفہ عُریانیات کو پیش کر چکے ہیں۔ اس لئے آج کی صحبت میں یہ بتانا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یورپ میں یہ ذوق اس درجہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ گذشتہ دو سال کے اندر لاکھوں آدمیوں نے اپنے کپڑے اُتار پھینکے اور اسی حمام میں داخل ہو گئے "جہاں سے آدم و حوا ابتدائے آفرینش کے زمانہ میں جدا ہوئے تھے۔

خیال کیجیئے کہ اگر کسی جگہ لاکھوں سیمیں تن نازک کمر اور بقول غالب "قیامت قامتاں مژگاں درازاں" کا ہجوم ہو اس حال میں کہ نہ ان کا چہرہ رہین غازہ ہو نہ گیسو منت کشِ شانہ، نہ کوئی ہیکل زیب گلو ہے نہ کوئی چوڑی رنجۂ ساعدِ سیمیں جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں۔ سرکش شباب کے سامنے کوئی حجاب نہیں —— واقعی خیال کیجئے کہ اگر ایسا ہو تو کوئی کیا کرے۔ دل و دماغ کی کیا کیفیت ہو، نگاہ کی گستاخیوں کا کیا عالم ہو —— یہ

ا؎ میں یہی گفتگو کر رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے جو بے موقعہ اشعار پڑھ دینے میں یدطولیٰ

بقیہ اگلے صفحہ پر

ہم اس وقت یہاں سرزمین مشرق پر سوچ رہے ہیں۔ جہاں عورتوں کو عام طور سے "مستورات" ہی کہتے ہیں۔ اور حجاب و نقاب سے عورت کو "جلوۂ کوہِ طور" بنا رکھا ہے لیکن مغرب کی دنیا میں جہاں کی ہر خلوت، راز ایک "انجمن بر ملا" کا حکم رکھتی ہے یہ خیال کوئی معنی رکھتا ہی نہیں اور یہی سبب ہے کہ وہاں مرد عورت کا لباس اُتار کر پھینک دینا گویا ایک لحاظ سے صرف پردۂ مجاز کو ہٹا دینا ہے۔

غالباً آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی۔ کہ جرمنی میں اس وقت ۳ لاکھ مہذب و شائستہ پڑھے لکھے انسان بالکل ننگے رہتے ہیں۔ اور اگر ان کے تمام اعوان و انصار کو جو تمام فرب و جوار کے ممالک یورپ میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں شامل کر لیا جائے۔ تو یہ تعداد ایک کروڑ سے کم نہیں ہوتی۔ الغرض یہ تحریک یورپ میں رفتہ رفتہ نہایت قوی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر کہیں ایک جنگ اور ہو جائے تو پھر دفعتہً تمام یورپ کا ننگا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ جرمنی میں سب سے پہلے اس تحریک کا سبب یہی ہوا کہ گزشتہ جنگ میں سب سے زیادہ وہی متاثر ہوا تھا۔ اور اقتصادی دشواریوں نے منجملہ دیگر تغیرات معیشت و معاشرت کے اس تغیر کو بھی پیش نظر کر دیا پھر چونکہ اس میں خیال حفظان صحت کا بھی شامل تھا۔ اور مختلف ماہرین فن نے کھلی ہوئی فضا کی کھلی ہوئی شعاعوں سے مختلف امراض

رکھتے ہیں۔ یہ سُن کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا کہ "یہ نہ پوچھو کہ کیا ہو۔ آہ ۔"

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

بقیہ اگلے صفحہ پر

کا علاج بھی شروع کر دیا تھا۔ اس لیئے ایک اور قوی محرک شامل ہو گیا یہاں تک کہ جرمنی میں اب ایک مستقل کالونی انہیں ننگوں کی قائم ہو گئی۔ اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو عہدِ وحشت کی یاد نہ دلاتا ہو۔

ہمبرگ میں ایک باغ انہیں کیلئے مخصوص ہے۔ جہاں مدارس کے طلبہ بالکل ننگے کھیل کود میں مصروف نظر آتے ہیں۔ برلن میں ایک ورزش گاہ ایسی ہے جہاں لوگوں کو ریاضت جسمانی کے تماشے مفت دکھائے جاتے ہیں۔ یہیں دو حوض ایسے ہیں جو انہیں ننگوں کیلئے مخصوص ہیں۔ اسی طرح بحرِ شمالی جزیرہ سلیٹ میں عام اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے ننگا پھرے۔

یادش بخیر بے محل اشعار پڑھنے میں نواب محمد اسحاق خان مرحوم بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ایک واقعہ سنیئے۔ علی گڑھ میں آپ سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ہر ہر شعبہ پر آپ کی نگاہ ہے۔ اتفاق سے اس زمانہ میں مطبخ کا انتظام غیر معمولی طور پر خراب ہو گیا اور لڑکوں نے جا کر شکایت کی کہ کسی دن ڈائننگ ہال میں تو آ کر ملاحظہ فرمائیے کہ چپاتیاں کس قدر حسین پک کر آتی ہیں۔ نواب صاحب یہ سن کر دوسرے دن عین کھانے کے وقت پہنچ گئے دیکھا تو واقعی چپاتیاں نہایت خراب تھیں۔ آپ نے فوراً داروغہ مطبخ کو طلب کیا۔ اور پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے۔ اس نے مختلف عذرات پیش کرنے شروع کیے۔ تو نواب صاحب نے روک کر کہا کہ داروغہ صاحب فضول باتیں نہ بنایئے مجھے سارا حال معلوم ہے۔ رات کا خواب آئی تو بہ آپ سنیئے گا تو شرمایئے گا۔ (نیاز)

حال ہیں امریکہ کے دو سیاحوں نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "ننگوں کے درمیان" اس کتاب میں اُنہوں نے جرمنی کے تمام شمالی حصّہ کا دورہ کر کے بعض بہت دلچسپ حالات قلمبند کئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "جس وقت ہم لوگ اپنے اپنے کپڑے اتار کر آگے بڑھے۔ تو ہمیں شرم سی تو ضرور معلوم ہوتی تھی۔ لیکن دھوپ میں ننگے بدن پر جو ہوا لگتی تھی۔ وہ نہایت خوشگوار تھی۔ ان لوگوں نے ہماری حد درجہ محبت کے ساتھ پذیرائی کی۔ اور یہ دیکھ کر کہ ان میں سے کسی کی نگاہ ہمارے عُریاں جسم پر متجسس نہ پڑتی تھی یک گونہ سکون سا ہم کو حاصل ہوا۔ لیکن ہم مشکل سے اپنی نگاہوں کی جستجو کو چھپا سکے جو سینکڑوں نوجوان لڑکیوں کی عُریانی کو اپنا ہدف بنائے ہوئے تھی"۔

ان سیاحوں نے بیان کیا ہے۔ کہ اس عریاں کالونی کے رہنے والے نہایت صحیح و توانا اور اچھے دل و دماغ کے ہیں۔ ان کی بیویاں، لڑکیاں، بچے اور بوڑھے سب نہایت ہی مسرور زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور آپس میں شادی بیاہ بھی اس عریاں سادگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے دوران قیام میں ایک دن ہمبرگ کا ایک دولت مند شخص مع اپنی بیوی کے یہاں آیا۔ جو نہایت قیمتی لباس اور زیور سے آراستہ تھی۔ وہ یہاں آ کر ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہاں سے نکلے تو پہچاننا دشوار ہو گیا۔ کیونکہ دونوں ننگے تھے۔ اور حد درجہ مسرور نظر آتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ سوائے جرمنی کے یورپ کے دیگر ممالک میں ابھی تک عملاً اس آزادی کا رواج نہیں ہوا لیکن فکر و احساس کے لحاظ سے یہ لہر ہر جگہ دوڑ گئی ہے۔

اور وہ وقت یقیناً آنیوالا ہے جب سرزمین مغرب میں ہر عورت کا جسم عریاں طلوع آفتاب کا منظر ہو کر رہ جائے گا۔ خود جرمنی میں بھی اول اول جب ایک عریاں عورت ہوٹل میں داخل ہوئی تو پولیس نے اس کی مزاحمت کی تھی لیکن آج خود حکومت کی طرف سے اسی حوا کی بیٹی کے لئے وہ تمام انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ جو اس کے ذوق عریانی کو تسکین پہنچانے والے ہیں۔

مشرقی ممالک میں بھی مغربی تہذیب بڑی وسعت و قوت کے ساتھ پھیل رہی ہے یہاں تک کہ سرزمین عرب میں بھی جو انبیاء ورسل کا مہبط رہا ہے۔ بہت سی لڑکیوں کے گیسوؔ "تا بنا گوش" سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

ہندوستان کی عورت میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہوا ہے وہ بھی اپنے اندر سخت اضطراب انگیز مستقبل چھپائے ہوئے ہے۔ اور کسے خبر ہے کہ حکومت مغرب کے برکات دو تین نسلوں کے بعد یہاں کی عورت کو کیا سے کیا بنا دینے والے ہیں۔ اس لئے اس وقت ہندوستان میں کسی کا یہ سوال کرنا کہ پردہ و تعلیم عورت کے لئے ضروری ہے یا نہیں؛ بالکل ایسا ہی سوال ہے، جیسے کمان سے تیر جدا ہونے کے بعد یہ پوچھا جائے۔ کہ تیر چلایا جائے یا نہیں۔ بلکہ اب تو اس سوال کا وقت ہے کہ مرد کو اپنی وفاداری کا امتحان دینے کے لئے بچوں کو دودھ پلانے اور چولہے پر جا کر روٹیاں پکانے کی خدمت کس طرح انجام دینا پڑے گی۔

تاریخ سلطنت انسانی کے لحاظ سے دنیا پر مختلف دور گزر چکے ہیں۔ سب سے

پہلا دور نظامِ امتہالی کا تھا۔ جب عورت مرد پر حکومت کرتی تھی۔ اس کے بعد نظامِ بطریق پھیلا۔ جب مرد برسرِ اقتدار ہوا۔ اور دنیا کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا۔ جو اس نے عورت پر نہ توڑا ہو۔ اب خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد پھر وہی اولین دور آرہا ہے اور عورت کا اقتدار بڑھتا جارہا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک طرف علمی دور کے لحاظ سے تو یہ زمانہ "برق و نور" کا سمجھا جائے اور جنسی حیثیت سے عورت کی حکومت کو قبول نہ کیا جائے جو اگر برق و نور نہیں تو "زائیدہ برق و نور" ضرور ہے۔

(نگار فروری ۱۹۳۳ء)

الف لیلیٰ کے بعد

"سندباد جہازی کی آخری سیاحت"

جب ایک ہزار اور ایک راتیں ختم ہوگئیں۔ تو ملکہ شہرزاد نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔ کہ خدا کا شکر ہے۔ کہ اس نے اتنی مدت تک میری جان سلامت رکھی مگر مجھ سے ایک بڑی فروگذاشت ہوگئی ہے، دنیا زاد نے دریافت کیا وہ کیا، ملکہ نے کہا۔ کہ میں نے سندباد جہازی کی تمام سیر و سیاحت بیان کی۔ مگر اس کی آخری اور سب سے زیادہ دلچسپ سیاحت باقی رہ گئی جس کیلئے میں شہریار سے باادب معافی چاہتی ہوں بہرحال اگر بادشاہ کا حکم ہو تو وہ آخری سیاحت بھی بیان کردوں۔ بادشاہ کو بھی جواب بیدار ہوگیا تھا۔ سندباد کی آخری سیاحت سننے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور اس نے قصہ بیان کرنے کی اجازت دی۔ ملکہ نے وہ آخری کہانی سندباد کی زبانی اس طرح بیان کرنی شروع کی

برسوں تک میں اپنے گھر پر مسرت و اطمینان کی زندگی بسر کرتا رہا۔ کیونکہ اب میری عمر بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اور مجھے زیادہ سکون کی ضرورت تھی۔ مگر کچھ دنوں بعد پھر سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ اور میں نے اپنے اعزہ و احباب سے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ ہر شخص میرے سن و سال کا خیال کر کے مخالفت کرنے لگا۔ مگر میں نے کسی کی نہ سنی۔ اور سفر کا انتظام کر کے ایک روز کسی کو اطلاع کئے بغیر سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنے ساتھ زیادہ بھاری چیزیں نہیں لی تھیں۔ بلکہ بیش قیمت اور نادر اشیاء کے صرف دو صندوق ساتھ لیے تھے۔ یہ سامان ایک حمال پر بار کر کے میں ساحل پر پہنچا اور انتظار کرنے لگا۔ کہ کوئی جہاز اس طرف سے گذرے تو اُس پر سوار ہو کر نئے ممالک کی سیاحت کروں۔

تمام سامان ساحل پر رکھ کر ہم چند درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرنے لگے۔ کئی گھنٹے گذر گئے۔ مگر کوئی جہاز نظر نہ آیا۔ بالآخر کچھ دیر بعد سمندر کی طرف سے ایک عجیب و غریب گونج کی آواز سنائی دی جو مسلسل آ رہی تھی۔ سخت بھیانک تھی۔ رفتہ رفتہ یہ آواز زیادہ قریب سے آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس چیز سے وہ آواز پیدا ہو رہی ہے وہ تیزی کے ساتھ ہماری طرف آ رہی ہے بالآخر اُفق پر ایک سیاہ سا دھبا نمودار ہوا۔ جو بتدریج قد و قامت اور طول و عرض میں بڑھتا جاتا تھا۔ جب وہ داغ ہم سے زیادہ قریب ہو گیا۔ تو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی عظیم الجثہ جانور تیرتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے جس کے جسم کا بڑا حصہ سطح آب کے اوپر ہے۔ یہ جانور ہماری طرف

اس قدر تیز رفتاری سے آرہا تھا۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ اُس کے سینہ سے جھاگ کی کوہ پیکر موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ اور جہاں سے وہ گذرتا تھا سمندر میں سفید جھاگ کی ایک وسیع سڑک سی بن جاتی تھی۔ جیسے آسمان پر کہکشاں۔

جب وہ جانور زیادہ قریب آگیا۔ تو بہت صاف نظر آنے لگا۔ اگر تین بڑے بڑے سر فلک درخت ایک کے اوپر ایک کھڑے کئے جائیں تو شاید اس عجیب و غریب جانور کے طول کا اندازہ ہو سکے۔ اس کا عرض اتنا تھا جتنا کہ قصر امیر المومنین میں ایوان دربار عالم کا۔ اس کا جسم مچھلیوں کا سا نہ تھا۔ بلکہ جسقدر حصّہ اُس کا سطح آب سے باہر تھا وہ نہایت چمکدار اور سیاہ تھا۔ اور تمام جسم چٹان کی طرح ٹھوس اور سخت تھا۔ ایک سُرخ رنگ کی دھاری اس کے چاروں طرف محیط تھی۔ اُس کا شکم جو سطح آب سے نیچے تھا۔ اور جس کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی۔ فلزئی چھلکوں سے پوشیدہ تھا، اور ان کا رنگ ایسا تھا۔ جیسا کہر کی حالت میں شب کے وقت چاند کا ہوتا ہے اُس کی پشت چپٹی اور قریب قریب سفید تھی۔ اور اس پر چھ عدد کانٹے میناروں کی طرح بلند تھے۔ ان کانٹوں کا طول تمام جسم کے طول سے بقدر نصف ہو گا۔

طرفہ یہ ہے کہ اس ہولناک جانور کے منہ نہیں تھا۔ یا کم از کم ہم کو نظر نہیں آتا تھا مگر یہ کمی آنکھوں کی کثرت نے پوری کر دی تھی جن کی تعداد اسّی کے قریب ہو گی۔ یہ آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اور تمام جسم کے چاروں طرف دو قطاروں میں نمایاں تھیں۔ لیکن ایک آنکھ اُوپر اور ایک نیچے تھی اور آنکھوں کی قطاریں سُرخ لکیر کے

متوازی چلی گئی تھیں۔ اسی طرح گویا وہ سُرخ لکیر ابروؤں کا کام دیتی تھی۔ ان خوفناک آنکھوں میں سے دو تین بمقابلہ دوسری آنکھوں کے بہت بڑی تھیں۔ اور ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا ٹھوس سونے کی بنی ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ جانور ہماری طرف انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آ رہا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ جادو کے زور سے چل رہا ہے۔ کیونکہ نہ اس کے مچھلیوں کی طرح پر تھے نہ بطخ کی طرح جھلی دار پاؤں تھے۔ اور نہ پرندوں کی طرح بازو تھے۔ اس کا سر اور دُم دونوں ایک وضع کے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا۔ کہ دم کے قریب دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ جو نتھنوں کا کام دیتے تھے۔ ان نتھنوں میں سے وہ ہولناک جانور نہایت سختی کے ساتھ سانس نکالتا تھا۔ اور سانس لیتے وقت نہایت ناگوار شور پیدا ہوتا ہے۔

اس خوفناک جانور کو دیکھ کر ہم پر بیحد دہشت طاری ہوئی۔ اور یہ دیکھ کر تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا ہی نہ رہی۔ کہ اس جانور کی پشت پر بہت بڑی تعداد چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تھی۔ جن کے قد و قامت انسان جیسے تھے۔ اور صورت بھی انسانوں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف اس قدر تھا۔ کہ وہ ہماری طرح لباس پہنے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا قدرت نے ان کے جسم پر کچھ چھلکا سا پیدا کر دیا ہے جو کپڑے سے مشابہ ہے۔ جو ان کے جسم سے پیوست تھا۔ اِس قدرتی لباس کی وجہ سے اُن کی صورتیں مضحکہ انگیز معلوم ہوتی تھیں۔ اور غالباً ان جانوروں کو اُٹھتے بیٹھتے تکلیف بھی ہوتی تھی:۔

ان انسان نما جانوروں کے سروں پر مربع وضع کی ایک چیز تھی۔ جو صندوقچہ سا معلوم ہوتی تھی۔ ممکن ہے۔ قدرت نے ان کے لئے اسی قسم کے عمامے بنائے ہوں مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ یہ صندوقچیاں نہایت وزندار اور ٹھوس تھیں خیال گذرتا ہے کہ قدرت نے ان صندوقچیوں کے بوجھ سے ان جانوروں کے سروں کا توازن قائم رکھا ہوگا۔ اور انہی سے سروں کی حفاظت بھی ہوتی ہوگی۔ ان جانوروں کی گردنوں میں سیاہ رنگ کے پٹے (غالباً طوقِ غلامی) تھے۔ مگر یہ طوق بہت سخت اور مضبوط تھے۔ اور ان کی وضع بالکل ہمارے کتوں کے پٹوں کی سی تھی۔ ان کی وجہ سے ان قابلِ رحم جانوروں کو اس قدر تکلیف ہوتی تھی۔ کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر اپنی گردن نہیں موڑ سکتے تھے۔ اس طرح وہ بیچارے ہمیشہ اپنے ناک کے سامنے دیکھنے پر مجبور تھے۔ اور ان کی صورتیں ایک حد تک مضحک ہو گئی تھیں۔

جب وہ عجیب الخلقت جانور اس ساحل کے قریب پہنچ گیا۔ جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے۔ تو اس نے دفعۃً اپنی ایک آنکھ بہت کچھ باہر نکالی۔ اور ایک آنکھ میں سے ایک خوفناک شعلۂ آتشیں نمودار ہوا۔ شعلہ کے بعد دھوئیں کا تاریک بادل چھا گیا اور بادل کے گرجنے کی طرح ہولناک شور پیدا ہوا۔ دھوئیں کا بادل پھٹ گیا تو ہم نے دیکھا کہ ان عجیب و غریب انسان نما جانوروں میں سے ایک نرسنگھے کی وضع کی کوئی چیز ہاتھ میں لئے ہوئے جانور کے سر پر کھڑا ہوا ہے۔ اس جانور نے نرسنگھے کا رخ ہماری طرف کر کے منہ لگایا۔ اور اپنی زبان میں جو کرخت اور بعید از فہم تھی۔ ہماری طرف خطاب کیا۔

میں اُس کی کوئی بات نہ سمجھ سکا۔ اس لئے حیران تھا کہ اُسے کیا جواب دوں اسی پریشانی میں حمّال کی طرف متوجہ ہوا۔ جس پر بوجہ خوف کے غشی طاری ہونیوالی تھی۔ اور اس سے دریافت کیا کہ یہ عجیب الخلقت جانور کس قسم کا ہے اور وہ کیا چاہتا ہے۔ اور جو انسان نما جانور اس کی پشت پر نظر آرہے ہیں وہ کیا ہیں؛ حمّال نے بہت کچھ غور وخوض کے بعد بیان کیا کہ اُس نے اس دابتہ الجر کا حال پہلے بھی سُنا ہے یہ ایک نہایت خوفناک دیو ہے۔ اس کے پیٹ میں گندھک اور اس کی رگوں میں خون کی بجائے شعلہ ہائے آتش دوڑتے ہیں۔ یہ جانور بنی نوع آدم کو ایذا دینے کیلئے جنوں نے بنایا تھا۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے انسان نما جانور جو اس کی پشت پر نظر آرہے ہیں۔ وہ اسی قسم کے خود رو جانور ہیں جیسے کتّوں اور بلیّوں کے جسم پر پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ یا جیسے انسان کے جسم پر جوئیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ اور جب یہ چھوٹے چھوٹے جانور اس دابتہ الجر کے جسم میں کاٹتے ہیں۔ تو وہ شعلہ ہائے آتشیں پھینکتا اور تکلیف کی وجہ بادل کی طرح گرجتا ہے۔ اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے اُسے اپنے نفس آتشیں سے جلا کر خاک کر دیتا ہے۔

جب حمّال سے میں نے یہ بات سنی تو وہاں سے جان لیکر بھاگا۔ اور اس بُری طرح بھاگا کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اور پہاڑیوں میں جا گھسا۔ یہی حال اُس حمّال کا بھی ہوا۔ مگر وہ دوسری طرف فرار ہوا۔ مگر کمبخت اس حالت میں بھی میرا تمام اسباب لے گیا۔ اس طرف تو میں بھاگا اور اس طرف ان انسان نما جانوروں نے دابتہ الجر کی پشت سے کود کر

میرا تعاقب کیا۔ اور مجھے پہاڑیوں میں جا پکڑا۔ اس کے ان جانوروں نے جو کل کشتیوں میں بیٹھ کر ساحل پر آئے تھے میرے ہاتھ پاؤں باندھے اور کشتی میں رکھ کر وہ پھر اُسی دابتہ الجبر پر جا پہنچے۔ اس کے بعد وہ عجیب الخلقت جانور پھر کھلے سمندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت بحالت قید و بند میں اپنی حماقت پر سخت متاسف ہوا۔ کہ گھر میں آرام و راحت سے بسر ہوتی تھی۔ نہ سیر و سیاحت کا سودا سر میں سماتا نہ اس مصیبت میں مبتلا ہوتا۔ مگر اب پشیمانی سے کیا ہوتا تھا۔ بہر حال میں صبر و شکر کے ساتھ رہنے لگا۔ اور حتی الامکان کوشش کرنے لگا۔ کہ جس طرح ہو سکے اس نر سنگھے والے انسان نما جانور کی تالیف قلب کروں کیونکہ یہی جانور اپنے ساتھیوں کا سردار معلوم ہوتا تھا بہر حال میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ اور وہ میرے حال پر عنایت فرمانے لگا۔ اس نے مجھ پر یہاں تک مہربانی کی۔ کہ اپنی زبان بھی مجھے سکھانے لگا۔ حتی کہ کچھ دنوں بعد میں اس قابل ہو گیا۔ کہ اُن کی زبان میں باتیں کر سکوں۔ اور میں نے اپنے قید کرنے والے کو سمجھایا۔ کہ میں دنیا کی سیر و سیاحت کا بیحد شائق ہوں۔

ایک روز کھانے سے فراغت کرنے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا۔ "واشیش اسکواشیش اسکوٹیک سندباد ہیڈ بٹل ڈیڈل گرنٹ انٹ ہس جس وھس"۔

اس زبان سے آپ کو معلوم ہوا ہو گا۔ کہ ان لوگوں کی زبان گھوڑوں اور مرغوں کی زبان کے درمیان تھی۔ بہر حال میں ان الفاظ کا ترجمہ کئے دیتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ

"میرے دوست سندباد میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ تم واقعی اچھے آدمی ہو۔ اب ہم لوگ ایک کام کرنیوالے ہیں جسے "سنسار چکر" کہتے ہیں یعنی تمام دنیا کے گرد گھومیں گے۔ اور چونکہ تم سیر و سیاحت کے بیحد شوقین ہو اس لئے میں تم کو اس جانور کی پشت پر بٹھا کر خوب سیر کراؤں گا۔" جب ملکہ شہرزاد یہاں تک قصہ بیان کر چکی تو بادشاہ نے کروٹ بدلی اور فرمایا۔ "ملکہ واقعی بہت حیرت انگیز قصہ ہے مجھے اس جہازی کی سیر و سیاحت کے قصے سن کر بہت لطف حاصل ہوا"۔

ملکہ شہرزاد نے پھر قصہ کا سلسلہ یوں جاری کیا۔

"میں نے اس انسان نما جانور کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس دابتہ الجر کی پشت پر اطمینان سے رہنے لگا۔ جو سمندر میں نہایت تیز رفتاری کے ساتھ تیرتا تھا۔ اگرچہ اس طرف کے سمندر کی سطح چپٹی نہیں بلکہ انار کی طرح ہے۔ اس لئے ہم کبھی موجوں کی چوٹیوں پر چلتے تھے اور کبھی ہموار سطح پر۔

بادشاہ:۔ یہ واقعی عجیب بات تھی۔

ملکہ:۔ بانیہمہ نہایت سچی بات ہے۔

بادشاہ:۔ مجھے بھی شک نہیں۔ بہرحال آپ قصہ کا سلسلہ جاری رکھیں۔

"بہت اچھا کہہ کر شہرزاد نے بیان کیا کہ وہ دابتہ الجر سطح سمندر پر تیرتا رہا اور کچھ دنوں بعد ہم ایک جزیرے میں پہنچے جس کا دور کئی سو میل کا تھا۔ لیکن اس میں یہ بات حیرت انگیز تھی۔ کہ اس جزیرہ کو سمندر کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں نے

بنایا تھا۔ [1]

[1] ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ریاست ٹیکساس (Texas) کے اندر ایک عجیب عجوبہ قدرت یہ ہے کہ دریائے پاسگنو کے مخرج کے قریب ایک متحجر جنگل ہے یعنی جس کے درخت پتھر بن گئے ہیں۔ ان درختوں کی تعداد کئی سو ہے۔ اور جو درخت اب نکل رہے ہیں وہ بھی کسی حد تک متحجر ہوگئے ہیں (ملاحظہ ہو کینڈی صاحب کی کتاب ٹیکساس جلد اول صفحہ ۱۱۰) پہلے تو اس واقعہ کو صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب سے کوہستان راکی (Rocky) میں کالی پہاڑیوں (Black hills) میں دریائے چائین کے مخرج پر ایک پورا جنگل متحجر دریافت ہوا ہے۔ اس وقت سے اس بیان کی تصدیق ہوگئی ہے۔

روئے زمین پر کوئی منظر اس قدر دلفریب نہ ہوگا جیسا کہ مصر کے شہر قاہرہ کے قریب متحجر درختوں کا جنگل ہے جب سیاح شہر سے باہر گور غریباں سے گذرنے کے بعد جانب جنوب اس سڑک سے جو سویز کو جاتی ہے۔ زاویہ قائمہ بناتا ہوا چلیگا تو تقریباً دس میل کے فاصلہ پر پونچکر اسے ایک نجر نشیبی وادی ملیگی جہاں ریت، چھوٹی چھوٹی پتھریاں، کوڑیاں، گھونگھے وغیرہ پڑے ہوئے ملیں گے۔ اس وادی سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی ریت کی پہاڑیوں سے گذرتا ہے جو آہستہ سے کچھ دور تک متوازی چلا گیا ہے۔ یہاں جو منظر سیاح کے پیش نظر ہوگا۔ وہ عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ یعنی میلوں تک سنگین درختوں کا ایک جنگل چلا گیا ہے جس پر اگر گھوڑے کا سم پڑتا ہے۔ تو وہ ڈھلے ہوئے لوہے کی طرح بولتا ہے۔ ان درختوں کی لکڑی سرخی مائل بھورے رنگ کی ہے اور اس میں لکڑی کی تمام خصوصیات اور اندرونی جوہر موجود ہیں۔ درخت عموماً ایک فٹ سے پندرہ فٹ تک اونچے اور نصف

بقیہ اگلے صفحہ پر

اس جزیرے سے روانہ ہو کر ہم اُس دوسرے جزیرے میں پہنچے۔ جہاں ایک بہت بڑا جنگل سنگین[1] درختوں کا تھا جو اس قدر سخت تھے۔ کہ مضبوط کلہاڑی بھی اُن کے کاٹنے سے عاجز تھی۔

اس جزیرہ کی سیر کر کے ہم ایک ایسے ملک میں پہنچے جہاں ایک غار زمین کے اندر تیس چالیس میل تک چلا گیا ہے۔ اور اس غار کے اندر اتنے عظیم الشان محل اور حویلیاں ہیں کہ بغداد اور دمشق میں بھی نہ ہوں گے۔ ان محلات کے چھتوں پر ہزاروں لاکھوں جواہر الماس وغیرہ قد آدم سے بھی بڑے لٹکتے تھے۔ اور بازاروں میں جگہ جگہ مینار اور اہرام اور برج بنے ہوئے تھے۔ اور یہیں بڑے بڑے دریا بہتے تھے۔ جن کا پانی اس قدر سیاہ تھا۔ جیسے روشنائی۔ اور لطف یہ کہ ان دریاؤں کے اندر مچھلیاں بکثرت تھیں۔ مگر ان مچھلیوں کے

فٹ سے تین فٹ تک موٹے ہوتے ہیں۔ اور یہ درخت اس قدر گنجان ہیں کہ ایک مصری گدھا ان میں سے بمشکل گذر سکتا ہے۔ ان درختوں کی جڑیں اور شاخوں کے ڈنٹھل پوری طرح مکمل اور سالم ہیں اور بعض میں چھال کے نیچے کیڑوں کے کھائے سوراخوں اور مکڑیوں کے بھی نشانات موجود ہیں۔ لکڑی کے اندر تمام حلقے اور خلایا، رطوبت صاف اور مکمل نظر آتے ہیں۔ جنہیں خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا جا چکا ہے۔ اور تمام درخت اس قدر پختگی سے پتھر بن گئے ہیں کہ شیشہ پر خط کھینچنا ایک لکڑی کی نوک سے بہت آسان ہے علاوہ ازیں اُن پر نہایت اچھی پالش بھی ہو سکتی ہے (ایشیاٹک میگزین جلد سوم صفحہ ۲۵۹۔ سلسلہ سوم)

[2] مونگے کا جزیرہ

آنکھیں نہیں تھیں ۲ے

بادشاہ :- ہوں -

اس کے بعد ہم سمندر میں تیرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں ایک بلند فلک پہاڑ تھا - اور اس کے اطراف میں پگھلی ہوئی دھاتوں کے چشمے بہتے تھے - بعض بعض چشمے ساٹھ میل لمبے چلے گئے تھے - اور بارہ میل چوڑے تھے - اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک عمیق غار تھا - جس میں خاکستر کی اس قدر مقدار اڑ کر فضا میں پھیلتی تھی - کہ چاروں طرف شب تاریک کا عالم طاری رہتا تھا - اور اس تاریکی کی شدت اس قدر تھی - کہ جب ہم اس پہاڑ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر تھے - اس وقت بھی ہم کسی دودھ کے مانند سفید چیز کو بھی آنکھوں کے قریب لا کر نہ دیکھ سکتے تھے ۵ے اس ملک سے روانہ ہو کر ہمارے دابۃ الجن نے اپنے سفر کا سلسلہ

۲ے کینٹکی واقع شمالی امریکہ کا غار ہے، جسے انگریزی میں (کہتے ہیں

۴ے جزیرہ آئیسلینڈ Iceland) کے اندر ۱۷۸۳ء میں ایسا ہی واقعہ ہوا تھا -

۵ے ۱۷۶۶ء میں جب جزیرہ ہسکلا (Hecla) نامی کوہ آتش فشاں جوش میں آکر پھوٹا تو خاکستر کو کے اس قدر گہرے بادل فضا میں چھا گئے تھے - کہ شہر گلامبا (Glamba) میں جو پہاڑ سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ہے اس قدر تاریکی چھا گئی تھی - کہ لوگ ہاتھوں سے ٹٹول کر راستہ چلتے تھے - اور ۱۷۹۴ء میں جب اطالیہ کا آتش فشاں پہاڑ ویسو ویس (Vesuvius) پھٹا تو مقام قیصرتہ میں جو بارہ میل کے فاصلہ پر ہے - اس قدر تاریکی چھا گئی تھی - کہ لوگ مشعلیں جلا کر راستہ چلتے تھے - یکم مئی ۱۸۱۲ء کو جزیرہ سینٹ ونسنٹ کے آتش فشاں پہاڑ سے خاکستر کا اس قدر

بقیہ اگلے صفحہ پر

جاری رکھا حتیٰ کہ ہم ایک ایسے ملک میں پہنچے جہاں کی دنیا ہی نرالی تھی یعنی یہاں ہم نے ایک بڑی عمیق جھیل دیکھی جس کے اندر سطح آب سے سو فٹ نیچے درختوں کا ایک بڑا انجان شاداب جنگل نظر آتا تھا۔ جب ہم یہاں سے تقریباً سو میل آگے بڑھے تو وہاں کی ہوا ہم نے اس قدر کثیف دیکھی کہ اس میں لوہا اور فولاد اس طرح معلق تیرنے لگتا تھا جیسے ہماری ہوا میں پر یا کاغذ کا ٹکڑا اڑتا ہے۔

بادشاہ :- بالکل جھوٹ۔

اسی سمت ہم کچھ اور آگے بڑھے اور ایک ایسے خوبصورت اور دلفریب ملک میں پہنچے کہ دنیا بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اس ملک کے اندر وسیع سبزہ زاروں سے گزرتا ہوا

گہرا بادل نکلا کہ تمام جزائر باربیڈوز پر چھا گیا۔ اور تاریکی کا یہ عالم ہوا کہ دوپہر کے وقت کھلے میدان لوگوں کو قریب کے درخت اور دیگر چیزیں نظر نہ آتی تھیں اور چھ انچ کے فاصلہ پر سفید رومال نہ دکھائی دیتا تھا۔ (مرے انسائیکلو پیڈیا آف جیاگرفی صفحہ ۲۲۱)

۲؎ سنہ ۱۷۹۰ء میں بمقام قاراقاس (Caraccas) اس قدر زبردست زلزلہ آیا۔ کہ وہاں کی سنگلاخ زمین کا ایک طبقہ جو آریپاؤ ([illegible]) کے جنگل کا ایک حصہ تھا نیچے بیٹھ گیا۔ اور وہاں ایک جھیل پیدا ہو گئی جس کا قطر آٹھ سو فٹ تھا۔ اور جو اسّی سے سو فٹ تک گہری تھی جنگل کے درخت جو اس جھیل کی تہ میں تھے وہ کئی ماہ تک بدستور سرسبز و شاداب رہے۔ (مرے انسائیکلو پیڈیا آف جیاگرفی صفحہ ۲۲۱)

۳؎ سخت سے سخت فولاد کو بھی دھونکنی کے ذریعہ سے آنچ دیکر اس قدر باریک سفوف کی صورت

بقیہ اگلے صفحہ پر

ایک نہایت عظیم الشان دریا ہزاروں میل تک بہتا ہے۔ یہ دریا اس قدر عمیق ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اور پانی اس قدر شفاف ہے جیسے بلور۔ دریا تین میل سے چھ میل تک چوڑا ہے۔ اور اس کے کنارے بعض بعض مقامات پر بارہ سو فٹ بلند ہیں بسدا بہار درختوں کا سرسبز جنگل چلا گیا ہے۔ جہاں خود رو گل ریاحین کی روح افزا خوشبو ہر وقت دوش صبا پر اُڑتی رہتی ہے الغرض یہ تمام ملک اپنی سرسبزی و شادابی اور خوبصورتی سے رشک جنت بنا ہوا ہے لیکن آب و ہوا یہاں کی اس قدر خراب ہے کہ وہاں کی سرزمین پر قدم رکھنا موت کے منہ میں جانا ہے[ش]

بادشاہ :- ہو نہ ہو!

الغرض ہم یہاں سے بہت جلد روانہ ہو گئے۔ اور چند روز بعد ایسے ملک میں پہونچے۔ جہاں ہم نے لاکھوں عجیب الخلقت جانور ایسے دیکھے جن کے سر دل پر ہنسنے کی وضع کے بینٹ [ش]۔ یہ مکروہ صورت جانور اپنے رہنے کیلئے زمین میں بڑے بڑے غار کھودتے ہیں۔ جن کی شکل مخروطی ہوتی ہے۔ اور غار میں چاروں طرف چٹانوں کے ٹکڑے اس طرح جڑ لگاتے ہیں کہ جب کوئی

ہیں منتقل کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگے۔

ش یہ ملک مغربی افریقہ میں وادی دریائے نائیجر ہے۔ جسے نائیجریا (Nigeria) کہتے ہیں یہ ملک قدرتی طور پر نہایت سرسبز و شاداب ہے مگر یہاں کی آب و ہوا یورپین اقوام کو ناموافق ہوتی ہے اور وہ اس ملک کو "موت کا ملک" کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو۔ سائمنڈ کا کولونیل میگزین

Region of the Niger. Simmonds Colonial magazine

دوسرا جانور ان پر پاؤں رکھتا ہے۔ تو وہ فوراً پھسل کر گر پڑتا ہے اور وہ خونخوار مخلوق فوراً اس جانور کا خون چوس لیتی ہے۔ اور لاش کو حقارت کے ساتھ غار کے دہانہ سے جو دراصل "غار قضا" ہے۔ بہت دور پھینک دیتی ہے[۹]

بادشاہ :- واہیات!

ہم اپنا سلسلۂ سفر جاری رکھتے ہوئے ایک ایسے علاقہ میں پونچے جہاں نباتات زمین میں نہیں بلکہ ہوا میں اُگتی[۱۰] ہے۔ اور بعض درخت ایسے بھی تھے۔ جو درختوں پر اُگے ہوئے[۱۱]

۹؎ ایک قسم کی چیونٹی ہوتی ہے جسے انگریزی زبان میں مرمیلیوں ( )

یعنی شیر چیونٹی کہتے ہیں لفظ عجیب الخلقت جو استعمال کیا گیا ہے وہ چھوٹے اور بڑے دونوں قسم کے جانوروں پر عاید ہو سکتا ہے۔ اور غار کے لئے جو لفظ بڑے استعمال کیا گیا ہے وہ اعتباری ہے۔ کیونکہ معمولی چیونٹی کے سوراخ سے "شیر چیونٹی" کا غار نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ لفظ "چٹان" کا اطلاق سائنس کی اصلاح میں ریت کے ذرہ پر بھی ہو سکتا ہے۔

۱۰؎ اکاس بیل جسے انگریزی میں ( )

کہتے ہیں۔ یہ بیل ڈورے کی طرح درختوں اور جھاڑیوں پر پھیلتی ہے۔ اور ہوا سے غذا حاصل کرتی ہے

۱۱؎ طفیلی ( ) درخت جیسے ببول پیپل۔ برگد شیشم وغیرہ پر اکثر ایک قسم کی نباتات اُگ آتی ہے جسے بندہ کہتے ہیں

تھے بعض درخت ایسے تھے۔ جو جانوروں کا گوشت کھاتے تھے[۱۲]۔ بعض درخت ہم نے یہاں ایسے بھی دیکھے جو جڑ سے چوٹی تک آگ کی طرح چمکتے تھے[۱۳]۔ اور بعض نباتات ایسے بھی تھے۔ جن میں نقل و حرکت کی قوت بھی تھی۔ اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے[۱۴] اور سب سے زیادہ عجیب و غریب ایک قسم کے پھول دیکھے جو سانس لیتے تھے، جان رکھتے تھے، اور پنکھڑیوں کو اپنی قوت ارادی سے حرکت میں لاتے تھے۔ ان پھولوں میں انسان کی طرح یہ خصوصیت بھی تھی۔ کہ وہ اپنے حسن دلفریب سے جانوروں کو پھانس لیتے تھے جنہیں وہ بھیانک کال کوٹھڑیوں میں قید رکھتے تھے[۱۵]۔

---

[۱۲] مسٹر جے۔ بی۔ ولیمس ساکن سالم (امریکہ) نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ کو ایک کیڑا اندر کیا جسے وہ نیوزی لینڈ سے لائے تھے۔ اس کی نسبت یہ تحریر کیا کہ یہ جانور ہاٹ (Hotte) کہلاتا ہے جو ہزار پا کی وضع کا ہے اور یہ راتا (Rata) درخت کی جڑوں میں ہوتا ہے۔ اور اس کے سر سے پودا نکلتا ہے یہ کیڑا درخت پر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور جب چوٹی پر پہنچتا ہے تو سوراخ کرتا ہوا جڑ تک اُتر آتا ہے۔ جہاں وہ سوراخ کھود کر باہر نکلتا اور مر جاتا ہے۔ اور وہ پودا اس کے سر میں بڑھتا رہتا ہے اس کیڑے سے ایک قسم کا رنگ بنایا جاتا ہے۔

[۱۳] معادن اور قدرتی غاروں میں ایک قسم کا بے پھول کا سماروخ پایا جاتا ہے جس سے تیز روشنی نکلتی رہتی ہے۔

[۱۴]

[۱۵] اس پھول کو انگریزی میں (Aristochia clematitis) کہتے ہیں۔ اس کا

بقیہ اگلے صفحہ پر

بادشاہ:- بالکل جھوٹ

اس ملک سے روانہ ہو کر ہم بہت جلد ایک دوسرے ملک میں پہنچے جہاں کی چڑیاں اور شہد کی مکھیاں نہایت ہی زبردست ریاضی داں واقع ہوئی ہیں۔ اس ملک کے عقیل و فہیم لوگ ان جانوروں سے روزمرہ علم الہندسہ میں سبق لیتے ہیں۔ اس ملک کے بادشاہ

چہرہ نالی دار رہتا ہے۔ پھول کی جڑ گول ہوتی ہے نالی دار حصہ کے اندر سخت بال اس طرح ہوتے ہیں۔ کہ ان کے سرے نیچے کی طرف جھکے ہوتے ہیں۔ کوئی حصہ میں ایک حصہ ہوتا ہے۔ جس میں بیضہ دان (Germen) اور سر بچہ (Stigme) دونوں ہوتے ہیں۔ اور ان کے چاروں طرف زردان (Stamens) ہوتے ہیں لیکن چونکہ یہ زردان بمقابلہ بیضہ دانوں کے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ سر بچہ پر زردانہ نہیں پھینک سکتے۔ کیونکہ یہ پھول ہمیشہ سیدھا رہتا ہے تا وقتیکہ حاملہ نہ ہو جائے یہی وجہ ہے کہ جب تک کوئی خارجی مدد نہ حاصل ہو زردانہ پھول کی تہ تک نہیں پہنچتا۔ اس کیلئے قدرت نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ایک چھوٹا سا کیڑا جسے انگریزی زبان میں (Tripula Pennigornis) کہتے ہیں بتلاش شہد پھول کی نالی میں داخل ہوتا ہے۔ اور گرہ ی حصہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ چاروں طرف پھرتا ہے حتی کہ اس پر زردانہ لپٹ جاتا ہے لیکن چونکہ نالی کے اندر بالوں کا رخ نیچے کی جانب ہوتا ہے اسلئے وہ باہر نہیں نکل سکتا چنانچہ وہ گھبرا کر پھول کے اندر چاروں طرف مارا مارا پھرتا ہے حتی کہ وہ سر بچہ میں گھس پھر کر اس کے اندر اپنے جسم سے کافی مقدار زردانہ کی پہنچا دیتا ہے جس سے وہ پھول حاملہ ہو جاتا ہے اسکے بعد پھول کا سر بہت جلد نیچے کی طرف جھک جاتا ہے۔ اور نالی کے اندر بال بھی ڈھیلے ہو جاتے ہیں

بقیہ اگلے صفحہ پر

نے دو سوال پیش کر کے بھاری انعام کا وعدہ کیا۔ ان سوالوں کو فوراً حل کر دیا گیا۔ ایک شہد کی مکھیوں نے اور دوسرا چڑیلوں نے حل کیا۔ مگر بادشاہ نے ان سوالات کے حل مخفی رکھے۔ آخر سالہا سال کی دماغ سوزی اور دیدہ ریزیوں کے بعد بڑی بڑی کتابیں لکھ کر اس ملک کے ریاضی دانوں نے وہ حل معلوم کیے[۱۶]

بادشاہ ۔ معاذ اللہ۔ اس قدر جھوٹ۔

ابھی ہم اس سلطنت کی حدود سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ کہ ایک دوسرے ملک میں پہنچے یہاں ساحل بحر سے مرغوں کا ایک اس قدر زبردست بادل اڑ کر ہمارے سروں پر سے گذرا کہ اس بادل کا طول دو سو چالیس میل اور عرض ایک سو میل تھا۔ اگرچہ یہ مرغ

سے لپٹ جاتے ہیں۔ اب وہ کیڑا بآسانی باہر نکل جاتا ہے۔

۱۶؎ جب سے شہد کی مکھیاں وجود میں آئی ہیں۔ ہمیشہ اپنا چھتہ ایک ہی وضع کا سا بناتی چلی آئی ہیں۔ ہر خانہ کا طول و عرض اس کے اضلاع اور اضلاع کے درمیان زاویے ہمیشہ یکساں ہوتے ہیں۔ ان کے طول اور زاویوں میں سر مو فرق نہیں ہوتا۔

گذشتہ صدی کے آخری زمانہ میں ریاضی دانوں میں یہ مسئلہ چھڑا کہ ہوائی چکی کے پنکھوں کو بہترین وضع کس طرح دی جائے۔ یہ مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ تھا بہت سے مشہور و معروف ریاضی دانوں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی بے سود کوشش کی۔ بالآخر محنت کوششوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ قدرت نے پرندوں کے بازوؤں کو جو شکل و صورت دی ہے۔ اس سے بہتر صورت چکی کے پنکھوں کو نہیں دی جا سکتی۔

ایک میل فی منٹ کی رفتار سے اُڑ رہے تھے۔ مگر ان کو گزرنے میں پورے چار گھنٹے لگے اس بادل میں کئی کروڑ مرغ تھے[۱]

بادشاہ: اُف اس قدر جھوٹ۔

جب پرندوں کا یہ غول جس کی وجہ سے ہم کو سخت تکلیف ہوتی ہمارے سروں پر سے گذر گیا۔ تو ایک اور مُرغ نہایت ہیبت انگیز اور خوفناک نمودار ہوا۔ اسکی جسامت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ بغداد میں اتنا بڑا گنبد کوئی نہیں۔ اس خوفناک پرند کا سر نظر نہیں آتا تھا۔ فقط پیٹ ہی پیٹ تھا۔ جو نہایت مضبوط اور گول تھا۔ علاوہ ازیں وہ کسی قسم کے ملائم مادہ کا بنا ہوا تھا۔ تمام پیٹ نہایت چکنا اور چمکدار تھا اور اس پر مختلف رنگ کی دھاریاں تھیں۔ اپنے پنجوں میں یہ مُرغ ہولناک ایک مکان بلا سقف و بام لئے ہوئے اُڑا جاتا تھا۔ غالباً اس کا آشیانہ آسمان پر ہوگا۔ کیونکہ وہ بتدریج اوپر چڑھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس نے مکان کی چھت نوچ کر پھینک دی ہے۔ مکان کے اندر ہم کو آدمی بھی بیٹھے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔ جو یقیناً خوفزدہ تھے۔

---

[۱] معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے فرانکفرٹ اور انڈیانا کے علاقہ کے درمیان کبوتروں کا ایک غول گذرتے دیکھا ہوگا۔ جو کم از کم ایک میل چوڑا ہوگا۔ یہ غول چار گھنٹے میں گذرا ہوگا۔ اگر ان رفتار ایک منٹ فی میل لگائی جائے۔ تو تمام غول کا طول ۲۴۰ میل ہوتا ہے اور اگر ایک مربع گز کے اندر تین کبوتر فرض کئے جائیں تو تمام کبوتروں کی تعداد ۲۲۳۰۲۰،۲۰۰ ہوتی ہے (ملاحظہ ہو سیاحت کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ مرتبہ فلینٹ۔ الیف۔ ہال)

اور موت ان کی نظروں میں پھر رہی تھی ہم نے ہر چند گلا پھاڑ پھاڑ کر شور مچایا تاکہ وہ ڈر کر اپنا شکار چھوڑ دے مگر اس نے ہمارے سروں پر ایک بھاری تھیلا پھینکا جس میں ریت بھری تھی۔ [۱۸]

بادشاہ :- لاحول ولا قوۃ

اس واقعہ کے بعد ہم ایک طویل و عریض براعظم میں پہنچے جس کے طول و عرض کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس براعظم کی زمین نہایت ٹھوس واقع ہوئی تھی مگر بایں ہمہ حیرت انگیز یہ بات تھی۔ کہ اسے آسمانی رنگ کی ایک گائے اپنے سینگوں پر اٹھائے ہوئے تھی۔ اور ان سینگوں کی تعداد چار سو سے کم نہ تھی [۱۹]

بادشاہ :- اس بات کا میں یقین کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے یہی بات کسی کتاب میں بھی پڑھی ہے۔ اور کتابی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں۔ ہم فوراً اس براعظم کے نیچے گائے کی ٹانگوں میں ہو کر گذرے اور چند گھنٹے کے بعد ایک نہایت عجیب و غریب ملک میں پہنچے۔ اس انسان نما جانور نے مجھے بتایا کہ یہ ملک ان کا وطن ہے یعنی اس سرزمین میں اسی قسم کے انسان نما جانور رہتے ہیں۔ یہ بات سن کر میرے دل میں انسان نما جانوروں کی بیحد قدر و وقعت ہوئی۔ اور اب واقعی مجھے یہ خیال کر کے شرم آتی ہے کہ اب

---

[۱۸] یہ مرغ ہیبت ناک جدید قسم کا غبارہ تھا۔ جب ہوا میں زیادہ بلند ہونا منظور ہوتا ہے تو غبارے سے ریت کی بھری ہوئی بوری پھینک دی جاتی ہے۔ تاکہ سبک ہو کر اوپر چڑھے۔

[۱۹] قدیم لوگوں کا خیال تھا۔ کہ زمین ایک نیلگوں گائے کے سینگوں پر قائم ہے اور ان سینگوں کی تعداد چار سو ہے

تک میں ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا رہا تھا۔ مگر اب اس ملک میں پہنچکر مجھے معلوم ہوا کہ وہ انسان نما جانور درحقیقت نہایت طاقتور جادوگروں کی ایک قوم ہے ان لوگوں کے مغز میں کیڑے ہوتے ہیں[20] جب یہ کیڑے کلبلاتے ہیں۔ تو ان لوگوں کا دماغ بیہ ان خیال میں خوب کام کرتا ہے۔

بادشاہ؛ توبہ! توبہ!!

ان جادوگروں نے بہت سے عجیب و غریب جانور پال رکھے تھے۔ مثلاً ایک بہت عظیم الجثہ گھوڑا تھا جسکی ہڈیاں لوہے کی تھیں اور خون کی جگہ اس کی رگوں میں کھولتا ہوا پانی دوڑتا تھا۔ دانہ کی بجائے وہ گھوڑا سیاہ پتھر کھاتا تھا۔ اور باوجود اس قدر سخت غذا کے بھی وہ نہایت تندرست اور طاقتور تھا کہ وہ اس قدر وزن گھسیٹ لے جاتا تھا کہ بغداد بھر میں کوئی مسجد اس وزنی نہ ہوگی۔ اور تیز رفتار اس قدر تھا کہ بہت سے پرندے اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے[21]

بادشاہ؛ لغو اور غلط!

---

[20] ان کیڑوں کو انگریزی زبان میں (Entozoa) کہتے ہیں (ملاحظہ ہو ویاٹ صاحب کی کتاب فزیالوجی صفحہ ۱۴۳)

[21] ریلوے انجن (Locomotive) لندن اور اکسیٹر کے درمیان جو گریٹ ویسٹرن ریلوے چلتی ہے اس پر اکثر ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار پوری کی جا چکی ہے۔ ایک ٹرین پاؤنگٹن اور ڈیڈکوٹ کے درمیان جسکا وزن ۲۰۰ ٹن (ایک ٹن = ۲۸ من تقریباً) ۵۳ میل کے فاصلہ پر ۵۱ منٹ میں پہنچائی جا چکی ہے

اسی قوم کے یہاں میں نے ایک مُرغی بھی دیکھی جس کے جسم پر ایک بھی پر نہ تھا۔ لیکن جثہ میں وہ اونٹ سے بھی بڑی تھی۔ اس کے جسم میں بجائے گوشت واستخواں کے لوہا اور اینٹیں تھیں اور مندرجہ بالا کی طرح اس کا خون بھی کھولتا ہوا پانی تھا۔ اور اسی کی طرح یہ بھی سیاہ پتھر یا لکڑی کھاتی تھی۔ یہ مرغی ایک دن میں اکثر سو فیصد انڈے سیکر بچے نکالتی تھی۔ اور انڈوں سے باہر نکلنے کے بعد وہ چوزے کئی ہفتہ تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہتے تھے[۲۲]۔

بادشاہ:۔ توبہ! توبہ!!

جادوگروں کی اس زبردست قوم کے ایک طاقتور ساحر نے پیتل، لکڑی، اور چمڑے کا ایک انسان بنایا اور اس میں اس قدر عقل پیدا کی کہ وہ شطرنج کھیلنے میں خلیفہ ہارون الرشید اعظم کے سوائے دُنیا کے تمام شاطروں کو مات دیتا تھا[۲۳]۔ اسی قوم کے ایک دُوسرے جادوگر نے ایک اور پتلا بنایا جو حساب کتاب میں بڑے بڑے ماہرین کو شرمندہ کر دیتا تھا یعنی وہ ایک سیکنڈ میں اس قدر بڑے بڑے حساب صحت کے ساتھ لگا دیتا تھا کہ ان کے حل کرنے میں پچاس ہزار آدمیوں کی متفقہ محنت وجانفشانی کو ایک سال درکار ہوتا[۲۴]۔ اسی قوم کے ایک تیسرے جادوگر نے ایک اور عجیب غریب چیز بنائی

۲۲؎ مرغی کے انڈے سینے کی بھٹی۔

۲۳؎ MAELZEL'S AUTOMATIC CHESS PLAYER

۲۴؎ BABBAGE'S CALCULATING MACHINE

جو نہ انسان ہے نہ حیوان بلکہ اس کا مغز سیسہ کا ہے۔ اور سینہ میں تیر کے مانند ایک سیاہ چیز ملی ہوئی تھی۔ اور اس کی انگلیاں بلا تکلف ایک گھنٹہ کے اندر پچاس ہزار قرآن لکھ دے سکتی ہے اور وہ بھی اس قدر صحت کے ساتھ کہ ایک نسخہ دوسرے سے اعراب میں بھی مختلف نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز اس قدر طاقتور واقع ہوئی ہے۔ کہ اگر وہ چاہے تو زبردست سے زبردست سلطنت کو بھی تہ و بالا کر سکتی ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے ایک معمولی جماعت کو قوم اور قوم کے لئے ایک وسیع سلطنت قائم کر سکتی ہے۔ الغرض خیر و شر دونوں باتیں اسی چیز کے ہاتھ میں ہیں[25]

بادشاہ:- لاحول ولاقوۃ۔ اس قدر جھوٹ۔

ساحروں کی اس قوم میں ایک شخص ایسا بھی گذرا ہے جس کی رگوں میں سمندر (آگ کا جانور) کا خون دوڑتا تھا۔ کیونکہ وہ جلتے ہوئے تنور میں بیٹھ کر اپنا حقہ پی سکتا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا کھانا بھی پکا لیتا تھا[26]۔ ایک اور جادوگر ایسا تھا جو فلزی اشیاء کو سونے میں تبدیل کر دیتا تھا۔ اور ان پر نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا[27]۔ ایک اور شخص ایسا گذرا ہے جس نے تار کشی کے ذریعہ سے ایسا باریک تار بنایا جو آنکھوں سے نظر نہیں آسکتا تھا[28]۔

---

۲۵ پریس (PRESS)

۲۶ (CHABERT) اور اس کے بعد صدہا دیگر اشخاص۔

۲۷ الکٹروٹائپ (ELECTROTYPE) ۲۸ وولاسٹن (WOOLASTON) نے دوربین کیلئے ایک تار ایک انچ کا اٹھارہویں ہزار حصہ کے برابر بنایا تھا۔ یہ اس قدر باریک تھا کہ صرف خوردبین کے ذریعہ سے دیکھا جا سکتا تھا۔

اور ایک شخص تو اس قدر عجیب و غریب دماغ والا ہے۔ کہ وہ ایک لحظہ ادھر چیز کے اہتزاز کا شمار ایسی حالت میں کر سکتا تھا۔ جب کہ وہ ایک سیکنڈ میں نو لاکھ مرتبہ حرکت کرتی تھی[۲۹]۔ بادشاہ۔ جھوٹ کی حد ہو گئی۔

انہی جادوگروں میں سے ایک شخص نے ایک غیر مرئی سیال[۳۰] شئی کے ذریعہ یہ کمال دکھایا۔ کہ انسانی ڈھانچوں میں جان ڈال دی۔ اور چلنے پھرنے۔ ہاتھ پاؤں ہلانے اور ناچنے کودنے لگے۔ ایک جادوگر نے اپنی آواز کو اس قدر ترقی دی ہے۔ کہ اگر وہ چاہے تو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک اپنی بات سُنا سکتا ہے[۳۱]۔ ایک جادوگر نے اپنا ہاتھ اس قدر بڑھا لیا ہے۔ کہ اگر وہ دمشق میں بیٹھا ہو۔ تو بغداد میں خط لکھ سکتا ہے۔ بلکہ بغداد تو کیا وہ ہر جگہ یہ کام کر سکتا ہے[۳۲]۔ ایک جادوگر نے بجلی کو حکم دیا۔ کہ وہ آسمان سے اتر کر اس کے پاس آئے۔ چنانچہ وہ اتری اور اس ساحر کے ساتھ کھیلتی رہی ایک اور ساحر نے دو آوازیں لیں۔ اور ان دونوں سے سکوت پیدا کر دیا۔ دیگر ساحر نے دو

---

۲۹ نیوٹن نے دکھایا کہ شبکیہ (RETINA) بنفشی شعاعوں کے زیر اثر ایک سیکنڈ میں نوّے کروڑ مرتبہ اہتزاز کرتی۔

۳۰ برقی رو (VOLTAIC PILE)

۳۱ الکٹرو ٹیلیگراف (ELECTRO TELEGRAFH) جس کے ذریعہ سے خبر فوراً پہنچ جاتی ہے۔

۳۲ THE ELECTRO TELEGRAH PRINTING APPARATUS

نہایت درخشاں روشنیاں لیں اور ان دونوں کو ملا کر تاریکی پیدا کر دی[۳۳]۔ ایک جادوگر نے دہکتے ہوئے تنور کے اندر برف پیدا کر دی[۳۴]۔ دوسرے نے آفتاب کو حکم دیا کہ وہ اسکی تصویر کھینچے چنانچہ آفتاب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اور اس کی تصویر کھینچ دی[۳۵]۔ ایک اور جادوگر نے شمس و قمر اور دیگر سیاروں کو لیا اور ان کو نہایت صحت کے ساتھ وزن کیا۔

---

[۳۳] طبیعات کا ایک معمولی تجربہ ہے کہ اگر دو نورانی نقطوں سے دو سرخ شعاعیں کسی تاریک کرہ میں کسی سفید چیز پر اسطرح ڈالی جائیں کہ ان کے طول میں ۲۵۸۰۰۰۰؍ انچ کا فرق ہو تو ان شعاعوں کی تنویر بالمضاعف ہوجائیگی۔ اسی طرح اگر طول کا فرق ۱/۲ ۲ یا ۱/۲ ۳ وغیرہ کے اضعاف ہوں تو تنویر میں شدت پیدا ہوتی ہوگی لیکن اگر شعاعوں کے طول سے فرق ۱/۲ ۲ یا ۱/۲ ۳ وغیرہ کے اضعاف ہوں تو قطعی تاریکی پیدا ہو جائے گی۔ اسی قسم کے تجربات اگر آواز کے ساتھ کئے جائیں تو یہی نتائج پیدا ہوں گے۔

[۳۴] پلاٹینم کی ایک کٹھالی اسپرٹ لیمپ پر رکھو اور سرخ آنچ دو لیکن اس میں گندھک کا تیزاب ڈالو۔ اگرچہ معمولی تجربوں میں یہ تیزاب سب سے زیادہ اڑتا ہے۔ لیکن وہ اس کٹھالی میں قائم رہیگا۔ اگر اس وقت پانی کے چند قطرے کٹھالی میں ڈال دئے جائیں تو تمام تیزاب اسقدر تیزی سے غائب ہوجائیگا۔ کہ پانی کے قطروں کی حرارت مستور بھی اسی کے ساتھ اڑ جائے گی۔ اور پانی کے قطرے منجمد ہو کر بصورت برف رہ جائیں گے۔ اسطرح گویا دہکتے ہوئے تنور میں برف بن جاتی ہے۔

[۳۵] (DAGUERREOTYPE)

اُن کے تمام گہرے اسرار معلوم کئے۔ اور جن مادوں کے وہ بنے ہوئے ہیں اُن کی شناخت معلوم کی۔ الغرض یہ تمام قوم اس قدر زبردست ساحر واقع ہوئی ہے کہ ان کے بچے بلکہ کتنے بلیاں تک بھی ان چیزوں کو بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ جن کا وجود نہیں یا جو اس قوم کے وجود میں آنے سے بھی بیس ہزار سال پیشتر صفحہ ہستی سے نابود ہو گئی تھیں۔

بادشاہ:۔ لاحول ولاقوۃ!

ان عظیم الشان اور زبردست جادوگروں کی بیویاں اور بیٹیاں انتہا درجہ کی شائستہ

۲۶ھ اگرچہ روشنی کی رفتار دو لاکھ میل فی سیکنڈ ہے۔ لیکن کرۂ ارض سے قریب ترین ثابت جس کا نام کلب اختر (DOG STAR) ہے وہ اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی کو کرۂ ارض تک پہنچنے میں کم از کم تین سال لگیں گے تو اس سے بھی آگے جو ستارے ہیں اُن کی روشنی بیس سال بلکہ بعض کی ایک ہزار سال میں ہم تک پہنچیگی۔ برعکس ازیں یہ سمجھ کر کہ اگر وہ ستارے بیس یا بائیس ہزار سال پیشتر فنا ہو جاتے۔ تو ان کی روشنی ہم کو اب تک نظر آتی یعنی وہی روشنی جو ان کی سطح سے بیس ہزار سال پیشتر چلی تھی۔ کرۂ ارض پر اب تک نظر آتی۔ (جیا دُوے جرنل نوٹ) بقول ہرشیل کبیر (SLDER HERSCHEL) جو روشنی خفیف ترین سدیم کی اسکی دوربین کے ذریعہ سے نظر آتی ہے۔ وہ تیس لاکھ سال پیشتر چلی ہوگی۔ اور سدیم لارڈ راس (ROSS) کی دوربین سے دکھائی دیتی ہے۔ وہ کم از کم دو کروڑ برس قبل چلی ہوگی۔

سلیقہ شعار، عالم، فاضل اور دانشمند ہوتی ہیں۔ الغرض جس قدر خوبیاں بلحاظ فضائل خیال میں آسکتی ہیں۔ وہ سب ان میں موجود ہیں حسن و جمال میں بھی قدرت نے ان کو زبردست حصہ مرحمت فرمایا ہے۔ مگر ایک سخت عیب ان میں پایا جاتا ہے جو باوجود کوشش بسیار ان کے شوہروں اور والدوں سے بھی دُور نہ کیا جاسکا۔

بادشاہ: وہ کیا عیب ہے؟

کسی خبیث جن نے جو ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں۔ کہ انسان کو مضرت پہنچائیں ان شائستہ خواتین کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے۔ کہ جس چیز کو حسن و جمال سے تعبیر کرتے ہیں محض اس قدر ہے۔ کہ جسم کا وہ حصہ جو ناف سے نیچے ہے کوہان شتر کی طرح اُبھرا ہوا ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ جس قدر بڑا کوہان ہوگا۔ اُسی قدر زیادہ ایک عورت حسین و جمیل ہوگی الغرض باوجود اس قدر زیادہ شائستگی اور علم و فضل کے وہ خود کو مادہ شتر بنانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

بادشاہ: بس بند کرو اپنی لغو داستان! میں اس سے زیادہ ہرگز سننا نہیں چاہتا۔ تمہاری دروغ بیانیوں سے میرے سر میں درد ہوگیا ہے۔ اب صبح بھی ہونے والی ہے۔ اُدھر پہلی شادی ہوئے کس قدر عرصہ گذرا! میرا ضمیر اب مجھے پھر لعن طعن کرنے لگا ہے۔ بس اب تمہاری عمر ختم ہوگئی۔ اور رات تمہیں بھی میری دوسری بیویوں کے پاس جانا پڑے گا؟

بادشاہ کا یہ حکم سن کر ملکہ شہرزاد کانپ اٹھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ کہ جو کچھ اس کے

شوہر کے مُنہ سے نکل گیا ہے۔ وہ ضرور پُورا ہوگا۔ اس لئے اُس نے اپنے آپ کو حوالہ جلّاد کر دیا۔ اور اس طرح سندباد جہازی کی سرگذشت کا بہت حصّہ باقی رہ گیا۔ جس کے سننے سے دُنیا اب تا ابد محروم رہے گی۔

(اڈگرالن پو)

نہرِ صفا کا نغمہ

وہ لوگ جو لبنان کے پہاڑوں میں گرمیاں بسر کرنے جاتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ "عین زحلتا" کیسا اچھا گاؤں ہے، لیکن اس سے زیادہ اچھا صنوبر کا وہ جنگل ہے، جو گاؤں کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس سے زیادہ جمیل نہرِ صفا کا منظر ہے، جو دامنِ کوہ سے نکلتی ہے اور تھوڑے سے فاصلہ پر جا کر ندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے

یہ دونوں نہریں اپنی حکایاتِ ابدی، کہا کرتی ہیں اور کنارے کے درخت اپنے نرم ریشمی لباس میں جھکے ہوئے اُس کو سنا کرتے ہیں، یہ دونوں داستانِ شکوہ و شکایت بیان کرتی رہتی ہیں، اور وادی کی روح بھی اُن کے ساتھ کراہتی رہتی ہے، یہاں تک کہ ان کا پانی سمندر میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔

— (آنسہ می)

یہ وہ مقام ہے جہاں عالم کی صورتیں سیال حالت میں اور پتھر کے ذرات پگھلی ہوئی صورت میں نظر آتے ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں خوشبو میں محبت کی ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی ہیں اور پھول سحر آلود شعاعوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

.. یہاں قوس قزح آکر نہاتی ہے، اور پانی میں اپنے رنگ سے ایک لحن سمیں چھوڑ جاتی ہے ۔۔۔ یہاں افق اپنے تمام اسرار زریں خطوط کی صورت میں زمین پر بھیجتا رہتا ہے ۔۔۔ یہاں روحیں دختران آب کی پلکوں پر آکر محو خواب ہو جاتی ہیں، اور نور تاریکی سے اور بیداری خواب سے مل جاتی ہے۔

یہاں بوسۂ نسیم یکسر شوق و ہیجان ہے۔ اور موجوں کا باہم کھیلنا تبادلۂ نگاہ و ابتسام یہاں شاخوں پر پتیوں کا ارتعاش ستاروں کی نگاہوں کا سلام ہے اور شاخوں کی جنبش ملائکہ کا پیغام۔

جس وقت صبح پہاڑ کی چوٹیوں سے گزرتی ہے تو اپنی صورت اسی آئینۂ بلوریں میں دیکھتی ہے، پھولوں کی طرح حسین تمناؤں، چڑیوں کی طرح مائل پرواز امیدوں سے لبریز جوانی کی علامتیں یہیں آکر دیکھتی ہے، پھر شام آتی ہے۔ اور اس کی گہرائیوں میں حزن و ملال کی تلخیاں چھوڑتی ہوئی گذر جاتی ہے۔

یہاں ساز حزن و ملال مصروف گریہ ہوتا ہے اپنے مجروح دل کو لیے ہوئے رویا کرتا ہے، اور ہر لحظہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آخری سانس ایک کراہ کیساتھ سونپ دینے والا ہے۔

لیکن پانی کی موجیں موت و حیات سے ناواقف ہیں، اور ان کا کام صرف یہی ہے کہ ماضی کے افسانے دہراتی رہیں۔ مستقبل کے متعلق تنبیہ کرتی رہیں۔ کبھی مسرت کی آواز بلند کریں اور کبھی غم کے نوحے۔

یہ حیات کے معمّوں میں سے ایک معمّہ ہے، زمانہ کی راتوں میں سے ایک رات ہے، اور میں اس معمّہ کے سامنے، اور اس رات کے مقابلہ میں خود ایک رات ہوں غمناک ساحل پر تنہا کھڑی ہوئی مبتلائے حیرت ہوں۔ نگاہیں خانۂ چشم سے باہر نکلتی ہیں اور مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ سنتی ہوں، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ڈھونڈھتی ہوں اور نہیں پاتی۔ معلوم کرنا چاہتی ہوں لیکن کوئی نہیں بتاتا۔ میرا دل دھڑک رہا ہے، میرا نفس ساز ہے خوابوں کا، نغموں کا . . . .

. . . . لیکن میں ایک زندہ معمّہ ہوں، جو شاخوں کے سایہ میں کراہ رہا ہے، اور کسی دوسرے معمّہ کی تلاش میں مستفسرانہ نگاہ ڈالتا ہے لیکن اسے سوائے اپنی صورت کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

صبح کے وقت میں نہر کے منبع پر گئی، اور موجوں کے درمیان بڑی چٹان پر بیٹھ گئی، اس وقت میرا خیال دختران آب کے بالوں سے پیدا ہونے والی نکہت کا لطف اٹھا رہا تھا۔

اس چٹان پر مجھ سے پہلے بہت سے آدمی آکر بیٹھے ہوں گے اور میری ہی طرح سب کا دل انفاسِ فطرت اور اصواتِ خلود کے سامنے رعب و رغبت سے منقضی ہوا ہوگا جو اس وقت میرے دل میں آرہا ہے۔ ان کے دل میں بھی گزرا ہوگا۔ کیونکہ افکارِ انسانی باوجود تنوع کے تجربہ کے لحاظ سے ایک سے ہی ہیں اور نفسِ بشری کی رغبت ہر وقت ایک ہی ہے۔

میری طرح سب نے ان موجوں کو دیکھ کر یہی سوال کیا ہوگا کہ تم کہاں سے آرہی ہو کہاں جاؤ گی" یہ سوچو! تم کہاں سے آرہی اور کہاں جاؤ گی ...... میں کہاں سے آئی ہوں اور کہاں جا رہی ہوں؟

موجیں اچھل رہی ہیں، نغمے بلند ہو رہے ہیں فیضِ الٰہی کے اسرار عناصر سے ظاہر ہو رہے ہیں اور ابدیت کے بازو اس کے چاروں طرف پھڑپھڑا رہے ہیں

میرا دماغ ان افکار سے جنہیں میں نہیں جان سکتی ورقی ہو گیا، میرا پیمانہ ان کے سمجھنے کے لیے جو کچھ مابعد نہیں معلوم تنگ ہو گیا ——— میں نے اپنی کلائی سے گھڑی کھولی اور اس سے مخاطب ہوئی کہ "اے گھڑی تو زمانہ کے دریا میں وقت جاری کی نشانی ہے بس تجھے ان موجوں میں ڈبو دیتی ہوں، شاید

تو اپنے حیات منعدنی میں رموز معنوی کا کوئی اثر محفوظ رکھ سکے"۔

پھر میں نے پانی کی تہ سے بعض رنگین سنگریزے جمع کئے اور بولی کہ "اے رنگین پتھرو! میں تمہیں اپنے ساتھ وادی نیل تک لیجاؤں گی۔ تاکہ تم مجھے ان تمام عواطف کی یاد دلاتے رہو، جو نہر صفا کے سامنے میرے دل میں متلاطم ہوئے تھے۔ کیونکہ تم اس ابدیت کی یادگار ہو جس میں ایک لمحہ میں نے زندگی بسر کی ہے"۔

میں نے افق کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ زہرہ کی نگاہیں ایک ستے دیوتا کی طرف ہیں جس کا ہاتھ رات کی چادر پر مختلف صورتیں بنایا کرتا ہے۔

اے نہر صفا، میں روح اور جسم دونوں کی خستگی لے کر آئی تھی۔

میں نے حالات حاضرہ پر غور کیا تو میرا دماغ توپ تفنگ کی آواز باز گشت سے گونج گیا، اور میری نگاہوں کے سامنے خوفناک جنگلوں کی تصویر کھنچ گئی۔ میں نے اجتماعات بشری میں شرکت کا فیصلہ کیا تو میرے کان لایعنی شور و غل سے بھر گئے میرا دل ان کے سطحی معانی اور ناپاک مقاصد کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا، میں انسان کی بیوقوفی، اسکی خواہشوں کی رکاکت اور اسکی فتور ہمت پر تعجب کر رہی تھی۔ کہ میں نے یہ نام سُنا اور اُسے بہت پسند کیا۔ کیونکہ اس میں جمال تھا شیرینی تھی، امن و سکون تھا۔

میرے قدموں کو گرم ریت نے جلا ڈالا تھا، میرے ہاتھ خار زار حیات میں

زخمی ہو گئے تھے، اس لئے میں تیرے پاس آئی کہ تیرے نباتات سے اپنے زخموں کا مرہم حاصل کروں، تیرے مقدس پانی سے آنکھوں کا وہ غبار دور کر دوں جو جمالِ معنوی کے نظارہ سے مجھے باز رکھتا ہے، چونکہ میرا دل میرے لئے بہت وزنی ہو گیا ہے۔ اس لئے میں تیرے پاس دوڑی ہوئی آئی تھی۔ کہ تیرے ساتھ اسے بھی بحرِ عظیم تک پہنچا دوں۔

تو ابر کی بیٹی ہے، حرارتِ فضا کا کھلونا ہے، غیر فانی مادہ کی ہنسی ہے وادیوں اور بلندیوں کے درمیان فضا کا قہقہہ ہے، تو سورج کا بوسہ ہے، سمندر کے لئے تو وادی میں پہاڑ کا نغمہ ہے، تو ایک چھوٹی سی روح ہے جو بڑی روح کی آغوش تک پہنچنے والی ہے۔

تو گہری ہے، اسرارِ روح کی طرح، تو شیریں ہے والہانہ نگاہوں کی طرح، اور تیرے نام میں رنگینیاں ہیں، نغمے ہیں ــــ پس اے نہرِ صفا مجھے اپنے ساتھ کارزارِ حیات کے ہنگاموں سے دور کہیں لے جا ــــ لیکن مجھے تجھ سے کیا نسبت؟

تو مجموعہ ہے موجوں کا جنمیں کوئی وجدان نہیں، جن کے پاس کوئی دھڑکنے والا دل نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو چیز ہی دوسری ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو معمہ ہے سمندروں کا اقفل کا میں معمہ ہوں حیاتِ لانہایت کا، میں جانتی ہوں کہ تجھے نہیں جان سکتی، اور انسان کے جہل اور اس کی بدنصیبی سے

واقف ہوں، لیکن تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے تجھ سے کیا واسطہ؟

بہے جاؤ اے موجو! بہے جاؤ اور مجھے چھوڑ دو، نباتات کو سیراب کئے جاؤ، پھولوں کے منہ میں موتی بھرے جاؤ، زمین کے مشتعل سینہ کو ٹھنڈا کئے جاؤ، طاری کی تنہائی میں اپنا نغمہ چھیڑے جاؤ، اپنی نہ ختم ہونے والی حکایت بیان کئے جاؤ، رنج کرو یا خوش ہو، رو دو یا ہنسو تمہیں سب زیب دیتا ہے، ہم تو حزن و ملال کے بندے ہیں اور اسی میں زندگی بسر کر دیتا ہے۔

بہے جاؤ، اور مجھے رونے کے لئے تنہا چھوڑ جاؤ میری فکر کی فضا سیاہ بادلوں سے تاریک ہو گئی ہے، اور میرا دل گھلنے کے لئے تنہا رہ گیا ہے۔

(نگار، جولائی ۱۹۲۵ء)

تاریخی علمی

عہدِ قدیم کا انسان کیا نہ جانتا تھا

آج دنیا کی علمی ترقیاں اور اصولِ اخلاق کی بلندیاں بہت حیرت انگیز نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے اور عہدِ حاضر کے اکثر اختراعات و ایجادات کا سُراغ تاریخ انسانی کے عہد ماضی تک پونچتا ہے۔ آپ کو شاید یہ سُنکر تعجب ہو گا۔ کہ بڑے بڑے پہیوں اور دباؤ ڈالنے والے انجنوں کا اسٹیم کے ذریعہ سے حرکت میں لانا، عہدِ قدیم کے انسان کو بھی معلوم تھا۔ اور طباعت و جلد سازی سے بھی وہ بخوبی واقف تھا

ولادتِ مسیح سے صدیوں پہلے روم کے برتن بنانے والے روز کے استعمالی ظروف پر ٹائپ کے ذریعہ سے اپنے نام نقش کر دیتے تھے اور نویں صدی

عیسوی میں اہل چین بلاک بنا کر کتابیں چھاپا کرتے تھے۔

قدیم اسکندریہ میں اشتہاروں کے لئے ستون نصب کئے گئے تھے۔ اور انہیں پر اعلانات وغیرہ گوند سے چسپاں کئے جاتے تھے۔ روم میں بڑے بڑے تختوں کا بھی رواج تھا۔ جن پر سیاہ و سرخ حروف میں اشتہارات تحریر کئے جاتے تھے۔

اُر کے کھنڈروں سے جو چیزیں دستیاب ہوئی ہیں۔ اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق کی سُمیری اما دی ڈامر اور اسبستوس[1] (Asbestos) کا استعمال جانتے تھے۔ اسی طرح کنکریٹ اور سیمنٹ کی عمارتیں بنانا بھی انہیں معلوم تھا۔

آگ بجھانے کا انجن مسیح سے ۲۰۰ سال قبل ہی یونان میں ایجاد ہو چکا تھا۔ اور روم میں تو باقاعدہ آگ بجھانے والا بریگیڈ بھی تھا۔ قدیم دُنیا میں خود حرکت کرنے والی (Automatic) مشینیں بھی پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ اسکندریہ کے معبد میں ایک ایسی مشین رکھی ہوئی تھی۔ جس کے اندر سکہ ڈالنے سے مقدس پانی کی ایک مقدار از خود مل جاتی تھی۔ فراعنہ سے پہلے بطلیموسی خاندان کے زمانہ میں ایک مشین کا بنا ہوا آدمی طیار کیا گیا تھا۔ روم میں نہ ٹوٹنے والا شیشہ بھی لوگوں نے بنا لیا تھا۔ جو ہتھوڑوں کی ضرب سے بھی نہ ٹوٹ سکتا تھا۔ لیکن وہ طریقہ آج تک

---

[1] ایک ریشہ دار معدنی چیز جو آگ کو قبول نہیں کرتی۔ جیسے ابرک

دریافت نہیں ہو سکا

سن کا کپڑا تیار کرنا مصرِ قدیم کے نہایت ابتدائی عہد کے لوگوں کو معلوم تھا جس کا ثبوت مومیائی شدہ لاشوں کے لباس سے ملتا ہے۔ توریت میں جن لباسوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ معبدوں کے پردے اور راہبوں کے لباس نہایت نفیس کپڑے کے ہوتے تھے۔ تین ہزار سال قبل کی مومیائی شدہ لاشوں کے کپڑوں میں اب بھی وہی نرمی پائی جاتی ہے۔ اور اُن کا رنگ تو ایسا نظر آتا ہے گویا ابھی نیا تھان سامنے کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔

افلاطون نے پانی سے چلنے والی گھڑی میں ایک ٹیڑھی نلی لگا کر اس کو الارم کلاک بنا لیا تھا جس وقت پانی اس نلی کی سطح تک پہنچتا تھا۔ تو وہ دوسرے ٹیوب سے آتی تیزی کے ساتھ گزرتا تھا کہ اس سے سیٹی کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ افلاطون نے یہ ایجاد اس لئے کی تھی۔ کہ اس کے شاگردوں کو صبح چار بجے اس کا علم ہو جائے اور وہ اُٹھ بیٹھیں۔ ایک پانی سے چلنے والی گھڑی کا ہشت پہل مینار جو آخری صدی قبل مسیح میں تیار کیا گیا تھا اب بھی پایۂ تخت یونان میں قائم ہے۔

خارجی گرمی پہنچا کر انڈوں سے بچہ نکالنے کا طریقہ قدیم مصریوں کو بھی معلوم تھا۔ چنانچہ ان مشینوں سے یک وقت سات سات ہزار انڈوں سے بچے نکالے جاتے تھے۔ ان مشینوں میں اُپلے یا بھوسے کی آگ سے گرمی پہنچائی جاتی تھی ڈرد ڈبس ( ) نے جو پہلی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا اس زمانہ

کے آلہائے مکبر الصوت (Sound Amplifiers) کا ذکر کیا ہے جن کو (Echea) (یعنی آواز باز گشت کو قوی کرنے والا) کہتے تھے۔ یہ کانسے کے ظروف تھے۔ جو تھیٹر کی دیواروں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں میں نصب کر دیئے جاتے تھے۔ آواز ان سے ٹکرا کر بہت بلند ہو جاتی تھی۔ اور بہت سریلی ہو کر سامعین کے کانوں تک پونچتی تھی۔ اسی طرح کے آواز بڑھانے والے آلات اسٹیج کی طرف بھی ستونوں سے نصب کر دیئے جاتے تھے۔ تاکہ آواز کا تموج بڑھ جائے۔ یہ مختلف سائز کے ہوتے تھے۔ اور اس طرح سُر میں ایک دُوسرے سے گھٹا بڑھا کر ملائے جاتے تھے۔ کہ ان سے بالکل انسانی آواز پیدا ہو۔

فولاد کے نہایت عمدہ پھل بنانا بھی اُنہیں معلوم تھا جسکا ثبوت تلواروں اور خنجروں کے پھل سے ملتا ہے۔ ان پر وہ کچھ نشانات بھی بنا دیتے تھے جو مٹتے نہ تھے۔ فولاد کو اس قدر سخت بنا دینے کا راز اب تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ قدیم اہل ہند کے لوگوں کو معلوم تھا۔ کہ زنگ نہ لانے والا لوہا کیونکر تیار کیا جاتا ہے چنانچہ دہلی میں ساڑھے تین سو سال قبل مسیح جو لوہے کی لاٹ نصب کی گئی تھی۔ وہ آجتک موجود ہے، اور اس پر زنگ کا نام نہیں۔ یہ فن بھی تک دریافت نہیں ہوا۔ ہاتھی دانت کو اُبال کر نرم کرنا اور اس سے مجسمے تیار کرنا یہ فن بھی عہد قدیم کے انسان کو معلوم تھا۔ جو اب تک ہمیں معلوم نہیں ہُوا۔

قدیم زمانے میں مکانوں کو گرم رکھنے کے لئے یہ ترکیب کی جاتی تھی۔ کہ گرم ہوا

فرش مکان کے نیچے اور دیواروں کے اندر دوڑائی جاتی تھی۔ چونکہ فرش اور دیواریں پتھر کی ہوتی تھیں۔ اس لئے سردی میں ان کی ٹھنڈک بہت بڑھ جاتی تھی۔ اور اس کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی جاتی تھی۔

معبدوں میں عجیب غریب میکانکی ترکیبوں سے کام لیا جاتا تھا۔ مثلاً قربان گاہ کی آگ سے یہ کام بھی لیا جاتا تھا۔ کہ ہوا کو پھیلا کر نلوں کے اندر سے لے جاتے تھے اور مصنوعی چڑیوں کے اندر سے یہ ہوا گزر کر مختلف آوازیں پیدا کرتی تھی۔ سنگین بتوں میں حرکت بھی میکانکی طریقوں سے پیدا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اسکندریہ کے معبد سراپس کے گنبد میں ایک مقناطیس اس طرح رکھدیا گیا تھا۔ کہ بت کے سر کو وہ کھینچتا تھا اور وہ بت اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ بہت سے معبدوں میں قربان گاہوں کے پتھر کے نیچے ہوا کا خزانہ بنا رہتا تھا جس کا تعلق زیر زمین نلوں کے ذریعہ سے ایک ایسے ظرف سے تھا۔ جو پانی سے لبریز رہتا تھا۔ جب گرمی سے اس کا پانی جوش کھاتا تھا۔ تو ایک دوسرے ظرف میں چلا جاتا تھا۔ جو اس کے پاس ہی معلق رہتا تھا۔ اور جب اس کا وزن بڑھ جاتا تھا۔ تو پوشیدہ پہیوں کے ذریعہ سے مندر کا دروازہ کھولدیا کرتا تھا اور کوئی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔

مصر کے پجاری علم مناظر و مرایا (optics) سے بخوبی واقف تھے جب کوئی شخص پوجا کرتا تھا۔ تو مندر کی پشت کی دیوار پر دفعتہً بت کا چہرہ نمودار ہو جاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی۔ کہ بت کے سامنے ایک مقعر (concave) آئینہ ہوتا

تھا جس کے ذریعہ سے سامنے کی دیوار پر بت کا عکس پڑتا تھا۔

اماپو کے بت کا جلوس جس وقت باہر نکالا جاتا تھا۔ تو تھوڑی دیر بعد اپنے تخت سے اٹھتا تھا۔ اور پھر بیٹھ جاتا تھا۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ بت کھوکھلی لکڑی کا ہوتا تھا۔ اور اس کے اندر گیس سے بھرا ہوا غبارہ رکھدیا جاتا تھا۔ اور اس کے اندر گیس سے بھرا ہوا غبارہ رکھدیا جاتا تھا۔ جو اسے ابھارتا رہتا تھا۔

صنعت و حرفت میں فیکٹری سسٹم اس وقت کی چیز بتائی جاتی ہے لیکن سنٹ آگسٹاین ہپو کا بشپ لکھتا ہے۔ کہ عہد قدیم میں بھی یہ طریقہ رائج تھا۔ اور ایک ہی چیز مختلف کاریگروں کے ہاتھ سے نکلکر تیار ہوئی تھی۔

پریسیڈنٹ روزولٹ صدر امریکہ کی یہ اقتصادی تدبیر کہ غلہ کے ذخیرے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔ پیغمبر یوسف کو بھی معلوم تھی۔ جنہوں نے مصر میں اسپر عمل کیا تھا۔ قدیم مصر میں غلہ کے مستقل ٹھیکے رکھے جاتے تھے اور آجکل کی طرح غلہ کا تبادلہ غلہ سے، تقاوی، فصلوں کا بیمہ اور بھاؤ کی نگرانی سب وہاں پائی جاتی تھی۔

اشیاء خوردنی کو محفوظ رکھنے کی ترکیب بھی انہیں معلوم تھی۔ چنانچہ اس وقت کی محفوظ کی ہوئی مچھلیاں اب تک اچھی حالت میں دریافت ہوتی ہیں۔ ان کو کپڑے میں لپیٹ کر صحرا کے آیوڈین (Iodine) ملے ہوئے پانی میں رکھ دیتے تھے۔ ہیروڈوٹس، جو چوتھی صدی قبل مسیح میں پایا جاتا تھا لکھتا ہے کہ امراء مصر اپنے

ہاتھ میں ہمٹلہ مسسہ رایک قسم کا پتھر) کے چھوٹے چھوٹے گیند رکھا کرتے تھے۔ تاکہ ہاتھ ٹھنڈے رہیں۔

برف بنانا یا برف سے چیزوں کو ٹھنڈا رکھنا بھی پچھلے لوگوں کو معلوم تھا۔ گرمیوں میں مٹی کے پیالے رکھ کر برف جمانا قدیم اہل ہند کو معلوم تھا۔ اور اسکندر اعظم کے زمانہ میں آسمانی برف کو دبا دبا کر گڑھوں میں بھر دیتے تھے۔ اور عرصہ تک اس سے کام لیتے تھے۔ نیرو پہلا بادشاہ تھا جس نے شراب کو برف میں لگا کر ٹھنڈا کرنا رائج کیا۔ سینیکا۔ اور پلوٹارک اب سے بہت پہلے نباتاتی اصول کے عادی تھے۔ اور رامیسس ثانی رفرعون مصر) نے ۱۲۵۰ء قبل مسیح میں ایک مانع شراب نوشی لیگ قائم کی تھی۔

علاج کی غرض سے بجلی کا استعمال بھی عہد قدیم میں رائج تھا چنانچہ دردسر میں ایک ایسی مچھلی کا استعمال ہوتا تھا جس کی برقی رد اعصاب میں سکون پیدا کر دیتی تھی۔ عمل جراحی کے لئے مردم گیاہ (Mandragora) بوٹی کھلا کر ایک انسان کو تین چار گھنٹے تک کے لئے بیہوش و بے حس بنا دیا جاتا تھا۔ مٹی کی تختیاں جو سواحل دجلہ سے دریافت ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۰۰ق م۔ اسیریا کے ایک بادشاہ کا علاج ملیٹھی سے کیا گیا تھا۔ بابل کے کھنڈروں سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کی جو گلی تختیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ ان میں نجار کی مکھی کا ذکر پایا جاتا ہے جس سے مراد مچھر ہے۔ گویا یہ حقیقت انسان قدیم کی دریافت کی

ہوئی ہے۔ کہ مچھر سے فصلی بخار پھیلتا ہے۔

قدیم مصر میں آبپاشی کی نہروں کو گھاس وغیرہ سے صاف رکھنے کے لئے تعلق (ایک چڑیا بگلا یا سارس کے قسم کی) پالے جاتے تھے۔ اور یونان میں طاعون کے چوہے فنا کرنے کی خدمت سانپوں کے سپرد تھی۔ بعض امراض کے ٹیکہ کا رواج قدیم ہندوستان اور چین میں پایا جاتا تھا۔

بدن کی مالش کے ذریعہ سے علاج ۴۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا۔ اور یونان کا ایک حکیم ۵ سال قبل مسیح میں علاوہ مالش کے سرد پانی، ہیئۃ کے پانی، اور ننگے پاؤں ریت پر چلانے سے بھی کیا کرتا تھا۔ اور شاہ آگسٹس کا علاج ایک طبیب موسیٰ نامی نے اسی طریقہ سے کیا تھا۔

زخمیوں کے لئے مصنوعی اعضا بھی تیار کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ۲۱۸ء قبل مسیح کیٹی لائن (Catiline) کے پردادا کے لئے جنگ قرطاجنہ میں ایک مصنوعی ہاتھ تیار کیا گیا تھا۔ انگلستان کے رائل کالج آف سرجنس میں ایک مصنوعی پاؤں ۳۰۰ سال قبل مسیح کا بنا ہوا رکھا ہے۔ قدیم ہند کے باشندے پلاسٹر سے مصنوعی ناک، ہونٹ اور کان بناتے تھے۔

روم و یونان کی قدیم تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غدودوں کا علاج کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اور مریضوں کو جوش دیا ہوا پانی پلانا بھی انہیں معلوم تھا۔ ہیرڈوٹس لکھتا ہے کہ (Cyrus) شاہ فارس اپنے ساتھ ہمیشہ جوش دیا ہوا پانی چاندی

کے برتنوں میں رکھا کرتا تھا۔ اسی طرح روما کے مشہور بادشاہ نیرو بھی ہمیشہ اُبلا ہوا پانی پیتا تھا۔

پمپائی میں بعض قدیم آلات ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ عورتوں کے بعض امراض کا علاج آپریشن سے کیا جاتا تھا۔ یہ آلات لوہے کے ہیں لیکن اس قدر تیز و صاف ہیں۔ کہ آج بھی ان سے آپریشن کیا جا سکتا ہے۔ جولیس قیصر اپنی ماں کے پیٹ سے آپریشن کے بعد ہی پیدا ہوا تھا۔ اور اسی لئے یہ آپریشن اب بھی اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اور اُسے (caesarian section) کہتے ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے بعض کاسہائے سر ایسے ملے ہیں۔ جن پر جراحی کے نمایاں نشانات موجود ہیں۔

سکندر اعظم کے زمانہ میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا۔ (اگرچہ ارسطو اسے پسند نہ کرتا تھا) مصر قدیم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دو ہزار سال قبل مسیح موتیا بند کے آپریشن کا وہاں رواج عام تھا۔ بعض مومیائی شدہ لاشیں ایسی بھی ملی ہیں۔ جن کے دانت مصنوعی ہیں اور بعض کی آنکھیں بھی۔

بال اُگانے کے لئے رمیاسی کا تیل دوسرے کسی تیل میں ملا کر اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ پہلی صدی عیسوی میں ڈاکٹر جانتے تھے۔ کہ انسانی جلد پر سورج کی مصنوعی روشنی، بلور کے شیشے کے ذریعہ سے حاصل کی جا سکتی ہے اور محدب شیشیوں کے ذریعہ سے بدن جل سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ڈاکٹروں کو فیس بھی دی جاتی تھی چنانچہ پلینی (Pliny) لکھتا ہے کہ شاہی طبیبوں کو علاوہ اُس فیس کے جو عام لوگوں سے ملتی تھی۔ سالانہ ۵۰، ۲۷ پونڈ ملا کرتے تھے۔ اور روم کے مشہور طبیب (Galen) کی فیس ۵ پونڈ تھی۔

روحوں کو بلانا اور میز کا گردش میں لانا قدیم مصر میں بھی رائج تھا۔ مصر ہی سے یہ رسم یونان میں پہنچی اور پھر تمام عیسوی دنیا میں عام ہو گئی۔

حضرت موسیٰ سے بہت پہلے قوت مقناطیس سے کام لیکر خود اپنے آپ کو بیہوش کر لیتے تھے۔ اور بعض بیماریوں کا علاج اسی عالم بیہوشی میں بتاتے تھے سینٹ آگسٹائن کا بیان ہے کہ ایک پادری اپنے آپ کو ایسا بیہوش و بے حس بنا لیتا تھا۔ کہ اس پر زخموں کا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ اور اسی عالم میں وہ غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔

"نگار" فروری ۱۹۴۰ء

تمدّنِ جدید کی دردناک داستان

تہذیب و شائستگی کے صحیح خط و خال

لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ اس بیسویں صدی میں بہت ترقی کر رہا ہے، پچھلے اکتشافات نے انسان کی آنکھیں کھول دی ہیں، علمی تصنیفات نے اس کے آگے ایک نئی دنیا پیدا کر دی ہے، فلکی مشاہدات نے آسمانی مخلوق کو اس کے روبرو کر دیا ہے، اور سب سے زیادہ کیمیاوی ایجادوں نے اتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں کہ جن باتوں پر کل بادشاہ بھی قادر نہ تھے۔ آج معمولی درجہ کے لوگوں کے اقتدار سے باہر نہیں ہم سمندر میں سفر کریں تو بادِ مخالف کی پروا نہیں، ہوائی سیر کریں تو بادوباراں کے طوفاں مزاحم نہیں، گھر بیٹھے سارے جہاں کی خبریں پڑھتے ہیں، تار اور ٹیلی فون سے ملک ملک کے حالات اپنے کانوں سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ بجلی کی قوت ہمارے

لئے روشنی کرتی، کھانا پکاتی، پانی ٹھنڈا کرتی ہے، جوتا صاف کرتی، گھر میں جھاڑو دیتی کپڑے پہناتی، پنکھا جھلتی، اور رات کو روشنی کرتی، یہ باتیں پہلے کہاں حاصل تھیں ان باتوں سے قطع نظر کر کے، یہ دیکھو کہ جو آرام، جو مسرت، جو لطف ہمیں آج حاصل ہے اس کا عشرِ عشیر بھی کبھی دنیا کو حاصل ہوا؟ بیمار ہوں تو دنیا کے اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کا مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی دوائیں تیار کی گئی ہیں۔ جن سے منٹوں میں فائدہ ہوتا ہے غدود بدلوا لینے سے عمر بڑھ جاتی ہے اور جوانی لوٹ آتی ہے، ہڈی ٹوٹ جائے تو جانوروں کے ہڈی کا جوڑ لگ جاتا ہے، آنکھیں خراب ہو جائیں تو مصنوعی آنکھ کام دینے لگتی ہے، موسمی تغیرات ہمارے ہاتھ میں آ رہے ہیں، بارش کا ہونا نہ ہونا ہمارے اختیار میں ہو جاتا ہے، فضا کے کہربائی ذرات ہمارا کام کرنے کیلئے تیار ہیں، آفتاب کی حرارت ہماری غلام بنتی جا رہی ہے، کیڑے مکوڑوں کے مہلک جرثیم ہماری فوج کا کام دینے کیلئے ترتیب دیے جا رہے ہیں، قحط کا نشان مٹایا جا رہا ہے مادی فارغ البالی کے نئے نئے طریقے نکالے جا رہے ہیں، حفاظت و دفاع ذات و عزت نفس کے بہترین سامان پیدا ہو رہے ہیں، اب جنگوں میں ہمارا ایک متنفس بھی ضائع نہیں ہو گا گھر بیٹھے لڑکیاں ہوا کریں گی، اور جس کے پاس علم و دماغ کی قوت زیادہ ہو گی، وہی چھپٹ جایا کرے گا۔ کیا یہ باتیں دنیا کو پہلے حاصل تھیں!۔

نوع انسان پہلے غلام تھی، کوئی شخص آزاد و خود مختار نہ تھا کسی پر انسانوں

کی حکومت تھی۔ کوئی اپنے خیالات خام میں گرفتار تھا، اور کسی پر اس کے مجنونانہ توہمات حکمران تھے، لیکن اب علم کی روشنی، فلسفہ کی بصیرت، اور عقلیت کے احیاء نے ان تمام باتوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اب نہ کسی پر کوئی ظلم کر سکتا ہے، نہ کوئی اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، اور نہ اپنی محنت پر مستفید ہونے پر محروم قرار پا سکتا ہے دنیا میں آزادی خیال پھیل رہی ہے، نظریں وسیع ہو رہی ہیں دماغ معاملہ فہم ہو رہے ہیں، اور وسیع الخیالی ان تمام بندشوں کو توڑ رہی ہے جن میں دنیا گرفتار تھی، اب ہر طرف آزادی و فارغ البالی ہے جمہوری و دستوری حکومتیں اپنی فیوض و برکات سے دنیا کو فائدہ پونچا رہی ہیں، جو قومیں حکومت کی صلاحیت نہ رکھتی تھی، وہ ان حکومتوں کی ماتحت حکومت کے لئے تیار ہو رہی ہیں، اور ہر شخص ایک ایسی زندگی بسر کرنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے، جو قدیم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، اور جو شاید مستقبل میں بھی حاصل نہ ہو۔

لیکن کیا یہ سچ ہے، کیا واقعی دنیا ترقی کر رہی ہے؟ اس کے لئے ہمیں تاریخ کے صفحات الٹنے ہوں گے، فلسفہ کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ اجتماعی قوانین دیکھنے ہوں گے، اور سطح سے گذر کر ہر چیز کے عمق تک پہنچنا ہوگا۔ تاکہ دنیا کی ترقی و تنزل کا حقیقی وزن معلوم ہو سکے۔ اور یہ بات واضح ہو کہ دنیا کس بات میں ترقی کر رہی ہے۔ انسانیت میں یا حیوانیت میں؟

دنیا کا سب سے پہلا اندھاپن تو یہ ہے کہ نہ باوجود دعوئ ترقی کے مقصد حیات

ہی کو نہیں دریافت کر سکی، اس نے اسی مادی زندگی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے، حالانکہ یہ کچھ بھی نہیں ہے جس طرح مکڑی عمر بھر جالا بنتی ہے۔ اور وہ ہوا کے ایک ہی جھونکے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، اسی طرح موت کی ہوا چلتے ہی اس مادی زندگی کا ڈھانچہ بھی ٹوٹ کر گر پڑتا ہے، اور روح کے سامنے ایک ایسی منزل آجاتی ہے جس کا اس نے کبھی خیال بھی نہیں کیا تھا، وہاں کے کاروبار انوکھے، رنگ ڈھنگ نرالے، اور قاعدے قانون دوسرے ہوتے ہیں، وہاں دولت نہیں بلکہ نیک نیتی اور خالق دو جہاں کے آگے حقیقی فنا دگی مطلوب ہوتی ہے۔ وہاں موٹروں میں بیٹھنے ہوائی جہازوں میں سیریں کرنے، اور نفیس نفیس پوشاکیں پہننے کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ شرافت و انسانیت کی بو باس اور خالق ارض و سما کی عبادت کے پاک جذبات کو دیکھا جاتا ہے، وہاں ہوشربا ایجادوں اور حرب و ضرب کے آتش افگن آلات کی جستجو نہیں ہوتی، بلکہ نیکی و پارسائی، عاجزی اور روحانی تڑپ کی جستجو ہوتی ہے، جو یہاں سرے سے مفقود ہے، اور جس کی طرف سے جدید تمدن کی اختراعات مدہشہ نے دنیا کو نہ صرف بے پروا کر دیا ہے، بلکہ تہذیب حاضرہ نے اس کی کوئی وقعت ہی نہیں رکھی، اس کی روشنی میں ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اور ہمارے دماغ ماؤف ہو کر یہ سوچنے سے عاجز ہو گئے ہیں، کہ جس مادی زندگی میں ہم منہمک ہو گئے ہیں۔ اور اپنی بہترین قوتیں صرف کر رہے ہیں، آخر اس زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور جب اس چند روزہ زندگی کو ختم کر کے ہم اس دنیا میں آجائیں گے۔ جو ابدی ہے، اور جہاں

ہم کو بھی ابد آلاباد تک رہنا ہے، وہاں کیلئے غور و فکر میں بسر و سامان کیا ہے؟
بقاء دوام کا مسئلہ بالکل یقینی ہے۔ انسان کا وجدان صحیح ہی نہیں بلکہ فلسفہ طبعی بھی اس بات کا علانیہ اعتراف کرتا ہے کہ مادہ فنا نہیں ہوتا، صرف ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جاتا ہے، پھر کیا جبکہ ہم اس حالت کے لئے اتنی کچھ کوششیں کرتے ہیں تو یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ اس حالت کی درستی کے مسائل پر بھی غور کریں، اور آئے دن کے مادی انہماک کے مشاغل سے اپنی روح کو آرام دے کر اس کو روشن بنائیں ہم کہاں سے آئے کہاں جائیں گے؟ اور یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ سوالات مابعد الطبعی فلسفہ کا نچوڑ ہیں، اور اس بات کے طالب ہیں۔ کہ ہم ان سوالات کی حقیقت کو سمجھیں۔ اور ان کے اندر جو روح کام کر رہی ہے، اس کو اپنی روح میں جذب کرنے کی کوشش کریں، اگر ہم نے ایسا کر لیا۔ تو یقیناً ایک بڑی کامیابی حاصل کر لیں گے، اور ہماری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چین و آرام سے رہے گی، ورنہ ہر وقت کا مادی انہماک، یہ رات دن کے غیر روحانی مشاغل یہ حرص و طمع، علم و ناراستی، حق فراموشی و کذب پرستی کی مصروفیتیں موت کے اس غار میں ڈھکیل آئیں گی۔ جہاں وہ اپنی ہی آگ میں جلے گی۔ اور اس کی روح کی ملامتوں کے ناگ ہمیشہ اس کو ڈستے رہیں گے۔

پھر کیا یہ کہنا بھی کسی طرح درست ہو سکتا ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے، اور اجتماع بشری نے وہ زندگی حاصل کر لی ہے، جو جنت میں بھی حاصل نہیں ہو گی۔

دنیا کی روح جب تک اس میں بالیدگی نہیں اس وقت تک وہ حقیقی ترقی کے مفہوم سے ناآشنا ہے، اور اس لحاظ سے وہ زمانہ بہت اچھا تھا جب موجودہ زمانہ کے سے مادی سازوسامان نہ تھے لیکن اجتماع بشری اپنی روح کی بالیدگی کی کوشش کرتا تھا کیونکہ وہ چند روزہ زندگی کے عیش وآرام سے گذر کر دائمی عیش وآرام کا خواہاں تھا۔

روحانی یکسوئی حاصل کرنے کی کوشش کو چھوڑیے، دنیا نے مادی زندگی میں بھی کوئی سکون حاصل نہیں کیا ہے، اور اس میں بھی وہ ایسے درجہ تک نہیں پہنچی ہے جس کے آگے کوئی درجہ ہی نہ ہو، انسانی زندگی میں سب سے پہلی چیز اجتماعی نظام کی تکمیل اور اس کے اصول وقواعد کا سعادت پر مبنی ہوتا ہے، لیکن دنیا نے اس میں ایک انچ ترقی نہیں کی ہے۔ اجتماعی نظام جن جڑوں پر قائم کیا گیا ہے، وہ اتنے بودے اور کھپس پھسپے ہیں کہ رات دن ان میں تغیر ہوتے رہتے ہیں اور اپنے ساتھ ساری دنیا کو بے چین مضطرب رکھتے ہیں، پہلے زمانہ میں اجتماع انسانی مذہب کی بنیادوں پر قائم تھا، جو سیاسی بنیادوں سے بہت مضبوط تھیں، اس لئے ان میں اتنے تغیرات نہیں ہوتے تھے لیکن ترقی یافتہ زمانہ نے مذہب کی بنیادوں کو ڈھاکر سیاسی بنیادوں پر جو اپنی زندگی کی مشین بٹھائی جارہی ہے، اس لئے ایک ایسی بے چینی پیدا کردی ہے، جس سے انسانی زندگی کو رات دن نئے نئے خطرات گھیرتے رہتے ہیں۔

یوں تو موجودہ زمانہ کا پورا انتظام تمدن اتنا ناقص ہے کہ اس سے ہرگز یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ دنیا اس پر عمل پیرا ہو کر ترقی کر سکے، کیونکہ وہ ہمیں ظلم و ستم خود غرضی بد دیانتی ملمع و لالچ اسراف و نمائش اور کذب و فریب کی طرف لیجا رہا ہے۔ اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے قول و فعل اور لین دین کے معاملات پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتا، اور جب باہم اعتماد نہ ہو ترقی کا ہونا معلوم، یورپ جو عہد حاضرہ کی تمدنی کا نمایاں ترین جولانگاہ ہے، اپنی اس نمائش اور جھوٹی زندگی سے گھبرا گیا ہے اجتماعی زندگی کے راز داری کوشش کر رہے ہیں کہ ایک نیا نظام تمدن پیش کریں سوسائٹیاں اپنی پچھلی حالات پر افسوس کر رہی ہیں۔ اور ہر زبان یہی کہتی ہے کہ جلدی سے جلدی اس ڈھانچ کو توڑ دینا چاہیئے۔ ورنہ یورپ بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا، اور ہمارا نام و نشان بھی اس دنیا میں باقی نہیں رہے گا، تم ایک یوروپین کو اس کے گھر میں دیکھو جہاں وہ اپنے بیوی بچوں سے ملتا ہے پھر اسے کاروباری زندگی میں مطالعہ کرو، اور پھر اس وقت کی حالت پر جب وہ موت کے بستر پر ایڑیاں رگڑتا ہے تم دیکھو گے۔ کہ گھر میں اس کیلئے کوئی راحت و مسرت نہیں، ناجائز آزادی نے یورپ کی عورت کو اتنا بگاڑ دیا ہے کہ اب ایک شوہر ایک منٹ کیلئے اپنے گھر میں آرام نہیں پا سکتا، بیماری میں بیوی میاں سے دور رہتی ہے مصیبت میں وہ اس کی شریک نہیں، مرضی کے خلاف بات ہو تو وہ لڑنے کے لئے تیار، خرچ کی کمی ہو جائے تو طلاق لینے پر آمادہ، اور اگر شوہر اس کو کسی دوست سے نہ ملنے دے

تو اس کی جان کی دشمن، پھر بیٹیوں کے ساتھ ایک باپ کا سلوک دیکھو، ماں کی جگہ پتھر کی
سل ہو گی، عیاشی میں منہمک ہونے کی وجہ سے چھوٹی سی عمر میں اس کو علیحدہ کر دیں گے
، نہ دکھ بیماری سے غرض نہ راحت و آرام سے یہی حال دوستوں عزیزوں کا ہے،
اور یہی حال کاروبار کا، غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک یورپین
مرد یا ایک یورپین عورت، یا بچہ پُرسکون زندگی بسر کرتا ہو، عدالتوں میں رات دن
طلاق کے مقدمات پیش ہوتے ہیں آئے دن خودکشیوں کی اطلاعیں شائع ہوتی ہیں
اور خودکشی کے روز روز نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، دس پندرہ لاکھ کی آبادی
کے شہر میں ہزار ڈیڑھ ہزار طلاقیں اور چار پانچ سو خودکُشیاں ہو جانی معمولی سی بات
ہے، غرض یورپ نے جس نظامِ اخلاق پر اپنے تمدّن کی بنیاد رکھی ہے وہ اتنا
ناقص اور اس درجہ مسموم ہے کہ اس سے ترقی اور فلاح کی اُمید رکھنی احمقانہ خیال ہے
اسی نظامِ تمدّن کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یورپ کی آبادی کا عنصرِ غالب نہایت
سخت بے چینی میں مبتلا ہے، اس کی زندگی سرتاپا مصیبتوں سے لبریز ہے،
نہ گھر میں اس کیلئے چین ہے نہ باہر آرام نہ عورت کیلئے مسرت ہے نہ مرد کے
لئے راحت، ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ناجائز اولاد محتاج خانوں اور یتیم خانوں
میں پلتی ہے، سینکڑوں امراض خبیثہ میں مبتلا ہو کر جانیں دیتے ہیں، اسی کے ساتھ
یہ میلان بھی خطرناک سُرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے کہ توالد و تناسل کا سلسلہ بند
ہو جائے، تقلیل نسل کی کوششیں باقاعدہ کی جا رہی ہیں، اسقاطِ حمل کی روز

نئی دوائیں ایجاد ہوتی ہیں، اور عدم استقرار حمل کی دوائیں نہ کھلے بندوں ہر فرد متمول کے ہاں بکتی ہیں، اس سے زیادہ یہ ہے کہ مائیں خود اپنے ہاتھ سے اپنی اولاد کو ہلاک کر دیتی ہیں، کوئی زہر دے کر سلا دیتی ہے، اور کوئی سمندر میں ڈال دیتی ہے، صرف ایک شہر میں جسکی آبادی اٹھارہ لاکھ ہے، ایک برس میں چار ہزار اسقاط کی وارداتیں پیش آئیں، دو ہزار نا بیچے یتیم خانوں میں داخل ہوئے دس ہزار شیشیاں عدم استقرار حمل کی فروخت ہوئیں، اور دو سو بچوں کی زندگیاں ان کے ماؤں کے ہاتھوں ضائع ہوئیں۔

اب ان باتوں کو وحشی قوموں کے میلان دختر کشی سے ملاؤ اور بتاؤ کہ دنیا نے کیا ترقی کی ہے تلوار کے پھل اور ہلاکت کے ریشمین ڈوری کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ دونوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

پھر جب یہ حالت ہے جب اجتماع بشری اپنی تمام قوتیں صرف کرنے کے بعد بھی مادی زندگی میں مطمئن و شاد کام نہیں ہے تو ایسا تمدن قطعی ترقی یافتہ تمدن نہیں ہے، اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے کیونکہ اگر زمانہ ترقی کرتا تو عہد وحشت کی یہ رنگین صورت بدل بدل کر نمودار نہ ہوتیں۔

خانگی زندگی سے ہٹ کر سوسائٹی نظام کو دیکھو، اس راہ میں ایک ایک جگہ ایسی نہیں ہے جہاں زہریلے کانٹے نہ بچھے ہوں گوشہ گوشہ میں قاتل ہوں گے، قدم قدم پر ڈاکو ہوں گے، اور پہلو ہی میں نقصان پہنچانے والے بھائی بند

ہوں گے یا دوست احباب، چوری، ڈاکہ، قتل، فریب، جیل کی وارداتیں روز ہوتی رہتی ہیں، اور اسکو فخریہ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ ایسی باتیں ہیں جو خواہ کتنی ہی عمدگی سے کی جائیں قابل نفرت ہے، اور وحشی قوموں نے بھی کبھی ان باتوں پر فخر نہیں کیا ہے، گو ان کی زندگی اسی پر بسر ہوتی ہے یورپ میں بھی ایسے جرائم پیشہ لوگوں کے مستقل گروہ ہیں مستقل آبادیاں ہیں مستقل زبان ہے اور ان جرائم کا ایک مستقل فن ہے

کیا جدید تمدن ان جرائم پر فخر کریگا؟

یورپ کو اپنی عقلیت پر بڑا ناز ہے، کہ اس نے مذہب اور مذہبی احساس کو مٹا دیا، اول تو یورپ کا مذہب ایک ایسا مذہب تھا جس میں سرے سے ترقی کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی، اور وہ فطرت انسانی کے اسقام کا علاج کرنے سے بالکل عاجز تھا، تاہم وہ سیاست اور اقتصادی اغراض سے زیادہ مضبوط زیادہ پائیدار، اور زیادہ مستقل چیز تھی، لیکن یورپ نے اس کی عمارت کو بھی گرا دیا۔ اور اس کی جگہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد قائم کی، لیکن ارباب فہم واقف ہیں کہ قومی اور وطنی احساس نے اجتماعی زندگی کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا نقصان نہ مذہب نے کبھی پہنچایا۔ اور نہ کسی وحشی قوم کی تاریخ میں اسکی نظیر مل سکتی ہے۔ اب یورپ میں ایک اور خیالی گھروندا تیار ہو رہا ہے، اس کا نام حق انتخاب

حکومت اور کفالت عامہ ہے۔ نفظی حیثیت سے یہ دونوں خیال بہت دل خوش کن ہیں، لیکن اندرونی حیثیت سے ان کی حقیقت اتنی مہلک اور خراش ہے کہ شاید زہر کی بھی اس کے سامنے کوئی اصلیت نہیں ہے، یہاں بات یہ واضح ہو جانی چاہیئے۔ کہ یورپ کا فلسفہ سیاست قول وفعل کے لحاظ سے ایک نہیں ہے اس کے لفظ عمل کے مفہوم سے جدا اور عمل کی صورتیں لفظوں سے علیحدہ ہیں، حق انتخاب حکومت کا یہ مفہوم ہے کہ دُنیا کی ہر قوم کو اختیار ہے۔ کہ اپنے اوپر اپنی مرضی کے مطابق جو طرز حکومت چاہیئے انتخاب کرے، لیکن عمل معنی یہ ہیں کہ زبردست کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ کمزور کے لئے جس طرز حکومت کو چاہیئے مقرر کر دے اور جس طرح چاہیئے اپنے اغراض کیلئے اس پر ظلم وستم کرے، اسی طرح کفالت عامہ کے نفظی معنی یہ ہیں کہ سوسائٹی کے ہر فرد کو اپنے فرض کا احساس کر کے انسانی فلاح وبہبود کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کا عملی مفہوم یہ ہے۔ کہ قومی جماعتوں کی باہمی مفاہمت، جہات اجتماعی کے لئے یہ دونوں چیزیں سخت مہلک ثابت ہوئی ہیں، حق انتخاب حکومت سوسائٹی کے امن وامان کا گلا گھونٹ رہا ہے، اور کفالت عامہ قوموں کو جنگ کی دعوت دے رہی ہے، موجودہ زمانہ میں دنیا کے گوشہ گوشہ پر جو مادی کشمکش جاری ہے، اور دن بدن نزاعیں بڑھتی جاتی ہیں، ایسی کسی زمانہ میں نہیں ہوئی تھیں دنیا نے بحیثیت مجموعی اس سے پہلے نہ کبھی ایسی جنگیں دیکھیں نہ پریشانیاں اٹھائیں اور نہ اس طرح اقتصادی قتل و

غارت کا بازار گرم ہوا۔

اس نظام اخلاق نے سب سے بڑی برائی جو پیدا کی ہے، وہ یہ ہے۔ کہ انسان انسانوں کا خون پیتے ہیں۔ ان میں نہ دوستی ہے نہ محبت، نہ ہمدردی ہے نہ غمگساری، ہر شخص اپنی اغراض کا بندہ ہے اپنی غرضوں کا غلام ہے۔ اور اپنے فائدہ کے لئے دین و مذہب، شرافت و انسانیت، اخوت و برادری کو پامال کرنے پر آمادہ، آجکل انسانی سوسائٹی کی جیسی بری حالت ہے، وحشی فطرت نے جو بھیانک چہرہ اپنا دکھایا ہے، اور جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کا گلہ گھونٹے ڈالتا ہے، ایک کے نقصان سے اپنے فائدہ کی کوشش میں سرگرم ہے جیسا بدعہد، بدطینت، سفاک ہو گیا ہے، ایسا کبھی نہیں تھا۔ یہ تو اب عام بات ہو گئی ہے۔ کہ ایک گھر میں آگ لگتی ہے۔ اور سو تماشائی جمع ہو جاتے ہیں لیکن جن ملکوں پر مغربی تہذیب کا اثر زیادہ ہے وہاں دوست احباب آگ بجھانے کے نام سے گھر گھر کی اچھی اچھی چیزیں لوٹنے کو آجاتے ہیں، اور جب انسانی فطرت کی دہشت و حیوانیت اور اجتماع بشری کی پستی اور زبونی کا یہ عالم ہو تو یہ کہ اجتماع بشری ترقی کر رہا ہے، کس قدر بے بصری ہے، اگر ترقی اسی بداخلاقی کا نام ہے تو بتاؤ تنزل کو کہاں ڈھونڈھیں، اور زوال اخلاق کا دنیا کے کس گوشہ میں پتہ لگائیں، جب تک فطرت اجتماعی کے نظام عمل کی یہ ابتری قائم ہے، جب تک انسان اتنا خود غرض ہے۔ اور جب تک ہر شخص دنیا بھر کے فائدوں کو

اپنے ہی لئے حاصل کرنا چاہتا ہے، اس وقت تک نہ دنیا ترقی کر سکتی ہے۔ نہ امن کی فضا پیدا ہو سکتی ہے، نہ باہمی اعتبار و اعتماد پایا جا سکتا ہے، اور نہ دنیا کے اخلاق میں نیکی کا میلان زندہ ہو سکتا ہے۔ خود غرضی حیوانی فطرت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا خاصہ ہے، جب تک یہ ہے اس وقت تک دنیا ہمیشہ معرکہ کارزار بنی رہے گی۔ اور جو قوتیں ترقی میں صرف ہونی چاہئیں وہ باہمی کشمکش اور کشت و خون میں صرف ہوتی رہیں گی۔

بس ان حالات کے موجود ہوتے ہوئے یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا نے جو کچھ حاصل کیا تھا اس کے پاس اخلاق عالیہ کا جو کچھ اندوختہ تھا۔ اسے بھی کھو چکی ہے، اور وحشت و حیوانیت میں اتنی ڈوب گئی ہے کہ اب اس کے آگے کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے۔ کہ موجودہ زمانہ میں انسان کیمیاوی اکتشافات کی ان بلندیوں پر پہنچ گیا ہے، جن بلندیوں کا اس سے پہلے خیال ہی نہیں تھا، لیکن جسطرح اور دعوی بے بنیاد ہیں، اسی طرح یہ دعوی بھی بے بنیاد ہے، موجودہ کیمیاوی عہد کے پیداوار میں وہ کون سی چیز ہے جس کا انکشاف اسی دور میں ہوا ہے؟ ریل موٹر، ہوائی جہاز، تار، ٹیلیفون، لاسلکی، ان میں سے کون سی چیزیں ہیں جو بالکل نئی ہیں اور جیسے اس سے پہلے کے دماغ نہیں سوچ چکے ہیں؟ کلدان، مصر، اشور نینوا، چین، ایران، ہندوستان، یمن، یونان، اور پھر عہد اسلامی کی تاریخیں اٹھاکر

دیکھو، ان میں سے ہر ہر خبر کا نشان وہاں پاؤ گے، ہر خیال کی بنیاد وہاں ملے گی۔
دعویٰ کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں انسان کی دسترس ان کمالات تک ہو گئی ہے۔ جو انسان کی قدرت سے باہر تھے۔ لیکن تاریخ کی آواز اس کا بھی بطلان کرتی ہے، موت و زیست کا مسئلہ انسانی اختیار سے اب بھی اسی طرح باہر ہے، جس طرح ابتدائے آفرینش میں تھا۔ ناگہانی حادثات اب بھی اسی طرح پیش آتے رہتے ہیں۔ جس طرح اب سے پہلے آتے تھے، اور انسان اب بھی اسی طرح بیمار پڑتا ہے۔ جس طرح عہد قدیم میں بیمار پڑتا تھا۔ علاج پہلے بھی ہوتا تھا اب بھی ہوتا ہے، دوائیں پہلے بھی استعمال ہوتی تھیں، اب بھی ہوتی ہیں، عمل جراحی پہلے بھی ہوتا تھا۔ اور اسی طرح اب بھی ہوتا ہے کیلی فورنیا کے علاقہ میں ایک گڑھے سے حال میں ایک انسانی ڈھانچہ نکلا ہے، جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ کم از کم بیس ہزار برس قبل کا ہے، ڈاکٹروں کا بیان ہے۔ کہ اس کا سر ٹوٹ گیا تھا۔ آپریشن کے نشانات اس کے جمجمہ پر موجود ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اب آپریشن کیا جاتا ہے، اسی طرح وہ وحشی قومیں بھی آپریشن کرتی تھیں، یہی حال دواؤں کا ہے، کوئی نئی دوا اس عہد میں پیدا نہیں ہوئی ہے، تمام دوائیں پہلے کی دریافت کی ہوئی ہیں، اب صرف ان کی صورتیں بدل گئی ہیں ورنہ ان کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے بلکہ اگر زیادہ حق بیانی سے کام لیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا نے اس حیثیت سے بھی تنزل کیا ہے۔ پرانے لوگوں کو جو دوائیں معلوم تھیں، اور اب بھی

وحشی قوموں کو جو دوائیں معلوم ہیں، جن جڑی بوٹیوں پر انہیں اطلاع ہے۔ ترقی یافتہ فضا میں سانس لینے والے، بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کو بھی ان کی خبر تک نہیں ہے، ان کی دواؤں کا یہ حال ہے کہ ازدیاد مرض کا باعث ہوتی ہیں، ان کے استعمال سے نظام عصبی کمزور ہو جاتا ہے، ہمیشہ نئے نئے روگ لگتے رہتے ہیں۔ اور قلب و روح کو ایسا گھن لگ جاتا ہے کہ مرتے مرتے پیچھا نہیں چھوڑتا۔ حالانکہ اس عہد ترقی سے پہلے نہ بیماریوں کا اتنا زور تھا نہ دوائیں اتنی ناقص تھیں، اور نہ طبیب اتنے اندھے۔ آج ہزار ڈاکٹروں میں ایک ڈاکٹر بھی ایسا نہیں ہے، جو مرض کو پہچان لے حالانکہ وہ زمانہ جس کو عہد وحشت و جہالت کہا جاتا ہے، سو میں دس طبیب ایسے رکھتا تھا، جو مرض کی تخلیق سے پہلے چہرہ کے رنگ سے جان لیتے تھے، کہ فلاں مرض ہونے والا ہے، اور اسی وقت سے اس کی روک تھام شروع کر دیتے تھے۔

پھر بتاؤ کہ جب دنیا نے اس میں بھی ترقی نہیں کی تو کس بات میں ترقی کی ہے؟ پوڈر اور فرش مخمل کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ پہلے کیا نہ تھا جو اب ہو گیا ہے؟

مدعیان ترقی کا دعویٰ ہے کہ اجتماع انسانی نے جو سیاسی آزادی اس زمانہ میں حاصل کی ہے، اور جو قانونی عضو بندی اب ہو گئی ہے، اس سے پہلے اس کا وجود بھی نہیں تھا۔ لیکن اس حالت میں جبکہ مغربی چاقو شرقی رگ جاں کاٹ رہا ہے جبکہ مغربی قومیں دنیا کو غلام بنانے کے درپے ہیں، جبکہ امریکہ میں ریڈ انڈین نسل کا

علانیہ قتل عام کیا جاتا ہے جبکہ چینی اور ہندوستانی حقوق شہریت سے محروم کئے جاتے ہیں، اور جبکہ قوی کا کمزور کو ہلاک کر دینا فطری اقتضا ہے، اور نسل و رنگ کے ساتھ تہذیب و آئین کے ساتھ بدل جانا لازمۂ انسانیت ہے، تو اس دعویٰ کی بنیادیں کھوکھلی نظر آتی ہیں۔ اس سیاسی عضوبندی، اور جمہوریت و آزادی کے زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرتی ہے جس طرح آزادی انصاف کے علمبردار دوسری قوموں کا خون چوستے ہیں۔ اور جس طرح گورا کالے کو مار ڈالتا ہے، اس طرح گذشتہ زمانہ کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

بلاشبہ قانون کا اصول بہت دلآویز ہوتا ہے، جمہوریت کا نظام نہایت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن جب قول کو فعل سے اور الفاظ کو عمل سے تطبیق دی جاتی ہے، تو باوصف اس کے کہ قانون کو اتنا لچک دار بنایا ہے کہ وہ آسانی سے مظالم کے ساتھ ڈھل جاتا ہے، لیکن پھر بھی عمل میں جو نتائج رونما ہوتا ہے وہ اتنا عظیم الشان ہوتا ہے کہ الفاظ سننے والے عملی وحشت و درندگی کا تصور نہیں کر سکتے، اس عہد آئین و حریت کا جب سے آغاز ہوا ہے اس وقت سے اب تک کی تاریخ اپنے اندر اتنے مظالم رکھتی ہے، کہ وحشی زمانہ کی پوری بارہ صدیاں بھی اتنے مظالم پیش نہیں کر سکتیں، وہ سیاسی بیدردی وہ تجارتی سفاکی، وہ اقتدار پسندانہ وحشت جس نے ساری دنیا کو ہلاک و برباد کر دیا ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں تھی، پہلے دشمن دشمن بن کر سامنے آتا تھا۔ پہلے ظالم ظلم کے نام سے طاقت دکھاتا تھا۔ پہلے لڑنے والا

ہتھیار چھین کر نہیں لڑتا تھا، لیکن اب دست بن کر گلا دباتا ہے۔ اب عدالت و انصاف کے نام سے ظلم کئے جاتے ہیں اب ہتھیار چھین کر اور دھوکہ دے کر حملہ کئے جاتے ہیں، اور محض اس لئے کہ دوسری قومیں ابھرنے نہ پائیں اور مخالف قومیں گی عریف نہ بن سکیں، پھر یہ کون کرتا ہے؟ وہ جو سب سے زیادہ آزادی کے دعویدار ہیں، وہ جو بنی نوع انسان کی ہمدردی کے مدعی ہیں، وہ جو دنیا بھر میں اصلاح و ترقی کے ناشر ہیں، وہ جو امن و انتظام، ادارہ اور قانون کے معیر ہیں۔

پھر بتاؤ کیا یہی اخلاق و انسانیت کی ترقی ہے جس نے یہ صورتیں اختیار کی ہیں، کیا یہی وہ نقطہ عروج ہے جس پر پہونچنا مغرب اور اس کے ہوا خواہوں کے لئے باعث ابتہاج و مسرت ہے۔ یہ باتیں اگر وحشی قومیں کریں تو قابل اعتراض نہیں ہے لیکن انصاف و انسانیت کے فرشتوں کا ایسا کرنا حد درجہ بتر اور لعنت کی کوشش ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان عیاروں نے ایسی سوسائٹیاں بنائی ہیں جن کا مقصد جانوروں پر ظلم کا انسداد ہے لیکن کیا وہ انسانوں پر بھی ظلم سے باز آگئے ہیں؛ وہ ایک فیاضانہ سلوک کر کے اپنے دوسرے مظالم کو چھپانا چاہتے ہیں، وہ حیوانوں پر رحم کر کے انسانوں پر ظلم کا ہاتھ دراز سے دراز تر کرنا چاہتے ہیں وہ یہ تو کہتے ہیں کہ گھوڑے کو ایذا نہ دیں لیکن خود انسان کو ایذا دینے میں دریغ نہیں کرتے، جن لوگوں کی اخلاقی عیاری کا یہ حال ہو، جو لوگ اس درجہ بے پناہ سفاک ہوں، ان کی حکومت، واقتدار میں عدل و انصاف ایک لمحہ کے لئے زندہ نہیں رہ سکتے پھر ہم جانتے ہیں کہ جانوروں

پر یہ رحم کیوں ہے؟ اور اس کی نوعیت کیا ہے، وہ جانور بے تکلیف ذبح کر ڈالے جاتے ہیں، جو خدا کا کام دیتے ہیں، اور ان پر رحم کی تلقین کی جاتی ہے۔ جو خدمت کرتے ہیں، یعنی دوسرے لفظوں میں موجودہ عہد حق و انصاف کے اعمال اجتماعی جن بنیادوں پر قائم ہیں وہ خود غرض، سفاکی، بے ایمانی اور خود بینی کی چٹانیں ہیں۔

پس جب بنیاد ہی اتنی خراب ہو تو عمارت کیسے اچھی ہو سکتی ہے، ایسی ناقص اور ناکارہ اجتماعی زندگی کی ترقی پر استدلال کرنا اور یہ کہنا کہ موجودہ زمانہ میں دنیا نے عظیم الشان ترقی کی ہے۔ محض کذب و افترا ہے، کیونکہ اس حیثیت سے دنیا اور گر گئی ہے۔

ان پیغمبران ترقی کو یہ بھی دعویٰ ہے۔ کہ اس زمانہ میں دنیا نے جو علمی ترقی حاصل کی ہے۔ جو نئی نئی باتیں دریافت ہوئی ہیں۔ قوموں حکومتوں نے علوم و فنون کی جو سرپرستی کی ہے، اور جمہوریتوں کے طفیل میں حیات اجتماعی جس سعادت کاملہ سے بہرہ اندوز ہو گئی ہے، اس سے پہلے کے لوگ نہ ایسی زندگی کا تصور کر سکتے تھے، نہ ان کے خواب میں کبھی ایسی فضا کا خیال آیا تھا، لیکن جس طرح اور دعوے بے بنیاد ہیں، اسی طرح یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے، اس عہد کی ساری ترقی کا دارومدار پچھلوں کے اصولوں ان کے دریافتوں اور موشگافیوں پر ہے، علمی حیثیت سے موجودہ زمانہ نے صرف اتنی ترقی کی ہے۔ کہ پہلی باتوں کو نئے انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں پیش کی ہے کشش ثقل مسئلہ ارتقا، انتخاب طبعی، جو اس عہد کی پیداوار ہیں

سب سے بلند درجہ پر رکھے جاتے ہیں، یہ سب نظریئے آج سے ایک ہزار پہلے قائم کئے جا چکے تھے، اور ان پر بہت کافی لٹریچر بھی پیدا ہو گیا تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ امتیاز کے قابل کون ہے؟ وہ جو واضع ہو یا وہ جو نقال ہو؛ اگر اس کا مستحق وہ شخص ہے جو ادھر اُدھر سے چند خیال جمع کر کے ایک چیز پبلک میں پیش کر دی اگر تعریف کے لائق وہ ہے جو قدما کی باتوں کو زبان کا ملمع چڑھا کر رکھ دے تو یقیناً اس کا فخر موجودہ زمانہ کو حاصل ہو سکتا ہے، اور ہم اس عہد کو بہترین ترقی کا عہد کہہ سکتے ہیں، لیکن اگر حقیقی تعریف اس شخص کی ہوتی ہے جس نے بات پیدا کی تو پھر ماننا چاہیئے کہ اس عہد نے سوائے ملمع سازی کے کچھ نہیں کیا ہے اور عہد حاضر کے دماغ میں ایجاد کی قابلیت نہیں ہے۔

رہی حکومت عامہ کی علمی سرپرستی، سو وہ بھی صرف فنون مہلکہ تک محدود ہے۔ علوم کی جو سرپرستی آج سے ایک ہزار سال پہلے کی جاتی تھی وہ تو تقریباً معدوم ہے کیونکہ اب علوم کی سرپرستی اس لئے نہیں کی جاتی کہ اس سے کوئی دماغی تربیت حاصل کی جائے، یا اس سے مقصود عادات و اطوار و خیالات کی اصلاح ہو، بلکہ علوم صرف نفسانی اغراض کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں، اور ایک قوم دوسری قوم سے مسابقت کی جو کوشش کرتی ہے۔ اس کے اندر بھی یہ جذبہ کام کرتا ہے، کہ وہ دوسری قوم کو شکست دیدے، اس کے لئے یونیورسٹیاں قائم ہوتی ہیں، اسی کے لئے ریل، ڈاک، تار، جہاز، وغیرہ میں نئی نئی ایجادیں کی جاتی ہیں، اسلحہ تیار کئے

جاتے ہیں، ڈائنامائٹ، گولا، بارود، زہریلی گیس، توپیں، اور بندوقیں بنائی جاتی ہیں اور حکومتیں لاکھوں روپے کے انعامات دیتی ہیں، اس سے غرض صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان آلات کے زور سے اپنی تجارت کیلئے ایک نیا بازار پیدا کیا جائے اور دوسری قوم ان چیزوں کو دیکھ کر اتنی ڈر جائے، کہ کوئی مزاحمت نہ کرے اور ان کے طمع کے لئے راستہ صاف کردے۔

اسی کے ساتھ ایک اور عالم فریب تحریک، جسے اس ترقی یافتہ دور کا سب سے بڑا انسانی خیال سمجھا جاتا ہے، افراد اقتدار سے کفالت عامہ کے لئے اسلحہ چھین لینا ہے، لیکن اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ تجارتی منافع کے لئے میدان صاف ہو جائے، ورنہ اگر صحیح معنوں میں اسلحہ کے وجود سے دنیا کو پاک کرنا تھا تو یورپ کی حکومتوں کو اس پر عمل کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اس وقت پُر امن فضا پیدا کرنے میں جو دنیا کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز ہے وہی سب سے زیادہ حارج ہیں۔

عام خیال ہے کہ اجتماعی ترقی کے لئے جمہوری حکومت بہترین معاون ہے اور وہ اپنی شکل میں صرف اسی عہد میں تکمیل کو پہنچی ہے، لیکن اول تو موجودہ عہد، حریت جمہوریت کے نام ہی سے ناآشنا ہے، کیونکہ وہ جمہوریت کے نام سے جو چیز پیش کرتا ہے وہ جمہوریت نہیں بلکہ مستبد قومی حکومت ہے۔ جو اپنے سوا کسی کو انسان سمجھتی ہے، نہ اس کے نزدیک دنیا میں کسی اور کو زندگی کا حق ہے

دوسرے اجتماعی فرائض کے نقطۂ نظر سے جمہوری حکومت اور شخصی سلطنت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، ایک جگہ ذمہ دار صرف ایک ذات ہوتی ہے، دوسری جگہ ذمہ داریاں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ اور مختلف لوگ مقتدر ہوتے ہیں، اور اس لئے حکومت کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں آتا، جو قوت شخصی حکومت میں کام کرتی ہے۔ وہی جمہوری حکومت میں بھی کام کرتی ہے جس طرح وہ خونریزی کی اجازت دیتی ہے، اسی طرح یہ اپنے منافع کے لئے خون بہانے میں تامل نہیں کرتی، وہاں صرف ایک شخص کی مرضی سے خون بہتا ہے، یہاں قوم کے چند اجزا کی مرضی شامل ہوتی ہے، اور دنیا اس صورت میں بھی وہ امن و اطمینان حاصل نہیں کر سکتی جس سے شخصی حکومت محروم تھی، اور اس وقت دنیا کی مصیبتوں کی جواب دہ یہی جمہوری اور دستوری حکومتیں ہیں، جنہوں نے اپنے اقتدار اور منافع کا بار زبردستی دنیا کے شانوں پر رکھدیا ہے۔

بہر حال دنیا نے کسی حیثیت سے کوئی ایسی ترقی نہیں کی جس پر موجودہ عہد فخر کر سکے، اور جسے ترقی کے آخری منظر سے تعبیر کیا جائے۔

(نگار، جولائی ۱۹۲۴ء)

علم الاصنام پر ایک اجمالی تبصرہ

اب سے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال قبل کی بات ہے، اُس وقت کی جب زمین کا شباب شروع ہوا ہے، اور انسان اپنے عہد زندگی کو ختم کرکے نادیوں میں، پہاڑوں پر، کھلے میدانوں میں، دریاؤں کے کنارے نیم وحشیانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ زمین کھودنے، صحرائی جانوروں کا مقابلہ کرنے اور درختوں کی شاخیں کاٹ کاٹ کر جھونپڑا تیار کرنے کے لئے پتھر کے چند اوزار و اسلحہ بھی اس کے پاس موجود ہیں۔ اور قبائلی زندگی بسر کرنے کے میلان نے اس میں ایک نوع کا اجتماعی احساس بھی پیدا کر دیا ہے۔

جذبات تو اُس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کے اظہار کے لئے وہ

وہ الفاظ اپنے پاس نہیں رکھتا فطرت کے گوناگوں مناظر اُس کی نگاہ سے گزرتے ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت سمجھنے سے وہ معذور ہے۔ الغرض یوں تو وہ ایک دنیائے تاثرات ہے۔ لیکن چہرہ کے تغیر اعصاب کی جنبش، جسم کی لرزش اور بے اختیارانہ چیخ یا آواز کے علاوہ کوئی اور ذریعہ اظہارِ جذبات کا اس کے پاس نہیں ہے۔

دن پر دن اسال پر سال اسی حالت میں گزر جاتے ہیں، یہاں تک کہ صدیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تمدن کی دوسری منزل میں قدم رکھتا ہے یعنی اب وہ دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنی زبان سے بھی اپنے احساس کو ظاہر کر سکتا ہے۔ جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے اسے بیان کرنے کی قوت بھی اس میں پیدا ہو چکی ہے گویا یوں سمجھیے کہ قبائلی زندگی ایک حد تک مکمل ہو کر اخلاقی حدود کے اندر آگئی ہے۔ اور سود و زیاں کا بھی ایک دھندلا سا خاکہ اس نے اپنے ذہن میں مرتب کر لیا ہے۔

کائنات کے تغیرات، قدرت کے نت نئے مناظر، اور حوادث طبعی سے تو آنکھ کھولتے ہی اسے واسطہ پڑا تھا لیکن اب وہ صرف سہم کر نہ رہ جاتا تھا بلکہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ اپنی سہمی ہوئی حالت کو ظاہر بھی کرتا تھا، اور باوجود عقل کی انتہائی نارسائی کے وہ ان کے سمجھنے کی بھی کوشش کرتا تھا ــــــ پہلے اگر وہ طوفان باد و باراں دیکھ کر سوائے کپکپا اٹھنے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ تو اب اس کا سبب بھی ڈھونڈھنا چاہتا تھا۔ وہ اب چاند سورج کے طلوع و غروب کو دیکھتا تھا۔ اور ان پر غور کرتا تھا۔ بادلوں کو اِدھر سے اُدھر گزرتے دیکھتا تھا۔ اور اپنے تخیل میں خاص جنبش

وہیجان محسوس کرتا تھا۔ وہ گرج سنتا تھا اور اس کی قوتِ نطق بیتاب ہو جاتی تھی۔ گویا یوں سمجھیئے۔ کہ سوچنے کی حدود سے آگے تو وہ اب بھی نہ بڑھا تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے اس کا سوچنا بالکل خاموش وساکت ہوتا تھا۔ اور اب وہ آواز کے ساتھ سوچتا تھا۔

پھر چونکہ اس کا یہ اظہار نتیجہ تھا محض اس کے تاثرات کا۔ کہ علمِ حقیقت کا اس لئے ذہن سب سے پہلے اپنی ہی ہستی کی طرف منتقل ہوا۔ اور اس نے سمجھا کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے سب اسی کی طرح ذی حیات ہے اور فرق اگر ہے تو صرف صورت وشکل کا۔

اس کے بعد اس نے مناظرِ قدرت ومشاہدات کو دائرہ گفتگو میں لانے کیلئے اپنے ماحول پر نظر ڈالی اور یہیں سے تشبیہات واستعارات لیکر نہایت سادگی لیکن حد درجہ پرکاری کے ساتھ فطرت کے مظاہر وآثار کو اپنی تخلیق ادب سے متعلق کر لیا۔

یہ تھا وہ زمانہ جب دنیا میں اصنامی روایات کی ابتدائی ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ مختلف اقوام نے اپنے اپنے ماحول کے لحاظ سے اس میں تنوع پیدا کیا۔ داستانیں وضع کیں۔ اور زیب داستان کے لئے وہ سب کچھ کیا جو ایک شاعر وادیب کی خلاقانہ ذہنیت کر سکتی تھی۔

اب کہ علوم وفنون کی ترقی نے قدرت کے چہرے سے نقاب اُلٹ کر اس کے ایک ایک خط وخال کو نمایاں کر دیا ہے، اور خیال کی لذتیں ہم سے چھین کر حقیقت کی تلخیوں سے دوچار کر رکھا ہے۔ اس نوع کی روایات میں اضافہ تو ممکن نہیں۔ لیکن ان کی چھان بین ضرور عہد حاضر کے انسان کی دلچسپی کا باعث ہے۔ اور اسی تحقیق کا نام علم الاصنام یا

میتھالوجی ہے جسے مصر والے خرافات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس علم کے حدود سے یہ بحث بالکل خارج ہے کہ لوگ دیوتاؤں یا اصنام کو کیوں پوجتے ہیں بلکہ صرف یہ کہ روایات اصنامی جنہیں انگریزی میں "mythus" کہتے ہیں۔ کیوں اور کس طرح پیدا ہوئیں ــــ سب سے پہلے جس قوم نے اس پر علمی نقطۂ نظر سے غور کیا وہ اہل یونان تھے۔ انہوں نے اس تحقیق کے سلسلہ میں ابتداہی سے یہ خیال قائم کرلیا۔ کہ ان روایات کی تہہ میں ضرور کوئی نہ کوئی حقیقت پنہاں ہے اور حکمار یونان نے اپنے اوپر قیاس کرکے یہ باور کرلیا۔ کہ ان روایات کے وضع کرنے والے بھی ضرور فیلسوف وحکیم تھے ــــ اور یہ روایات محض کنایہ وتمثیل تھیں۔ جن کے ذریعہ سے کوئی خاص فلسفیانہ تعلیم نشر کی گئی تھی۔

پھر اس خیال کے تحت جو جو فلسفے ان روایات سے پیدا کئے گئے وہ زیادہ تر انہیں حکمار کے خیالات کا عکس ہے۔ جو یہ تاویلیں کرتے تھے۔ چنانچہ انکساغورس حکیم نے ان روایات میں بڑی زبردست نفسیاتی تعلیم پوشیدہ پائی امپیڈوکلس نے عناصر اربعہ کے رموزان میں پنہاں دیکھے اور اسی طرح دوسرے حکمار نے اپنے اپنے نظریوں کے مطابق جدا جدا فلسفے ان میں پوشیدہ پائے۔

تاویل کا یہ فلسفیانہ طریقہ عرصہ تک یونان ودیگر ملحقہ ممالک میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۳۰۰ سال قبل مسیح ایک شخص یوہمرس (euhemerus) نامی پیدا ہوا اس کو بحر ہند کی سیاحت کے دوران میں بعض ایسے قدیم کتبے دستیاب ہو گئے۔

جن سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید یونان کے بہت سے دیوتا حقیقت میں اس سرزمین کے بہادر فرمانروا یا سردار تھے۔ جو بعد کو دیوتا سمجھے جانے لگے۔ اور اس لئے اُس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ روایات اصنامی یکسر تاریخ قدیم سے متعلق ہو سکتی ہیں اگر گو ان کا غیر فطری عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ اس تاویل کا نام ہی بعد کو یوہمریت Euhemerism قرار پایا۔ اور اہل یونان نے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے کر اس حد تک ثابت کر دکھایا کہ ان کے روایاتِ اصنامی میں جس دیوتا کو جیوپٹر یا ذیوس کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ جزیرہ کریٹ کا بادشاہ تھا۔ اور ہرقلس یونان کا نہایت مشہور پہلوان اسی طرح اٹلس دیوتا کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ وہ اپنے وقت کا بہت بڑا نجومی تھا۔ اور جنگ ٹرائے (Trojan War) کو اہل یونان اور اہل اسپارٹا کی جنگ قرار دیا۔ ہربرٹ اسپنسر بھی اسی اسکول کا متبع تھا۔ اور مسٹر گلیڈسٹن تو یہاں تک اس نظریہ سے مرعوب ہوئے۔ کہ زیوس۔ ہیڈس اور پوسیڈن (تین یونانی دیوتاؤں) میں انہیں تثلیث عیسویت (یعنی مسیح مریم اور روح القدس) کی جھلک نظر آنے لگی۔ اور اس سے قبل بعض حکماء انہیں تین دیوتاؤں کو سام، حام اور یافث قرار دے چکے تھے، ہندوستان میں بھی ایتی ہاسک (Aitihasika) اسکول نے بھی کوشش کی کہ ویدوں کی روایات کو تاریخی حقیقت ثابت کیا جائے۔ مگر اس میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

الغرض روایات اصنامی کے متعلق یہی دو نظریئے تھے۔ جو نہ صرف عہدِ قدیم

بلکہ عہد عیسوی میں بھی رائج رہے، البتہ روما کے طبقہ رواقیون (Stoics) نے امپیڈوکلس کے نظریہ کو صحیح سمجھ کر یہی تاویل پسند کی کہ روایات اصنامی میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ حقیقت ہے لیکن اندازِ بیان کنائی و تمثیلی ہے تاہم وہ تمام روایات کی تاویل میں کامیاب نہ ہو سکے خصوصیت کے ساتھ ویدوں کی روایات کہ ان میں دیوتاؤں کے نام کھلم کھلا قوائے فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ ان دونوں اسکولوں کی نزاع برابر قائم رہی اور صدیوں تک یورپ اسی تذبذب میں مبتلا رہا۔ حتی کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک شخص لوبک (Lobeck) نامی پیدا ہوا اور اس نے ان دونوں نظریوں کی تردید کر کے ظاہر کیا۔ کہ عہد قدیم کا انسان نہائیت سادہ انسان تھا۔ اور خواب و خیال ہی کو حقیقت سمجھتا تھا۔ اس لئے یہ دعوی کرنا۔ کہ روایاتِ اصنامی کی تہ میں حقیقتیں نہاں ہیں خیال کی دوسری گمراہی ہے ہمیں ان روایات کو اسی سادگی کے ساتھ پڑھ لینا چاہیئے۔ جس سادگی کے ساتھ وہ بیان کی جاتی ہیں۔ اور ان پر زیادہ غور و فکر ذہانت کا غلط استعمال ہے گویا ان کی حقیقت بالکل وہی ہے۔ جو ایک پردہ کی تصویر کی جس کے نہ اس طرف کچھ ہے نہ اس طرف

لیکن اہل مغرب نے اپنی جستجو برابر جاری رکھی اور اسی صدی میں دو بھائی جو گرم برادرس (Grimm Brothers) کے نام سے مشہور ہیں جرمنی سے اٹھے۔ اور انھوں نے نہایت محنت سے مختلف ممالک کی روایات جمع کر کے ثابت کیا۔ کہ بہت سی روائتیں تحریر میں آنے سے قبل لوگوں میں زبانی منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں۔

اور یہ تاریخی حیثیت رکھتی تھیں، لیکن بعد کو ان میں رنگ آمیزی کر کے مذہبی حیثیت دیدی گئی۔ گرم برآدرس کا یہ خیال قابل قبول ہو یا نہ ہو لیکن ان کی تحقیقات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم انکشاف یہ ہوا۔ کہ جس طرح سنسکرت زبان اور مغربی زبانیں متحد الجنس ہیں۔ اسی طرح یورپ کی آریہ قوموں کی روایات اصنامی اور ویدوں کی روایات بھی ایک ہی ماخذ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً وینس۔ اہل رومہ کی مشہور دیوی ہے جس سے تمام کاروبار حسن و عشق متعلق سمجھا جاتا ہے۔ بعد کو یہی دیوی یونانیوں کے یہاں بھی آگئی اور بعض ایسی روایتیں اس سے منسوب کر دی گئیں۔ جو اہل رومہ میں نہ پائی جاتی تھیں۔ لیکن اس کا اصل ماخذ سنسکرت کا لفظ وان یا وین ہے۔ جس کے معنی خواہش و محبت کے ہیں چنانچہ گرداں سنسکرت میں محبت کی دعاؤں کو کہتے ہیں۔ اور بھجنا وان محبت کی قربانیوں کو۔ سنسکرت میں ونیسا دلکش عورت کے معنی میں آتا ہے۔ جس سے اینگلو سکسن لفظ (wen) جرمن (Wonne) اور انگریزی (winsoome) نکلے ہیں۔ (Venery، Venerate، Venereal) بھی اُسی سے مشتق ہیں۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ مشہور ما ڈین یا بین بھی اس سے نکلا ہو،

اسی طرح یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا جو خدائے خدائیگان کا مرتبہ رکھتا ہے زیوس (Zeus) یا زیوس پاٹر (Zeus Pater) ہے اہل رومہ اسے جیوپٹر کہتے تھے۔ سنسکرت میں اس کا نام دیوس پترا (Dyaus Pitra)

ہے اور ان سب کا متحد المأخذ ہونا ظاہر ہے۔

ویدوں کی روایات میں ایک دیوتا کا نام ترتیا ہے اور دوسرے کا کریساسوا زنداوستا میں ان کو تھراتنا اور کریساسپا کہتے تھے۔ ترتیا اور تھراتنا وہی ہیں۔ جو بعد کو فریدوں ہو گئے۔ اور کریساسوا اور کریساسپا، گرشاسپ بن گئے۔ روایات وید و زنداوستا سے معلوم ہوتا ہے کہ ورتھرا نے اژدہاک کو قتل کیا تھا۔ آپ سمجھے کہ اژدہاک کیا ہے؟ وہی جسے ضحاک کہتے ہیں۔ اور ورتھرا سے مراد یہاں فریدوں ہے۔ پھر فریدوں کے ہاتھ سے ضحاک کے قتل ہونے کا حال شاہنامہ میں اکثر حضرات نے پڑھا ہوگا۔ یونانیوں میں صبح کی دیوی نام اکیوس (Eos) ہے۔ ہندؤں کے یہاں روشاس (Ushas) ہے۔ یونانیوں کا دیوتا ارانوس ہندؤں کا ورن (Varuna) ہے۔ اور اہل رومہ کا دیوتا مارس، ہندؤں کا ماروتس ہے۔ اور ان سب کا ہم ماخذ ہونا ظاہر ہے۔

الغرض مغربی اقوام اور ایرانیوں کی روایات بہت کچھ ہندوؤں کی روایتوں سے ملتی جلتی ہیں اور چونکہ یہ سب آریہ نسل کے ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وسطِ ایشیا چھوڑنے سے قبل ہی بعض روایات ان میں رواج پا چکی تھیں جو بعد کو بھی ان میں قائم رہیں۔

اس جستجو و تحقیق کے سلسلہ میں ایک بات اور بہت عجیب و غریب معلوم ہوئی وہ یہ کہ بعض الہامی مذاہب کے لٹریچر میں جو روایات پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر

کا سُراغ انسان کے اس عہد وحشت تک پونچتا ہے۔ جب روایات اصنامی کا شاید آغاز ہی ہوا تھا۔ مسیح سے تقریباً ۵ ہزار سال قبل مصری تمدن کا آغاز ہوتا ہے اور چھ ہزار سال قبل بابل کے تمدن کا۔ جب حضرت موسیٰ کے زمانہ کے فرعون (رامیسس ثانی) کا وجود بھی نہ تھا۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ جو روایات توریت یا اسفارِ خمسہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض وہی ہیں جن کے منتشر لیکن اساسی اجزا، قدیم مصری و بابلی روایات اصنامی میں نظر آتے ہیں۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ ویدوں کے اصنامی روایات اور یورپ کی اکثر اقوام کی روایات بہت کچھ متحد الماخذ معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ دیلمؔں کی روایات کا جزو اعظم ان کی معنویت و روحانیت ہے اور اہل مغرب نے آرٹ کی حیثیت سے بجائے نفسیاتی اہمیت کے نفسانی جذبات ان سے وابستہ کر دیے۔

قدیم ترین لٹریچر خواہ وہ ہندوؤں کا ہو یا یونانیوں کا، اس کا مطالعہ ہمیں جس طرف لیجاتا ہے۔ وہ یہی ہے۔ جہاں زبان کے تحلیل و تجزیہ کے سوا اور کوئی صورت رہنمائی کی ہمیں نظر نہیں آتی۔ اور اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عہد قدیم کی تمام قوموں میں ایک زندہ قوت کا عقیدہ مشترک طور پر پایا جاتا تھا۔ اور وہ بہ لحاظ اختلاف مظاہر اس قوت کے مختلف نام رکھنے میں انہیں چیزوں سے مدد لیتے تھے، جو ہر وقت ان کے مشاہدہ میں آتی رہتی تھیں اور یہیں سے

روایات اصنامی کی بنیاد پڑتی ہے،

اس میں کلام نہیں کہ یہ کوشش زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف صورتیں اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ بعض اقوام میں اس نے ایک مستقل شریعت و مذہب کی شکل پیدا کرلی اور اس کی ابتدائی صورت مفقود ہوگئی۔ پھر اس دور میں جب کہ ہر چیز علم و عقل کی کسوٹی پر کسی جا رہی ہے۔ اصنامی مذاہب یا ان کا لٹریچر مذہبی نقطۂ نظر سے تو خیر کوئی اہمیت حاصل نہیں کر سکتا لیکن ادب و انشاء یا آرٹ کی حیثیت سے جو قیمتی معلومات اس سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ ان کی اہمیت بدستور قائم ہے اور رہے گی۔

اسی سلسلہ میں ایک اور چیز بھی قابلِ ذکر ہے جسے انگریزی میں (Folklore) کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ "گھریلو کہانیاں" زیادہ مناسب ہوگا۔ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اس نوع کی کہانیوں کا رواج نہ ہو لیکن ان کو علم الاصنام یا روایات اصنامی سمجھنا درست نہیں ہے، ان دونوں میں بہت فرق ہے اول الذکر سے مراد صرف وہ روایات ہیں جن میں دیوتاؤں، دیویوں، یا خداؤں کا ذکر پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان قدیم نے خدا کے تصور کو کن کن مادی صورتوں میں پیش کیا۔ اور گھریلو کہانیاں زیادہ تر ان واقعات و تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ جو انسان کو اس کی روزکی زندگی میں پیش آتے تھے۔ گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ یہ کہانیاں انسان قدیم کی معاشرت و معیشت، تہذیب و کلچر کے متعلق تھیں۔ یا پھر ان اوہام و قیاسات

سے جو تدبیر بنائے لاعلمی قائم کئے جاتے تھے، اس میں انسان کا تفریحی عنصر بھی شامل تھا اور مذہبی عنصر بھی۔ شاعرانہ میلان بھی شامل تھا اور اخلاقی رجحان بھی فوک لور کا لفظ سب سے پہلے ۱۸۴۶ء میں ایک شخص ٹامس نامی نے استعمال کیا اور اسی وقت سے اس کی چھان بین شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اب بالکل علم الآثار کی طرح اسکی بھی مختلف کڑیاں جوڑ جوڑ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ انسان قدیم کی تہذیب و شائستگی یا عقائد کا سراغ کس حد تک ان کے ذریعہ سے چلایا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قصہ گوئی انسان قدیم کا بھی نہایت دلچسپ مشغلہ رہا ہے، اور اس ذریعہ سے اس نے بہت سی اصلاحی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ چنانچہ آج بھی اقوام عالم کے اصلاحی لٹریچر میں ان کو بڑا مرتبہ حاصل ہے پنچ تانترا، کلیلہ دمنہ، سرت ساگر، الف لیلہ، ایسپس فیبلس (Aesop's fables) سب اسی لٹریچر میں شامل ہیں، بلکہ فریدالدین عطار کا منطق الطیر، سعدی کی گلستاں، جامی کی بہارستان اور مثنوی مولانائے روم کی اکثر حکایات اسی سلسلہ کی چیزیں ہیں، جنہوں نے انسانی اخلاق کی تعمیر میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ مختلف قوموں اور طبقوں کی ذہنیت و تعلیم کے لحاظ سے یہ کہانیاں بھی مختلف درجہ کی ہیں۔ چنانچہ سب سے زیادہ سادہ و معصوم وہ کہانیاں ہیں جو عام طور پر مائیں اپنے چھوٹے بچوں کو سناتی رہتی ہیں۔ اور ہمارے ہندوستان

میں چڑے چڑیا کی کہانی اور چاند کی بڑھیا کی داستان اس سلسلہ کی خاص چیزیں ہیں۔ لیکن آپ یہ سُن کر غالباً تعجب کریں گے۔ کہ یہ کہانیاں صرف ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ یورپ ایشیا کی بہت سی قوموں میں تھوڑے تھوڑے تغیر کے ساتھ رائج ہیں۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنے ابتدائی سادہ دور میں کیسی یکساں ذہنیت رکھتا تھا۔ اور بعد کو ماحول کے اختلاف نے اس کی قوتِ فکر و خیال میں کیسے کیسے انقلاب پیدا کئے۔ ہر چند اس میں شک نہیں کہ گھریلو کہانیاں روایاتِ اصنامی کے بعد پیدا ہوئیں۔ لیکن چونکہ ان دونوں کا ماخذ وہی انسان کی ابتدائی لاعلمی ہے۔ جب وہ مناظرِ قدرت اور حوادثِ روزگار کو قیاس و خیال کی انتہائی سادگی مگر نہایت دلکش کنایہ و تمثیل کے ساتھ سمجھنے اور بیان کرنے پر مجبور تھا۔ اس لئے یہ دونوں ذریعے ہمیں اسی نتیجہ پر پہونچاتے ہیں کہ وہ اصنامی روایات ہوں یا گھریلو کہانیاں ہیں۔ سب انسان کے ابتدائی شعور کی یادگار۔ جب طلوع و غروب، موسموں کے تغیر، طوفان یا دو باراں اور زلزلہ وغیرہ سے متاثر ہو کر وہ اپنے جذباتِ مسرت و غم ایک خاص زبان میں ادا کیا کرتا تھا۔ لیکن انسانِ قدیم کی یہ شاعری زمانۂ حال کے انسان کی شاعری نہ تھی۔ کہ حال کچھ ہے اور قال کچھ بلکہ جو کچھ وہ کہتا تھا اُسے سچ سمجھتا تھا۔ اور اسی سچ کے سامنے اپنا سرِ عقیدت جھکا دیتا تھا۔

(نگار اگست ۱۹۳۶ء)

صنمیاتِ یونان و رومہ

آج کی تقریر کا موضوع رومہ و یونان کا علم الاصنام ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے۔ ایک وہ جس میں اُس کی رُوح، اُس کا ماخذ، اور ترقی و انحطاط پر گفتگو کی جائے اور دوسرا وہ جس میں نفس روایات کے نمونے پیش کیے اُن کے اصنامی لٹریچر کی نوعیت کو ظاہر کیا جائے۔

آج میں پہلے حصّہ کو لے کر ایک اجمالی تبصرہ ان ملکوں کے علم الاصنام پر کرتا ہُوں۔

عام طور پر لوگوں کا خیال ہے، اور غالباً غلط نہیں کہ مذہب عہد صنم پرستی کے ارتقائی دور کی چیز ہے ہر چند یہ قیاس کہ انسان بُت پوجتے پوجتے خدا تک

پونچ گیا۔ بظاہر صرف شاعرانہ بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو تمام شاعری میں مجاز و حقیقت ہی ایک ایسا خیال ہے جسے علمی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر معتقدین ڈارون چاہیں تو وہ اس کو نظریہ ارتقا سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن موضوع زیر بحث میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ٹھیک اُس وقت جبکہ دنیا بتوں سے معمور تھی۔ روم و یونان میں کوئی ادارہ ایسا بھی تھا جو اصنامی روایات سے علیحدہ مذہب و اخلاق کا کوئی مفہوم رکھتا ہو۔ یا یہ کہ ان کا مذہب و صنم پرستی دونوں ایک ہی چیز تھیں۔

اس سوال کو پیش نظر رکھ کر جس وقت ہم روم و یونان کے صنمیات پر غور کرتے ہیں۔ تو ہم دونوں ملکوں کے متعلق دو مختلف نتیجوں پر پہنچتے ہیں۔ یعنی اہل روم کی صنم پرستی میں تو ہمیں ایک حد تک اخلاقیات کی وہ جھلک ضرور نظر آتی ہے جسے مذہبی سنجیدگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یونانیوں کے یہاں کیفیت دوسری ہے۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ شاید اُن کا احساس مذہب اُن کی صنم پرستی سے علیحدہ کوئی چیز تھا۔

اس میں کلام نہیں کہ اہل یونان بہت سے دیوتاؤں کو پوجتے تھے، اور اُن کا تصور وہ پیکرِ انسانی ہی کی صورت میں کیا کرتے تھے، لیکن جس وقت ہم اُن کے روایات اصنامی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ان دیوتاؤں کے اخلاق ہم کو انسانی معیار سے بھی گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور کسی طرح یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ

انہوں نے خود اپنے اخلاق کا بھی ایسا کوئی معیار قائم نہ کیا تھا، جو بقائے تمدن کے لئے اُن کے زمانہ میں بھی اتنا ہی ضروری تھا۔ جتنا آج۔ چہ جائیکہ مذہبی معیارِ اخلاق کہ وہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے۔

اُن کا سب سے بڑا دیوتا جسے خدائے خدائگان "یا رب اکبر" سمجھنا چاہیئے۔ ذیوس تھا۔ یہ ذہنی و جسمانی دونوں قوتوں کے لحاظ سے انتہائی عظمت و برتری رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف جملہ مخلوق بلکہ تمام دیوتاؤں کا بھی خدا تھا۔ وہ رعد و برق کا بھی مالک تھا۔ اور ستاروں کا بھی، وہ قانون کا محافظ تھا۔ اور بادشاہوں کا مربی، وہ مجرموں کو سزا دینے والا تھا۔ اور نیک کرداروں کا حامی۔ وہ غیب داں بھی تھا۔ اور کارساز بھی۔ وہ مقدرات کا بھی مالک کہا تھا۔ اور حوادث روزگار کا بھی۔ الغرض جملہ نظام کائنات اُس کے سپرد تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ جب ہم اس خدائے اکبر کے اخلاقی پہلو پر بھی نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو حیرت ہوتی ہے۔ کہ یونانیوں نے جرم و نیک کرداری کا مفہوم کتنا عجیب و غریب قرار دے رکھا تھا۔

اُن کے اس خدائے بزرگ کا اوّلین بنیادی کیریکٹر تو یہ تھا۔ کہ یہ تمام خدائی عظمت اس نے اپنے باپ کرونس کو ہلاک کر کے حاصل کی تھی۔ اُس کے بعد دوسری نمائش اخلاق حضرت نے یہ کی کہ اپنی بہن ہیرا (Hera) سے شادی کر لی۔ لیکن چونکہ تعلق جنسی کے باب میں اُس کے جوش و ولولہ کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اس لئے اُس نے صرف ہیرا پر کفایت نہیں کی۔ بلکہ متعدد ادنیٰ درجہ کی

دیویوں سے بھی رشتہ مواصلت قائم کیا۔ یہاں تک کہ فانی دُنیا کی عورتوں کو بھی اُس نے مختلف حیلوں سے بے آبرو کیا۔ شاہ اسپارٹا کی مشہور حسین بیوی لیڈا حوض پر ننگی نہا رہی تھی۔ کہ ذیوس اُسے دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ اور فوراً ہنس بن کر لپٹ گیا ــــــ اس سے کئی اولادیں پیدا ہوئیں۔

شاہ آرگوس کی پری پیکر لڑکی ڈانائی (Danae) ایک برج میں چھپی ہوئی تھی۔ کہ ذیوس نے سونے کی بوچھاڑ بن کر اُس کی قربت حاصل کی۔ یوروپا شاہ فینیشیا کی لڑکی اپنے باغ میں پھول چن رہی تھی۔ کہ ذیوس بیل کر وہاں پہنچا اور اُسے اٹھا کر جزیرہ کریٹ لے آیا۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات اس خدائے اکبر کی اخلاقی کمزوریوں کے یونانیوں کی روایات میں نظر آتے ہیں۔ پھر اس اخلاقی انحطاط میں صرف تنہا ذیوس ہی مبتلا نہ تھا۔ بلکہ اُن کے دوسرے دیوتاؤں میں بھی یہ کمزوری پائی جاتی تھی۔ مثلاً اُن کی ایک نہایت مشہور دیوی اتھینا تھی۔ جو ذیوس کے سر سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اپنے باپ ہی کی طرح مکار و فریبی بھی تھی۔ ایریس اُن کا جنگی دیوتا تھا۔ اور فتح و کامیابی کے لئے اُس کی مدد چاہی جاتی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے۔ کہ بعض روایات سے اس کی انتہائی بزدلی بھی ظاہر ہوتی ہے ایک بڑا اہم دیوتا اُن کا اورانوس بھی تھا۔ لیکن اُس نے اپنے باپ کو ہلاک کر ڈالنے میں مطلق تامل نہ کیا۔ اور کرونس دیوتا تو ایسا شقی القلب تھا کہ اُس نے اپنے بچے ہی کو کھا لیا۔

ان تمام روایات کے ساتھ ساتھ جب ہم اس حقیقت پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ کہ کیا اُس وقت خود اہل یونان کے اخلاق بھی اتنے ہی گِھرے ہوئے تھے۔ تو حیرت ہوتی ہے۔ کہ جو باتیں وہ خود اپنے سے منسوب کیا جانا پسند نہ کرتے تھے اُنہیں دیوتاؤں سے کیوں منسوب کرتے تھے۔ اور کیوں ایسے دیوتاؤں کے حضور میں قربانیاں وغیرہ پیش کر کے اُنہیں خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے،

ظاہر ہے۔ کہ یونانیوں کے تمدن اور روایات میں یہ اصول اختلاف ابتدا ہی سے چلا آ رہا تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ زینو فون سے لیکر یوپیا ندس تک سوائے افلاطون کے کہ اُس نے تو ضرور قربانیوں کی مخالفت کی فلاسفۂ یونان ہی سے کسی اور نے اس امر کی کوشش نہیں کی۔ کہ ان روایات سے یہ عنصر علیحدہ کر دیا جائے یا کوئی اور اصلاحی صورت سوچی جائے۔

قدیم یونانی تاریخ و انتشار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل یونان لامذہب تھے۔ وہ متعدد خداؤں کو مانتے تھے۔ جن میں زیوس کا مرتبہ سب میں بلند تھا۔ اور دوسرے اُس کے فرشتوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ البتہ وہ اسے کوئی الہامی چیز نہ جانتے تھے۔ اور نہ کوئی الہامی کتاب رکھنے کے مدعی تھے۔ اُن کے یہاں مذہبی رہنماؤں کا بھی وجود نہ تھا۔ حکومت کے قانون کے مطابق جو مراسم عبادت مقرر تھے لوگ اُن کی پابندی کرتے تھے۔ اور ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق ان کی توجیہ و تعلیل کر لیا کرتا تھا۔ اُن کا اعتقاد کائنات و نظام کائنات کے متعلق یہ تھا۔ کہ جو

کچھ دنیا میں ہو رہا ہے۔ اُس کا کسی نیک انجام پر منتہی ہونا ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ باپ دادا کے گناہوں کا اثر ان کی اولاد پر بھی پڑتا ہے دوسری دُنیا کے متعلق جو کچھ اُن کا اعتقاد تھا۔ وہ ہومر (Homer) کے زمانہ تک یقیناً ضمنی رنگ رکھتا تھا۔ اور اُس میں کوئی مذہبی پاکیزگی یا بلندی شامل نہ تھی۔ لیکن بعد کو جب انھوں نے دیکھا کہ ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ اچھے کاموں کا اچھا ہی نتیجہ پیدا ہو۔ اور بُرے کاموں کا بُرا۔ اُسی کے ساتھ بے گناہوں اور معصوموں کی تکلیف و اذیت کی وجہ بھی اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔ کہ یہ اسلاف کے کار بد کا نتیجہ ہے تو مستقبل کی سزا و جزا کی طرف ان کا خیال منتقل ہوا۔ اور افلاطون کے زمانہ میں پڑھے لکھے معزز یونانیوں کا یہی عقیدہ تھا کہ اس عالم کے اعمال کی سزا اور جزا، دوسرے عالم میں ملنا ضروری ہے۔ سب سے زیادہ عجیب و غریب بات اُن کے معتقدات میں یہ ہے کہ اُن کے یہاں شیطان کا وجود نہیں پایا جاتا۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ انسانی گمراہی کا تعلق صرف انسانی ذات سے قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں کسی دیوتا یا مافوق الفطرت ہستی کے اشارہ یا مرضی کو شامل نہیں کرتے۔ لیکن بایں ہمہ جب ہم ان دیوتاؤں کی خصوصیات اخلاق کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ان میں تمام وہی عیب نظر آتے ہیں۔ جن کو وہ خود اپنے لیے کبھی پسند نہ کرتے تھے۔ پھر اس تضاد واختلاف میں باہم تطابق پیدا کرنے کی کوشش اگر کی جائے تو اس کی صرف یہی تاویل ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہی فعل جو انسانوں کیلئے مکروہ ہے۔ یونانیوں کے نزدیک خدا کیلئے

جائز و مستحسن تھا لیکن یہ تاویل بعید از قیاس ہے کیونکہ خوبی محض کا جو مفہوم افلاطون نے قائم کر رکھا تھا۔ وہ کبھی اس کی اجازت نہ دے سکتا تھا۔ کہ اپنے دیوتاؤں سے وہ ایسی باتیں منسوب کریں کہ اگر وہ خود اُن سے مبرا نہ ہوں تو دیوتا اُن سے باز پُرس کریں۔ دوسری یہ کہ ان روایات کا حقیقی مفہوم کچھ اور ہے۔ جو ظاہری الفاظ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ تاویل ان روایات میں تو ممکن ہے جن کا تعلق صرف حوادث طبیعی یا مناظر قدرت سے ہے۔ لیکن مکاری و فریب، شہوت پرستی، ہوس رانی وغیرہ کے ان واقعات میں جو ذیوس اور دوسرے دیوتاؤں سے منسوب کیے جاتے ہیں اس تاویل کی بھی گنجائش نہیں۔ تیسری تاویل یہ کی جاتی ہے کہ تمام روایات اصنامی صرف گمراہ شعراء کے ذہن کی پیداوار ہیں جس کو حقیقی معتقدات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہی ایک تاویل ایسی ہے جسے قرین عقل کہا جا سکتا ہے۔

الغرض یہ کہنا کہ یونانیوں کی اصنامی روایات اور ان کا مذہب ایک ہی چیز تھی کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کے اخلاق پر بجائے صنمیات کے مذہبیات ہی کی حکومت قائم تھی۔ لیکن یقینی ہے کہ ان کے مذہب کا تعلق وحدانیت سے نہ تھا۔ بلکہ خدا کی خدائی کو وہ بہت سی مافوق الفطرت قوتوں میں تقسیم کر کے کاروبار خداوندی کو تقسیم عمل کے نظریہ کے مطابق چلایا جانا زیادہ قرین عقل سمجھتے تھے۔ یہاں تک تو اہل یونان کی صنم پرستی کا ذکر تھا۔ اب اہل روما کو لیجیے۔

قدیم اہل روما کا مذہب اپنے ماخذ کے لحاظ سے بہت کچھ یونانیوں کے مذہب سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہی سبب تھا۔ کہ بعد کو دونوں کے مذاہب آپس میں نہایت آسانی سے ملکر ایک ہو گئے۔

روما کے قدیم باشندے جنہیں لاطینی یا سابینی کہتے ہیں اور قدیم یونانیوں کے آباؤ اجداد سب اپنی نسل کے لحاظ سے ایک ہیں۔ کیونکہ یہ سب عہدِ قبل تاریخ کی اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو پلاسگی کہلاتی ہے اور یونان کی اصلی آبادی تھی یہی وجہ ہے کہ پلاسگی قوم کے بہت سے دیوتا ان دونوں میں رواج پا گئے۔ ہر چند یہ صحیح ہے۔ کہ اہل روما کی ذہنی تربیت، قومی نشو ونما، تمدنی تہذیب و شائستگی پر اثر دریا کا بڑا اثر پڑا تھا۔ لیکن جس حد تک اہل روما کے مذہبیات کا تعلق ہے۔ یہ اثر بالکل خارجی حیثیت رکھتا تھا۔ اور سوائے ظاہری مراسم کے مذہب کے اصلی معتقدات پر اثر انداز نہ ہوا تھا۔

ہر چند روما کی اطالی، سابینی، اور اتروری قوموں کے مذاہب مقامی اثرات سے بہت کچھ متاثر ہوئے لیکن ان قوموں کی اجتماعی خصوصیات محو نہیں ہوئیں۔ اور ان کی جھلک اُن کی روایات میں ہمیشہ پائی گئی۔ چنانچہ وہ شاعرانہ ذہنیت اور تخیل کی آفرینش جو اہل یونان میں پائی جاتی تھی اور جس نے اُن کے مذاہب و روایات کو دلکش و رنگین بنا دیا تھا اہل روما کی روایات میں بالکل مفقود تھی۔

اور اسی لئے اُن کے دیوتاؤں میں
وہ کمزوریاں نہیں پائی جاتیں۔ جو یونانی دیوتاؤں میں نظر آتی ہیں۔ اہل روما کی ذہنیت اہل یونان سے ذرا مختلف تھی۔ یہ ذہنی زندگی کے زیادہ دلدادہ تھے۔ اور وہ عملی زندگی کے۔ یہ سوچتے زیادہ تھے اور کرتے کم تھے۔ ان کے یہاں جو کچھ تھا کام ہی کام تھا۔ اور صرف خیال کے لئے نہ اُن کے پاس دماغ تھا۔ نہ وقت اسی لئے اہل روما کے مراسم عبادت بھی سادہ، سنجیدہ اور متین تھے جن سے جذبۂ احترام زیادہ نمایاں ہوتا تھا، چونکہ یہ جماعت نہایت ہی سادہ قسم کی گلہ بان قوم سے نکلی تھی۔ اس لئے قدیم اہل روما کے قدیم مذاہب میں کھلا ہوا۔ سر زبانی دہقانی رنگ جھلکتا ہے۔ اور ان کے دیوتا بھی وہی ہیں۔ جن کا تعلق کاشتکاری، بھیڑوں کی رکھوالی، اچھی بارش اور اچھی پیداوار وغیرہ سے ہے ان کے بعض دیوتاؤں کے سپرد گھروں کی نگرانی اور حفاظت بھی تھی۔ اور قبائلی اسباب و راحت کی فراہمی بھی۔ چنانچہ اس مخصوص انداز کی۔ مذہبیت و عبادت نے اہل روما میں بہت عرصہ تک خصوصیات دہقانی قائم رکھیں۔ اور سلطنت کی بنیاد پڑنے کے بعد بھی ان کے تہواروں اور مراسم عبادت میں یہ کیفیت عرصہ تک باقی رہی۔

ان کاشتکارانہ دیوتاؤں کے پہلو بہ پہلو بعض ایسے دیوتا بھی زمانہ قدیم سے اُن کے یہاں چلے آتے تھے۔ جو اُن کی تمدنی و اہلی زندگی کے محافظ و نگراں سمجھے

جن میں سب سے بڑا دیوتا جیوپٹر تھا۔ اس کے بعد جوں جوں اُن کی سیاسی اہمیت بڑھتی گئی دیوتاؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور آہستہ آہستہ انسانی عنصر بھی ان میں داخل ہونے لگا۔ مثلاً مارس (mars) جو جیوپٹر (Jupiter) کے بعد نہایت اہم دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ یہ جنگ کا دیوتا تھا اور شہر کی حفاظت اسی کے سپرد تھی۔

جب اہل روم نے اور زیادہ ترقی کی اور سلطنت زیادہ وسیع ہوئی تو روم کی حفاظت کا کام انہوں نے تین دیوتاؤں کی کمیٹی کے سپرد کر دیا جس میں صدر کی حیثیت جیوپٹر کی تھی اور باقی دو ممبروں میں ایک جیوپٹر کی بہن جونو (Juno) اور دوسری اس کی لڑکی مانر دار (minerva) تھی ان کے علاوہ ایک اور اہم دیوی کی پرستش ان کے یہاں پائی جاتی تھی جس کا نام وسٹا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ دنیا میں آگ پیدا کرنے کا باعث یہی دیوی تھی ——— یہ تھے وہ خاص خاص دیوتا جن کی پرستش اہل روم کے حکمران طبقہ کا مذہب تھا۔

ان کے علاوہ درجہ دوم کے دیوتا اور بھی ان کے یہاں پائے جاتے تھے جن کا تعلق اخلاقی، سیاسی، کاروباری اور تفریحی زندگی سے تھا۔ ان دیوتاؤں کی تعداد اہل روم کے ذوق و ضرورت کے لحاظ سے برابر بڑھتی گئی۔ اور معمولی روز کے واقعات و حوادث بھی وہ دیوتاؤں یا دیویوں سے منسوب کرنے لگے یہاں تک کہ ایک دیوی ان کے یہاں فسونیا تھی جس کا کام یہ تھا کہ چلنے یا کام کرنے کے بعد

جو خستگی پیدا ہو جاتی ہے اُسے دور کرتی رہے۔

اہل روما کے روایاتِ اصنامی کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کی بنیاد تین چیزوں پر قائم تھی۔ مظاہرِ قدرت، تمدنی زندگی اور اخلاق اور جب تک ان کی سلطنت محدود رہی اُن کے عقائد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن جب فتوحات وسیع ہوئیں۔ اور تعلقات تمدن بڑھے تو خارجی اثرات اور وہ بھی خصوصیت کیساتھ اہل یونان کے ان پر بہت پڑے اور نہ صرف عقائد بلکہ مراسمِ عبادت میں بھی تغیر پیدا ہونے لگا۔ اور متعدد نئے دیوتا اُن کے مذہب میں شامل ہو گئے۔

انہیں غیر ملکی دیوتاؤں میں سے ایک اپالو تھا جس کا بڑا عظیم الشان مندر روما میں تیار کیا گیا۔ بعد کو دو دیوتا کیسٹر اور پولکس کا اضافہ اور ہوا۔ اور پھر تو یہ تعداد برابر بڑھتی رہی۔

جب تک اہل روما کی تہذیب ایک قومی حیثیت اختیار کئے رہی باوجود ان تمام اجنبی دیوتاؤں کی مداخلت کے وہ اپنی خصوصیات پر قائم رہے اور ان غیر ملکی عناصر کو اجنبی ہی سمجھتے رہے۔ لیکن کارتھیج کی دوسری لڑائی کے بعد جس نے اہل روما کی تہذیب قدیم کا رُخ بالکل بدل دیا ان پر یونانی اثرات بہت غالب آ گئے اور انہوں نے ان کی روایات اصنامی کو بھی نہایت آزادی سے قبول کرنا شروع کیا ہر چند اس کے بعد بھی انہوں نے اپنے دیوتاؤں کے نام اور اپنے مخصوص مراسم

قائم کرنے کی کوشش کی لیکن آہستہ آہستہ اس میں بھی ضعف پیدا ہونے لگا اور یونانی لیریچر نے پورا تسلط قائم کرکے اپنی روایات ان میں کثرت سے رائج کر دیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اہل روم نے یونانی روایات کا اثر قبول کیا بھی تو اسوقت جب وہاں بہتر روایات کی جگہ بدتر روایات نے لے لی تھی۔ اور جن سے بجائے سنجیدگی و متانت کے لہو ولعب، عیش ونشاط، اور انحطاط اخلاق کا پتہ چلتا تھا۔

آگسٹس نے بہت کوشش کی کہ یونان کا یہ مخرب اخلاق عنصر علیحدہ ہو جائے اور اہل روم کی قدیم مذہبی روایات پھر زندہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے پرانے پرانے مندر از سر نو تعمیر کرائے، قدیم مراسم کے اجرا کیلئے سخت احکام نافذ کیے۔ اسی طرح وہاں کے مشہور شاعر اووڈ نے اپنی نظموں کے ذریعہ سے روایات قدیمہ کو زندہ کرنا چاہا۔ اور آگسٹس کے بعد اس کے جانشینوں نے انتہائی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار روما کا اصنامی مذہب بھی وہی ہو گیا جو یونانیوں کا تھا، اور جس میں ہیجان نشاط نفس پرستی اور رنگ رلیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

(نگار ستمبر ۱۹۲۷ء)

ہندوؤں کا علم الاصنام

کُرہ زمین کا کوئی حصّہ ایسا نہیں جسکا افسانہ سر زمین ہند سے زیادہ دلچسپ و حیرت انگیز ہو۔ اگر تہذیب و مدنیت کی دُنیا میں افریقہ اپنے دریائے نیل کی وادیوں پر اور مشرقِ ادنیٰ دجلہ و فرات سے سیراب ہونیوالی زمین پر فخر کرسکتا ہے۔ تو مشرق بعید بھی مصر و بابل کے دوش بدوش ہندوستان کے ان میدانوں، کوہستانوں اور وادیوں کو پیش کرسکتا ہے۔ جہاں آریہ قوم عہد قدیم کے اس دور میں جب دُنیا کی تہذیب مستقبل بعید کی تاریکی میں معدوم تھی۔ جب طرائی اور منا کی بنیاد کو بھی دُنیا نے قبول نہ کیا تھا۔ جب داؤد کے نغموں سے دُنیا نا آشنا تھی۔ جب ہومر کے گیتوں سے زمانہ آگاہ نہ تھا۔ جب کہ مسیح کی پیدائش کو پورے چار ہزار برس باقی تھے جبکہ

ابراھیم خلیل اللہ کسی بُت کدہ کو توڑ کر دینِ حنیف کی بنیاد ڈالنے کیلئے دنیا میں نہ آئے تھے۔ اُس قدیم عہد میں بھی اگر آریہ قوم کے مرد ایک طرف سوائے فتح و نصرت بلند کئے ہوئے تھے۔ تو دوسری طرف ان کی عورتیں اپنے بچوں کو وہ کہانیاں اور لوریاں سنایا کرتی تھیں۔ جو بعد کو روما و یونان کے علم الاصنام کیلئے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوئیں پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ اصنامی روایات روما و یونان مصر و عرب ہر جگہ پائی جاتی ہیں لیکن خصوصیت ہند، علم الاصنام کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔ کیونکہ تمدن و تہذیب کا وہ دور جس میں نسل انسانی کی طفلی، بچگی، دقتِ نظر، مصنوعیت رمز شناسی اور مفکرانہ رواہام پرستی سب ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ صرف ہندو علم الاصنام ہی میں ہم کو نظر آتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ تاریخ انسانی کا وہ لمحہ جس میں آفتاب کا طلوع، اُس کا عروج و زوال، شام کی شفقی رنگینیاں، سنسان رات کی خاموش ندرتیں سب یکجا نظر آتی ہیں۔ ہندو علم الاصنام کی حقیقی روح ہے اُس کی عملی زندگی اور وجدانی احساس کا وہ صحیح امتزاج، جہاں حواس ظاہری کے ساتھ دل و دماغ بھی ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں حقیقت و مجاز کی بحث بالکل بیکار ہو جاتی ہے وہ عجیب و غریب خصوصیت ہندو علم الاصنام کی ہے۔ جو کسی اور ملک کو نصیب ہی نہیں ہوتی۔

علم الاصنام کی تخلیق تین درجے رکھتی ہے۔ پہلا درجہ تخیّل محض کا ہوا کرتا ہے اس کے بعد دوسری منزل وہ ہے جب واہمہ انسانی اپنے تصرفات سے

کام لیتا ہے۔ اور تیسرا درجہ اس ارتقار کا ہے جب اُس میں گہرائی اور معنویت پیدا ہونے لگتی ہے۔ پھر آپ جس قوم کے علم الاصنام کا مطالعہ کیجئے ظاہر سے باطن کی طرف اور سطح سے اندرونیت کی طرف ترقی کرنے کی صلاحیت سب میں پائی جائے گی لیکن جس بیج درجے سے ہندو علم الاصنام معنویت کی طرف بڑھا ہے۔ اور جس انداز سے وہ آخر میں ماورار وہم و خیال اور ماورار تاریخ و حقیقت ہو کر محض ایک رُوحانی و وجدانی رمز ہو کر رہ گیا ہے وہ آپ کو کسی اور جگہ نظر نہ آئیگا۔

یونانی تہذیب میں چند مفکر ضرور پیدا ہوئے لیکن گیان دھیان کی وہ فضا جو ہندو تہذیب نے اپنے لئے تخلیق کی اور جس میں اُسے پختگی کا موقعہ ملا صرف اُسی کے لئے مخصوص تھی۔ اس کی تشکیل و تکمیل کی یہ خصوصیت کہیں اور نہیں مل سکتی کہ اُس کے مرئیات میں غیر مرئی ابدایت نظر آتی ہے، اُس کے مادیات میں رُوحانیات کا مشاہدہ ہوتا ہے، اُس کے لب و لہجہ میں ایک خاص خاموشی ہے۔ اُس کے ہنگامہ میں ایک خاص سکون ہے۔ اُس کے تار و پود میں ایک خاص مفہوم کا راز پوشیدہ ہے۔ اور اُس کی ہیئت ترکیبی میں (Centrufagal centripetal) یعنی مرکز کی طرف میلان و اجتناب دونوں خصوصیتیں یکجا نظر آتی ہیں۔

رومن و یونانی علم الاصنام کے ابتدائی دور میں ضرور اس نوع کی ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن بعد کو معنویت مفقود ہو گئی اور اُس کا قریب بہ نظر ہندو متھالوجی

کی طرح مشاہدات کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ مثلاً یونانی علم الاصنام کے کیوپڈ سے ہندوؤں کے کام دیو کا مقابلہ کیجیے، تو معلوم ہوگا کہ وہ لذات نفسانی کو مقصود زندگی قرار دیتا ہے۔ اور یہ اُسے مایا یا فانی بنا کر حسنِ اخلاق کی طرف مائل کرتا ہے۔

وینس یونانیوں کی مشہور حسن و جمال کی دیوی کے مقابلہ میں ہندو علم الاصنام لکشمی کو پیش کرتا ہے۔ دونوں کی پیدائش سمندر سے ہوئی ہے۔ اور دونوں کا تعلق نشاطِ زندگی سے ہے لیکن فرق یہ ہے کہ وینس کا کیریکٹر انسان کے صرف سطحی جذباتِ تعیش کو اُبھارتا ہے۔ اور لکشمی نوعِ انسانی کی خوشحالی و فارغ البالی کا ضامن ہے اور انسانیت کا تصوری پیکر۔

یونانیوں کا فیلوس اور اہل روم کا جیوپیٹر تقریباً وہی ہے جسے ہندوؤں میں اندر کہا جاتا ہے۔ لیکن وشنو، مہادیو، کرشن اور رام کے مرتبہ کا کوئی دیوتا وہ پیدا نہ کر سکے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمان جن کی ذہنیت میتھالوجی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ ہندوؤں کو کافر و بت پرست کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اور عرب و ہند کی بت پرستی میں بین فرق محسوس کرتے ہیں۔

بعض مسلمان صوفیہ نے ہندو عقائد میں وہ گہرائی پائی ہے۔ جو اسلامی روحانیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اسی احساس نے الفاظ "کفر و کافر" بت خانہ، ناقوس اور زنار وغیرہ میں وہ شوخ اور وجد آور کیفیت

پیدا کر دی ہو جس کو اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی متصوفانہ شاعری سے نکال دیجیئے تو وہ بالکل بے آب و رنگ ہو جائے۔

غور کرنے سے امتزاج کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندوؤں نے یہودیوں کی طرح اپنے آپ کو (chosen people of God) یعنی خدا کی برگزیدہ قوم سمجھ کر اس کی برکتوں کو صرف اپنے لئے مخصوص نہیں جانا۔ اور چونکہ ہندوستان کی زرخیز بھرپور زمین اور معتدل آب و ہوا میں تنازع حیات کا مسئلہ چند صدیوں کے اندر ہی طے ہو گیا اس لیئے خوف و عناد کا احساس بھی یہاں جلدی محو ہو گیا اور مادر گیتی کا مفہوم یہاں نسل انسانی کیلئے ایک واقعیت و حقیقت ہو کر رہ گیا اور اسی چیز نے ہندو علم الاصنام کو وہ کیفیت عطا کر دی جو یونان و روم کی فضا اور دریائے نیل کے جزر و مد پر بھروسہ کرنے والی قوم میں پیدا نہ ہو سکی۔

یہاں کی انسانیت میں جو نرمی و پختگی پیدا ہوئی اور ہندو تاریخ و ہندو اجتماعیت میں معنویت کا جو رنگ چڑھا اس کا اظہار مشکل ہے۔ البتہ شانتی وغیرہ کے الفاظ سے ہمیں کچھ پتہ چلتا ہے کہ ہندو کلچر کیا چیز ہے۔ اور ان کا اخلاقی نشو و نما کس نوع کا ہے۔ جس میں ان کی روایات اصنامی بھی آخر کار جذب ہو کر رہ گئیں۔

ہندو کلچر کی خصوصیت (Assimilation) ہے (Rejection) نہیں۔ یعنی وہ ہر چیز کو اپنے اندر ملا لیتا ہے رد نہیں کرتا جس گنگا کے دہانہ پر دین حجازی کے بیڑے کے ڈوبنے کا ماتم حالی نے کیا ہے اور اقبال کو جس چیز

نے تجمیت و مجازیت کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے پر مجبور کیا وہ یہی ہندو ذہنیت تھی۔

جو قوم سانپ، بچھو اور پتھروں کو خدا مان کر اہم برہم (یعنی انا الحق) کی بلندیوں سے گزرتی ہوئی الحاد و دہریت کو بھی اپنی آغوشِ خیال میں لے لے۔ ظاہر ہے کہ وہ دیگر مذاہب یا اقوام کو اپنا با جگزار بنائے بغیر کیونکر رہ سکتی تھی۔ ہندو کلچر کسی چیز کو مٹاتا نہیں بلکہ اپنے اندر شامل کر کے اپنی تمام معنویت اُسے دے دیتا ہے اور یہ رنگ ہندوؤں کے علم الاصنام میں ہر جگہ نظر آتا ہے جسے امرسن (Sublimity of Ethical Thaughts) یعنی تصوّرات اخلاق کی رفعت سے تعبیر کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندو دیوتاؤں کا شمار مشکل ہے اور ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے لیکن ان سب کا تعلق طبعی و جغرافی ماحول سے ہے یا پھر ان خیالات سے جو ترقی تمدن کے سلسلہ میں ایک قوم کے سامنے آتے ہیں۔

اگر ہندوؤں کی اصنامی روایات کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ تو ان میں سے اکثر کنائی و تمثیلی نظر آئیں گی بعض کی تشکیل مناظرِ قدرت کے مطالعہ کا نتیجہ ہے اور بعض انسان کے جذباتِ محبت و نفرت کی پیداوار ہیں۔ ان کے یہاں ایسی روایات بھی نظر آتی ہیں جو صرف معاشی و اقتصادی نظام کی پاکیزگی کو ظاہر کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں جو یا تو صرف شاعری کا نتیجہ ہیں یا فلسفہ و حکمت کا۔

ہندوؤں کے علم الاصنام میں رامائن و مہابھارت بڑے مرتبہ کی چیزیں ہیں۔ جن کے ذریعہ سے اخلاق و عمل کی نہایت بلند تعلیم دی گئی ہے۔ اسی طرح وہ روائتیں جو کرشن جی کی زندگی سے متعلق ہیں۔ بہت گہرے اور وسیع معانی اپنے اندر رکھتی ہیں۔

بھگوت اور پرانوں میں جو روایات پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں۔ جن میں کوئی سیاسی یا معاشرتی درس دیا گیا ہے یا کوئی اخلاقی تعلیم کسی مثال کے ذریعہ سے پیش کی گئی ہے۔ مثلاً نل دمن میں ساوتری و ستیاوان کے قصے کہ ایک میں قمار بازی کے خلاف تنبیہہ کی گئی ہے۔ اور دوسری میں محبت کی انتہائی وفاداریوں کو دکھایا گیا ہے۔

محض شاعرانہ تخیل کے سلسلہ کی روایات میں امرت (یعنی مرت) کی پیدائش اور کامدیو کا جلا دیا جانا بہت مشہور ہے طبعی مناظر سے تعلق رکھنے والی روائتوں میں سمندر کے متھے جانے کی روائت مرکزی حیثیت رکھتی ہے جس سے اور متعدد روایات پیدا ہوئیں مثلاً راہو اور کیتو کا قصہ، چاند اور سورج گرہن کی روایات ہونے کی کہانی کہ ان سب کی بیک گراؤنڈ میں درس اخلاق کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا ہے۔

الغرض کائنات کا کوئی منظر ایسا نہیں ہے۔ جو ہندو علم الاصنام میں شامل نہ ہو۔ حیوانات، نباتات، اور جمادات سبھی کا مطالعہ اس قوم نے کیا اور اپنے

تاثرات کو کسی نہ کسی رمز و کنایہ سے ظاہر کیا۔

دیوتاؤں کے ساتھ دیویوں کا وجود بھی ہندو علم الاصنام میں پایا جاتا ہے اور نہایت اہم پہلو انسانی زندگی کے ان سے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً سرسوتی جو موسیقی، شاعری اور علم و فضل کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔ یا لکشمی جو انسانی خوشحالی کی تمثال ہے یا سیتا جی جو انسانی اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہیں۔ یا رادھا رانی جو محبت و فنا دگی کی تصویر ہیں۔ اسی طرح پاربتی اور کالی وغیرہ متعدد اہم دیویاں ہندو علم الاصنام میں پائی جاتی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ وہ عورت کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور دنیاوی زندگی میں اُسے برابر کا شریک قرار دیتے تھے۔

ہندوئیت کو تین دور میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا وہ دور جو ویدوں سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا رزمیہ دور جو رامائن اور مہابھارت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور تیسرا دور پرانوں اور تانتروں کا ہے جو علم الاصنام کا خاص دور سمجھا جاتا ہے۔ درانحالیکہ ویدک دور بھی اصنامی خیالات سے خالی نہیں۔ رگ وید سب سے قدیم وید مانا جاتا ہے یعنی مسیح سے تقریباً ایک ہزار سال قبل۔ لیکن اس میں بھی جو نغمہائے عبادت درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدیم ہند و عناصر کی پرستش کرتا تھا یعنی اگنی کو پوجتا تھا جس سے مراد آگ اور آگ کی روشنی ہے (انگریزی لفظ Ignite کا ماخذ یہی لفظ ہے) وہ اِندر کی پوجا کرتا تھا جس سے مراد صاف فضاء آسمانی ہے وہ ہوا کو ماروت کے نام سے پکارتا تھا۔ سورج کو سوریا

دیوتا سمجھتا تھا۔ اور طلوع صبح کو روشناس لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ وہ اُن کی پرستش خدا سمجھ کر نہ کرتا تھا۔ بلکہ اُن کو صرف خدا کی ذریت جانتا تھا۔

رگ وید کی زبان دانشار سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اُس کائنات کے تخلیقی رموز دریافت کرنے کے لئے بیتاب تھا۔ اور آخر کار جامع اضداد خیالات سے متاثر ہوکر اظہار عجز پر مجبور ہوجاتا تھا۔ یہی وہ سعی، وہ کاوش تھی۔ جو اپنشیدوں کی تصنیف کا باعث ہوئی جس میں خدا اور اُس کے ساتھ انسانی تعلق کو عجیب غریب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ رگ وید میں خدا کے متعلق جو اظہار خیال کیا گیا ہے وہ بالکل وہی ہے۔ جو بعد کو اسلام نے پیش کیا یا بڑے بڑے مسلمان صوفیائے کرام نے مسلمان شاعروں میں بیتیل عظیم آبادی کا پورا مجموعہ گویا رگ وید کی تعلیم ہے۔ دوسرا دور جسے رزمیہ کہتے ہیں۔ وہ ہندو کلچر کا نہایت ترقی یافتہ دور تھا جس نے تقسیم عمل کے اصول پر ایک طرف فلسفہ و حکمت کے پرچار کرنے والے علیحدہ کر دیئے تھے۔ اور دوسری طرف عملی زندگی کا درس دینے والے اس دور میں فلسفہ ویدانت نے نشوونما پایا۔ اور اسی زمانہ میں شیو دیوتا کی تخلیق ہوئی جس کا رقص موت دُنیا میں زہر و امرت کو ایک چیز سمجھنے کا نہایت عمیق خیال پیش کرتا ہے۔

تیسرا دور پرانوں اور تانتروں والا ہندومت کا انحطاطی دور کہلاتا ہے۔

کیونکہ اس سے قبل ہو یگا نگت و صلح دیوتاؤں میں پائی جاتی تھی۔ وہ اب مفقود ہوگئی تھی۔ برہما کی پرستش تقریباً ترک ہو چکی تھی۔ اور شیو و وشنو کی جنگ شروع ہوگئی تھی۔ علاوہ اس کے رزمیہ دور میں جو خصوصیات دیوتاؤں کی بتائی جاتی تھیں ان میں انحطاط پیدا ہو چلا تھا۔ اور انسانی عنصر کا شمول بڑھتا جاتا تھا۔ ویدوں میں جو صورت عبادت کی بتائی گئی تھی۔ وہ بالکل ختم ہوگئی تھی۔

بعض بعض پران مثلاً بھگوت ایسے ہیں جن میں قدیم ہندوئیت سے انحراف تو نظر نہیں آتا لیکن اصل ویدک تعلیم بھی انہیں نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی صورت ایسی قرار دے سکتے ہیں جسے قدیم ہندوئیت اور جدید ہندوئیت کا سنگم کہنا چاہیئے۔

جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں۔ ہندو مذہب نے اپنے دور میں کثرت سے دیوتا پیدا کئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کی پرستش بھی برابر جاری رہی۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ ہندو لوگ دیوتاؤں کو خدا سمجھتے تھے۔ درست نہیں۔ ان کی بت پرستی گویا خدائے واحد کی حقیقی عبادت تھی۔ جو آرٹ کی شکل میں کی جاتی تھی۔ اور ان کی صنم پرستی گویا اس امر کا اعتراف تھا کہ انسان خدا کا تصور اگر کر سکتا ہے۔ تو صرف اس طرح کہ قوائے عالم و مظاہر فطرت کے سمجھنے کی کوشش کرے۔ الغرض دنیا میں متعدد بت پرست قومیں پیدا ہوئیں لیکن

یہ شرف صرف ہندوؤں کو حاصل ہے کہ ان کا شرک و کفر بالکل مجازی چیز ہے۔ اور حقیقت کے لحاظ سے ان کا مرتبہ وہی ہے۔ جسے غالبؔ کی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ:۔

ہموارہ ترا شد بت و کافر نتواں گفت۔

("نگار" اکتوبر ۱۹۳۷ء)

داستانِ ابر و باد

لاکھوں برس پہلے کی بات ہے کہ جب کرہ زمین کے مستقل معدنی اجزار آہستہ آہستہ سرد ہونے لگے۔ تو وزنی عناصر (جیسے سونا، چاندی، تانبہ اور لوہا) مرکز زمین کی طرف مائل ہوئے اور ہلکے عناصر (جیسے ہیلیم، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن) سطح پر آ گئے۔ جن کے امتزاج کا دوسرا نام فضا (Atmosphere) ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہوا کی موٹی تہ جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے اس کا وزن ۶ ہزار ملین ٹن ہے (یعنی ۶۰ کھرب ٹن)

ہوا میں پھیل جانے کی صلاحیت ۱۰۰ سال قبل مسیح ہی میں معلوم ہو چکی تھی ۱۔

اس کے دباؤ کا حال بھی گلیلیو کے ایک اطالوی شاگرد کو معلوم ہو چکا تھا جس نے پارہ کا تھرمامیٹر ایجاد کیا۔ ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر ۷ء۱۴ پونڈ دریافت ہوا ہے لیکن انسان اس دباؤ کو اس لئے برداشت کر سکتا ہے۔ کہ خود اس کے جسم کا اندرونی دباؤ بھی اتنا ہی ہے اور وہ ہوا کے دباؤ کو سنبھالے رکھتا ہے۔

صاف ہوا انسان کی صحت و زندگی کے لئے بڑی ضروری چیز ہے اس میں تھوڑا سا نم بھی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خشک ہوا میں گرمی بالکل نہیں ہوتی۔ اور تر ہوا میں گرمی پائی جاتی ہے۔ زمین سے متصل حصّہ ہوا کا نسبتاً زیادہ گندہ اور بھاری ہوتا ہے۔ اس لئے خالص ہوا زمین سے ۶۶ فٹ بلندی پر میسر آسکتی ہے اور صحت گاہیں بلند مقامات پر قائم کی جاتی ہیں۔

شہروں کی ہوا خراب ہونے کا سبب یہی ہے کہ اس میں مختلف چیزوں کے ذرات مل جاتے ہیں۔ جس چیز کا نام کُہر ہے۔ وہ یہی ذرات ہیں جن میں آفتاب کی روشنی نفوذ نہیں کر سکتی۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہے۔ کہ برطانیہ کے جزیرہ میں ہر سال ۲۵ لاکھ ٹن خاک کے خراب ذرات ہوا میں مل جاتے ہیں اور لندن کی فضا میں سالانہ ۵ لاکھ ٹن ذرات گندھک کے پائے جاتے ہیں۔

خشک ہوا میں ۸۰ فیصدی حصّہ نائٹروجن پائی جاتی ہے ۲۱ فیصدی آکسیجن

۹۳ ،۰ فیصدی آرگن (Argon) اور ۰۳ ،۰ فیصدی کاربن ڈائی آکسائیڈ گیسیں اور بھی تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہوا میں آکسیجن کی مقدار گھٹ کر ۱۸½ فیصدی رہ جائے تو شمع گل ہو جائے۔ اور اگر ۷ فیصدی رہ جائے تو انسان دم گھٹ کر مر جائے۔

زمین کے دو پھیپھڑے ہیں، بایاں پھیپھڑا کناڈا ہے، اور داہنا شمالی سائبیریا جاڑوں میں یہ پھیپھڑے گرم ہوا کی بڑی مقدار اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور سرد ہوا فراہم کرتے ہیں۔ گرمیوں میں ان کا یہ عمل اُلٹ جاتا ہے۔

زمین کے چاروں طرف فضا کی تہ اتنی شفاف ہے کہ آفتاب کی روشنی برابر آتی رہتی ہے۔ لیکن اس کی گرمی ۴۰ فیصدی فضا میں جذب ہو جاتی ہے۔
اگر ہم زمین کی گہرائی کی طرف چلیں تو ہر سو فٹ پر ایک درجہ حرارت بڑھتا ہوا نظر آئیگا۔ اور اگر ہم اُوپر چڑھیں تو ہر ۳۰۰ فٹ پر نصف درجہ حرارت گرا ہوا معلوم ہو گا۔

کرہ زمین کے چاروں طرف جو گیسیں پائی جاتی ہیں۔ وہ بہت ہلکی ہیں لیکن زمین کی کشش کی وجہ سے وہ بہت اُوپر جا کر ختم نہیں ہو جاتیں۔ پھر بھی بعض گیسیں ایسی ہیں (مثلاً ہائڈروجن اور ہیلیم) کہ وہ بھاگ ہی نکلتی ہیں۔ اور زمین ان

پر پورا قابو نہیں رکھ سکتی۔

چاند کے چاروں طرف بھی کسی وقت گیسوں کی فضا پائی جاتی تھی لیکن اب وہ خلا میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی ہے۔ عطارد جو ہماری زمین کے بیسویں حصّہ کے برابر ہے کرۂ ارض کی طرح کوئی فضا نہیں رکھتا۔ زہرہ کے گرد البتہ ویسی ہی فضا پائی جاتی ہے۔ جیسی زمین کے گرد۔ اس لئے اگر ہم وہاں پہونچ جائیں تو زندہ رہ سکتے ہیں۔

ہوا جتنی گرم ہوگی، بادل اتنے ہی اونچے ہوں گے۔ یعنی اگر خط استوار پر جہاں کی ہوا زیادہ گرم ہوتی ہے، بادل چھ میل کی بلندی پر ہوں گے۔ تو منطقۂ باردہ میں (مثلاً گرین لینڈ) ان کی بلندی نصف میل سے زائد نہ ہوگی۔ شمالی یورپ میں جہاں سردی زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے موسموں میں بادلوں کی بلندی نصف میل سے ڈھائی میل تک ہوتی ہے اور بارش کے زمانہ میں آدھ میل سے سوا میل تک۔

انسان اس وقت تک زیادہ سے زیادہ چودہ میل کی بلندی تک پہونچ سکا ہے لیکن غبارہ بیس میل کی بلندی تک گیا ہے، ۵۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر درجۂ حرارت صفر سے بھی ۶۲ درجے کم ہوتا ہے۔ ۱۲ میل کے بعد ۲۰ میل تک البتہ ہوا کی تہ میں پھر گرمی شروع ہو جاتی ہے۔

گذشتہ جنگ عظیم میں جب جرمنی نے پیرس پر لمبی تار کی توپوں سے گولہ باری

کی ہے۔ تو گولہ ۲۲ میل اُونچا خم بناتا تھا۔ لیکن کراکاتوا (Krakatoa) کے آتش فشاں پہاڑ کا مادہ ۳۰ میل کی بلندی تک اُڑ کر پہنچا تھا۔

بڑی بڑی آندھیاں جو زمین پر آتی ہیں ان کا سبب ہوا کے وہ تموجات ہیں جو ۵۰ میل اُونچے پیدا ہوتے ہیں تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ۳۰۰ میل کی بلندی پر بھی ہائیڈروجن اور نائٹروجن کے منتشر اجزا فضا میں پائے جاتے ہیں۔

دُنیا کی قیمتی چیزوں میں گیسوں کا بھی شمار ہوتا ہے بعض گیسیں تو سونے اور پلاٹنم سے زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ ان میں موسم کا مقابلہ کرنے کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی ہے۔ یہ قیمتی گیسیں ہوا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور سمندروں کے پانی میں بھی بلکہ پانی میں ہوا سے زیادہ۔

ان گیسوں میں اس وقت ہیلیم (Helium) گیس کی بڑی قدر ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے اور آگ کو قبول نہیں کرتی۔ غباروں میں اب اسی گیس سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اسی کا ذخیرہ سب سے زیادہ امریکہ کے پاس ہے۔

قطبین کے پاس ہوا کے ذرات زمین کے دُوسرے حصوں کی بہ نسبت دو چند رفتار سے گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ آندھیوں کا تعلق ۵۰ میل

بلند فضا کے تموجات سے ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر آندھیوں کا رُخ اُوپر ہی کی طرف ہوتا ہے ورنہ تباہ ہو جائے۔

امریکہ میں بہت زیادہ آندھیاں آتی ہیں یعنی وہاں سالانہ ۱۳۰ آندھیوں کا اوسط ہے اور سینکڑوں جانیں ان سے تلف ہو جاتی ہیں۔ ان کی رفتار ۵۰ میل سے ۵۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے سنہ ۲۴ء میں آندھیوں کے سلسلے نے لوئی سیانا (Louisiana) سے لیکر ورجینا (Virginia) تک سینکڑوں آدمیوں کو ہلاک کیا سنہ ۱۸۹۶ء میں سنٹ لوئی (St. Louis) کو آندھیوں نے ۲۰ لاکھ پونڈ کا نقصان پونچایا اور سنہ ۲۷ء میں یہاں کی ۵۰۰ عمارتیں مسمار کردیں سنہ ۲۸ء میں ایک آندھی نے فلوریڈا کے بارہ سو اور گواڈلوپ کے ۱۲۷۰ آدمیوں کی جانیں لیں

یورپ میں آندھیاں کم آتی ہیں لیکن سنہ ۲۳ء کی آندھی نے فرانس کے جنگلوں میں ۵۰ ہزار درخت جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دئیے۔

یورپ میں ہوا چکیوں کا رواج صلیبی جنگوں کے وقت سے ہوا ہے جو ایران سے وہاں پونچا تھا۔ بلجیم میں ایک ہوا چکی بارہویں صدی کی اب تک پائی جاتی ہے۔ ہالینڈ میں ۲۵۰۰ چکیاں مختلف قسم کے کام کرتی ہیں چین میں بھی ان کے ذریعہ سے آبپاشی ہوتی ہے۔

بارش کے قطرے گرمیوں میں بہ نسبت جاڑوں کے زیادہ بڑے ہوتے ہیں یعنی گرمیوں میں ان کا قطر ۳/۲۰ انچ سے ۳/۱۰ انچ تک ہوتا ہے۔ بارش کے قطرہ کا وزن اوسطاً ۰ر۲ گرم ہوتا ہے یہ ۲۵ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین پر آتا ہے،

بارش کا اوسط مختلف ملکوں میں مختلف ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ بارش آسام کے پہاڑی مقام چراپونجی میں ہوتی ہے۔ جہاں کا سالانہ اوسط چار پانچ سو انچ ہے۔

کہر بھی ایک قسم کا بادل ہی ہے۔ لیکن زمین سے متصل۔ جب زمین کے بخارات میں دھوئیں کے اجزا مل جاتے ہیں اور وہ بخارات اوپر نہیں چڑھ سکتے تو کہر بن جاتے ہیں۔ کہر سے بھی دنیا کو بہت نقصان پونچتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء کے کہر نے انگلستان کو ایک کروڑ پونڈ کا نقصان پونچایا۔ فروری ۳۶ء میں ایک دن ایسا آیا تھا۔ جب سارے یورپ کو کہر کی چادر نے لپیٹ لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دنیا کے تمام کام معطل ہو گئے۔

گرج کا طوفان بھی بادلوں ہی سے پیدا ہوتا ہے، جب دو ہوائیں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں۔ تو ٹھنڈی ہوا اوپر سے آکر گرم ہواہیں داخل ہوتی ہے۔ اور اس سے پانی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ یہ ہوا پانی کے قطروں

میں انجماد پیدا کر دیتی ہے اور انہیں کا نام اُولا ہے۔

اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ کرۂ زمین پر سالانہ ایک کروڑ ۶۰ لاکھ گرج کے طوفان آتے ہیں اور ۶۰ لاکھ بار بجلی کی چمک روزانہ پیدا ہوتی ہے۔ طوفان کے دوران میں بجلی ۲۰۰ مرتبہ فی گھنٹہ چمکتی ہے۔ بجلی فی الحقیقت ایک شعلہ یا چنگاری ہے جو زمین و بادل یا دو بادلوں کے درمیان تناؤ یا کشش کے دباؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں ۵۰ کروڑ گھوڑوں کی قوت پنہاں ہوتی ہے۔ اور اس کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ ہے۔

گرم ممالک میں گرج کے طوفان زیادہ آتے ہیں۔ بادا سب سے بڑا مرکز ان طوفانوں کا ہے۔ جہاں ہر سال اوسطاً ۲۲۳ طوفان آتے ہیں۔

بجلی سے فائدے بھی دُنیا کو پہنچتے ہیں۔ اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ ہے۔ کہ اس سے سالانہ دس کروڑ ٹن نائٹروجن پیدا ہوتا ہے، جو زمین کو زرخیز بنانے کے لئے ضروری ہے اور نقصان یہ کہ بہت سے درختوں میں اس سے آگ لگ جاتی ہے۔ فصلوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور جانیں بھی ضائع ہوتی ہیں

گرج کی رفتار تقریباً ۵ سیکنڈ میں ایک میل ہے۔ اس لئے اگر گرج چار میل دور ہو تو ٹیلی فون سے آپ تقریباً ۱۸ سیکنڈ پہلے اس کی آواز کو سن لیں گے گرج کی آواز میں بازگشت پیدا ہوتی ہے ہوا کی اُن تہوں سے جو مختلف دباؤ اور ٹمپریچر رکھتی ہیں۔

موسم سے مراد فضا کی وہ کیفیت ہے، جو کسی مخصوص حصۂ زمین میں کچھ عرصہ تک قائم رہتی ہے خط استوار کے نیچے جتنے مقامات ہیں وہ زیادہ گرم ہوتے ہیں کیونکہ آفتاب کی کرنیں یہاں سیدھی پڑتی ہیں۔ زمین کے ٹمپریچر کا اوسط ۱۶ درجہ سنٹی گریڈ ہے۔ لیکن ترکستان میں ۵۰ تک بڑھ جاتا ہے اور گرین لینڈ میں صفر سے بھی نیچے ۹۰ درجے تک گر جاتا ہے۔ مخلوقات میں صرف انسان اور کتا دو ہی جاندار ایسے ہیں۔ جو اپنے آپ کو مختلف موسموں کا عادی بنا سکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ سفید اقوام میں یہ اہلیت زیادہ پائی جاتی ہے۔

تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ کہ ہر حصۂ زمین کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے یعنی جو حصے پہلے گرم تھے۔ وہ سرد ہوتے جا رہے ہیں اور جو سرد تھے وہاں گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب آفتاب کے تغیرات کو قرار دیا جاتا ہے۔

آب و ہوا کے لحاظ سے دنیا کا سب سے زیادہ خشک مقام خرطوم ہے۔ جہاں کی ہوا میں نمی کی مقدار صرف ۲۸ فیصدی ہے اور سب سے زیادہ مرطوب جگہ کیمرون پہاڑ کا دامن ہے۔ جہاں کی ہوا میں ۹۳ فیصدی رطوبت پائی جاتی ہے سب سے زیادہ ابر آلود مقام روس کا جزیرہ نمائے کولا ہے۔ جہاں تقریباً ہمیشہ بادل گھرے رہتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ صاف فضا چلی کے ایک شہر کلاما کی ہے جہاں ابر کبھی نظر نہیں آتا۔

جزائر جلوئنٹ (Galantic Islands) میں مال کے

۲۳۶ دنوں میں برابر بارش ہوتی رہتی ہے اور دریائے نیل کی وادی حلفہ میں دس دس برس تک پانی کا ایک قطرہ نہیں گرتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوائی کا ایک مقام دیلیلی (Waialeale) میں ہوتی ہے جہاں کا اوسط ۵۸۰ انچ ہے سب سے زیادہ تیز بارش جزائر فلپائن کے ایک مقام باگیو (Baguio) میں ہوتی ہے۔ جہاں ایک بار چوبیس گھنٹے میں ۴۶ انچ بارش ہوگئی۔

زمین کو آفتاب سے جتنی گرمی پونچتی ہے۔ اس کی مقدار بہت کم ہے۔ یعنی آفتاب کی گرمی کو ہم ۴۷ سال فرض کرلیں تو اس میں سے صرف ایک سکنڈ ہم کو ملتی ہے۔ دوسرے سیارے زمین سے دس گنا زیادہ حرارت حاصل کرتے ہیں اور باقی حرارت ضائع ہو جاتی ہے۔ آفتاب کی شعاعیں زمین تک فیصدی چالیس کے اوسط سے پونچتی ہیں۔ ۲۰ فیصدی فضا میں جذب ہو جاتی ہیں اور ۴۰ فیصدی واپس پلٹ جاتی ہیں۔

اگر آفتاب کی کرنیں جن کا درجۂ حرارت دس ہزار الیقین کیا گیا ہے۔ دس فیصدی گرمی کھودیں تو دنیا کے گرم تر مقامات بھی منجمد ہو جائیں۔

("نگار" اپریل ۱۹۴۰ء)

دُنیائے آب کی کہانی

کرۂ زمین کا چوتھائی حصہ خشکی ہے۔ باقی تین چوتھائی پانی۔ حصۂ آب کا رقبہ ۱۴ کروڑ مربع میل سے زیادہ ہے۔ جو زمین کے شمالی حصہ میں ۶۱ فیصدی پایا جاتا ہے اور جنوبی حصہ میں ۸۱ فیصدی۔

ہر سال پانی کی ایک تہ ۱۳ فٹ ۹ انچ کی موٹی بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ ...۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۵۳ فٹ مکعب یا ......،۰۰۰،۰۰۰، ۵۰ ٹن پانی ہر سال سورج کی گرمی کی نذر ہو جاتا ہے جس کی تلافی بارش اور دریاؤں سے ہوتی رہتی ہے۔ قطبین کے علاقہ میں پانی ایک اور شکل میں بھی پایا جاتا ہے جس کا نام تودہ برف ہے۔ ان تودوں کا نہایت ہی تھوڑا حصہ ہر سال پگھلتا ہے

ورنہ اگر یہ تمام تودے پگھل جائیں تو سوائے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کے ساری دنیا غرقِ آب ہو جائے۔

سب سے بڑے تودے گرین لینڈ کے سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہوگی۔ کہ گرین لینڈ کا سمندر بعض جگہ چھ ہزار فٹ کی موٹی تہ میں چار چار لاکھ مربع میل تک منجمد ہو جاتا ہے۔ اور اس سے تقریباً ایک ارب ٹن پگھلا ہوا پانی ہر سال سمندروں میں پہنچتا رہتا ہے۔

برفیلے تودوں کی تعداد، جو شمال سے جنوب کی طرف بہہ کر آتے ہیں اوسطاً ۲۰۴ ہے۔ اور اس وقت تک سب سے بڑا تو وہ ۶۵ فٹ اونچا اور ۷۰۰ فٹ لمبا دیکھا گیا ہے۔ جس کا وزن کروڑوں ٹن ہونا چاہیئے۔ جب ۱۹۱۲ء میں ٹائٹانک جہاز برف کے تودوں سے ٹکرا کر غرق ہوا۔ تو تودوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی جماعت مقرر کی گئی۔ تاکہ ان کو توڑتی رہے اور جہازوں کی آمدورفت مخدوش نہ رہے۔ لیکن پوری طرح اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک بار وقت واحد میں پانچ سرنگیں لگا کر ایک تودہ کو اڑانا چاہا۔ لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا۔ کہ تودہ میں صرف پندرہ فٹ گہرا اور ۲۰ فٹ لمبا سوراخ پیدا ہو سکا۔ ایک مرتبہ بہت زیادہ قوی ڈائنامیٹ بجلی کے ذریعہ سے استعمال کیا گیا۔ لیکن اس نے بھی کوئی اثر نہ کیا۔

تودوں کا بہت بڑا حصہ (تقریباً ۸۰ فٹ کا) پانی کے نیچے رہتا ہے اسلئے

جب وہ کبھی سمندر کے گرم چشموں میں پونچ جاتے ہیں تو پگھلنے لگتے ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔

سمندروں کے متعلق یہ خیال کرنا۔ کہ کبھی وہ خشک ہو سکتے ہیں بالکل مہمل ہے۔ بعض کا خیال ہے۔ کہ سمندروں کا جتنا پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے، اتنا انہیں واپس نہیں ملتا۔ بعض کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ سمندروں کے پانی کے دباؤ سے کسی وقت زمین کا شق ہو جانا بھی ممکن ہے۔ ایک امریکن ماہر کا بیان ہے کہ ان بلورات کے لئے جو سمندروں کی تہ میں بنتے رہتے ہیں۔ پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنا پانی ان میں ہر سال صرف ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ سمندر کا پانی ہر سال دس انچ کم ہو رہا ہے۔ اور اس طرح گویا بارہ ہزار سال میں اسے خشک ہو جانا چاہیئے۔ لیکن آسٹریا کے ایک ماہر کی رائے اس کے خلاف ہے وہ کہتا ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ سمندروں کے پانی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اس لئے یہ خیال کہ کسی وقت سمندر خشک ہو جائیں گے۔ بالکل بے معنی ہے۔

کرۂ ارض کے پانی کی تقسیم جغرافیہ والوں نے مختلف سمندروں کے نام سے کی ہے۔ تین بڑی بڑی تقسیمیں یہ ہیں۔ بحر پاسفک۔ بحر اٹلانٹک۔ بحر ہند۔ بعض نے قطبین کے حصۂ آب کے بھی علیحدہ نام رکھے ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہ ہیں، انہیں تینوں سمندروں کے حصے۔

ان سمندروں میں بحر پاسفک سب سے بڑا اور بہت زیادہ گہرا سمندر ہے شمالاً جنوباً ۹۶۳۰ میل تک چلا گیا ہے۔ اور شرقاً غرباً ۱۰۶۰۰ میل تک۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۱۴۰۰۰ فٹ سے کچھ زائد ہے۔ ساحل جنوبی امریکہ کی طرف اسکی گہرائی ۱۸ ہزار سے ۲۵ ہزار فٹ تک دریافت ہوئی ہے۔ اور جزائر فلپائن کے پاس ۳۵ ہزار فٹ تک۔ یعنی اگر ایورسٹ کی چوٹی جو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے اِس حصۂ آب میں ڈال دی جائے۔ اور اس کے اوپر برطانیہ کا سب سے اونچا پہاڑ بن نوس (Ben Nevis) اٹھا کر رکھدیا جائے تو بھی دو ہزار فٹ پانی اُن کے اوپر نظر آئے گا۔ نیوزی لینڈ کے شمال مشرق اور جزیرہ گوام (Guam) کے قریب بھی جو جزائر فلپائن کے پاس ہے ۳۱ ہزار فٹ تک گہرائی دریافت کی گئی ہے۔

بحر پاسفک کا پچاسواں حصۂ ایسا ہے، جو ۲۲ ہزار فٹ سے زیادہ گہرا ہے۔ اور ایک چوتھائی سے زیادہ ۱۶ اور ۲۰ ہزار فٹ کے درمیان گہرا ہے۔

ایک مسافر جو شمالی افریقہ سے ہندوستان کی طرف سفر کرتا ہے۔ وہ بحر ہند میں اکثر یہ نظارہ دیکھتا ہے۔ کہ رنگین روشنیاں پانی کی موجوں سے کھیل رہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ جب برشگالی ہوائیں سمندر میں تموج پیدا کر دیتی ہیں۔ اور بڑی بڑی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں تو آفتاب کی روشنی ان میں یہ گل

کھلاتی رہتی ہیں۔

بحر ہند کی گہرائی کا اوسط ۱۳ ہزار فٹ ہے گویا بحر اٹلانٹک کی گہرائی کے اوسط سے ۱۲۰ فٹ زیادہ چھوٹے سمندروں میں آرکٹک کی گہرائی کا اوسط سب سے کم ہے یعنی ۴ ہزار فٹ بحر روم کی گہرائی کا اوسط اس سے ۱ ہزار فٹ زیادہ ہے سب سے چھچھلا پانی خلیج فارس کا ہے یعنی اوسطاً ۸۴ فٹ۔ بالٹک کا پانی اس سے دو چند گہرا ہے۔ اور انگلش چینل (نہر انگلستان) اس سے بھی کچھ زیادہ یعنی اوسطاً ۱۹۲ فٹ۔ بحیرۂ شمالی (North Sea) البتہ نسبتاً گہرا ہے اور اس کی گہرائی کا اوسط ۳۱۲ فٹ ہے۔

جس طرح ہم کو زمین پر پہاڑ اور وادیاں وغیرہ نظر آتی ہیں۔ اسی طرح سمندر کے اندر بھی موجود ہیں۔ بعض مقامات پر سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں پانی کے اوپر نکل آئی ہیں اور انہیں کا نام جزائر ہے چنانچہ جزائر گلاپگس (Galapagos) جو جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی طرف پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کوہ کی چوٹیاں ہیں جو آبنائے پناما سے جنوب مشرق کی طرف پانی کے اندر ہی اندر چلا گیا ہے۔

مغربی بحر پاسفک میں بکثرت جزائر پائے جاتے ہیں اور وہ سب کے سب سمندری پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ شمالی اٹلانٹک میں ایک سلسلہ کوہ ۱۲۰۰ فٹ کی گہرائی میں اندر ہی اندر چلا گیا ہے۔ جو اسکاٹ لینڈ کو آئس لینڈ

سے ملتا ہے۔ الغرض اسی طرح کے بہت سے سلسلے پہاڑوں کے پانی کے اندر پائے جاتے ہیں۔ شمالی اٹلانٹک میں سلسلۂ کوہستان بہ نسبت وسط اٹلانٹک کے کم پایا جاتا ہے۔ جہاں بعض پہاڑوں کا سلسلہ ... میل تک چلا گیا ہے۔

بحرِ ہند میں سماترا کے مغرب اور جاوا کے جنوب میں ایک متوازن سلسلہ پہاڑیوں اور وادیوں کا نہایت عجیب و غریب پایا جاتا ہے۔ پہلے ایک وادی مابین جزائر سماترا و متناوی پائی جاتی ہے۔ جو ماورا جاوا بارہ ہزار فٹ گہری ہے اور اسی کے متوازی ایک سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ اس کے بعد پھر دوسری وادی بالکل متوازی ۱۲ ہزار فٹ کی ملتی ہے اور پھر ایک سلسلہ کوہ اسی کے ساتھ ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔

سمندر کی سطح ساکن نہیں ہوتی اور اُس کا پانی ہمیشہ مدو جزر میں رہتا ہے اسی لئے اُس کا درجہ حرارت بھی ۲۴ گھنٹے میں ایک نہیں رہتا۔ دن میں ہوا کے ٹمپریچر کے مقابلہ میں اس کا ٹمپریچر ایک ڈگری زیادہ رہتا ہے۔ اور رات کو ڈیڑھ ڈگری گرم۔

سمندر کا پانی اپنی حرارت بالکل سورج سے حاصل کرتا ہے گو تھوڑی مقدار حرارت کی اندرون زمین سے بھی اسے پہنچتی رہتی ہے۔ سورج کی کرنیں کس

گہرائی تک اپنا کام کرتی ہیں اور وہ کس مقدار کی حرارت پانی میں پیدا کر سکتی ہیں۔ اس کا صحیح علم ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا لیکن ایک بار تحقیق سے یہ ضرور معلوم ہوا تھا کہ ایک صاف روشن دن میں جبکہ ہوا نہ تھی۔ ۶۵ فٹ کی گہرائی میں بحرِ روم کا پانی بہ نسبت سطح $\frac{1}{6}$ ڈگری زیادہ گرم تھا۔

سطح آب سے لیکر بارہ ہزار فٹ کی گہرائی تک سمندروں کا ٹمپریچر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس کے نتائج ایسے نہیں جن کی بنا پر کوئی کلیہ قائم ہو سکے۔ خطِ استوار پر واقع ہونے والا حصّہِ آب اور خطِ استوار سے ادھر اُدھر ہٹے ہوئے حصّہ میں سورج کی گرمی کا اثر ضرور مختلف ہوتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ اور مختلف موسموں میں اتنی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ کہ اس کی بنا پر کوئی اصول نہیں متعین کیا جا سکتا۔

گرمی کے زمانہ میں دنیا کا سب سے زیادہ گرم حصّہِ آب خلیج فارس ہے جس کا ٹمپریچر اس زمانہ میں ۹۶ ڈگری رہتا ہے بحرِ احمر (Red Sea) بھی تقریباً اتنا ہی گرم رہتا ہے یعنی ۹۴ ڈگری، خلیج بنگال اور اسی طرح خطِ استوار پر واقع ہونے والے بحرِ ہند کے اور حصّوں میں بھی بارش سے پہلے درجہ حرارت ۸۶ تک پہنچ جاتا ہے۔ جاپان کے شمال مشرقی حصّہِ آب کا ٹمپریچر بہت بدلتا رہتا ہے یعنی جب کم ہوتا ہے تو ۲۷ ڈگری تک گر جاتا ہے اور بڑھتا ہے تو ۸۳ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ وہاں زمین کے اندر سے کبھی گرم

چشمے اُبلتے ہیں اور کبھی سرد۔

سمندروں کے ٹمپریچر پر مقدار نمک کا اثر ہوتا ہے۔ یعنی جس حصۂ آب میں جتنا زیادہ نمک پایا جائیگا۔ اتنا ہی زیادہ سرد ہو گا۔

سمندر کا پانی خالص پانی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت سی اور چیزیں بھی ملی ہوئی ہیں۔ اس وقت تک دنیا میں ۹۰ عناصر دریافت ہوئے ہیں جن میں تیس سمندروں کے پانی میں ملتے ہیں یہاں تک کہ سونا اور چاندی بھی پانی میں موجود ہے لیکن اتنی کم مقدار میں کہ اس سے کوئی تجارتی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ نمک اور نمک والے عناصر البتہ اس میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بحر اٹلانٹک سب سے زیادہ نمکین سمندر ہے۔ اس کے بعد بحر ہند کا نمبر ہے۔ خط استوا پر واقع ہونے والے حصوں میں نمک زیادہ پایا جاتا ہے اور قطبین کے حصوں میں سب سے کم خلیج فن لینڈ اور بوتھنیا کا پانی نسبتاً بہت صاف ہے۔

سمندروں کے پانی کا نمک نکال کر اس کو پینے کے قابل بنانا آسان ہے اس کا طریقہ قدیم سیاحوں کو بھی معلوم تھا۔ اور اب تو خیر یہ عام بات ہو گئی ہے۔

سمندر کے پانی کو گہرے نیلے رنگ کا کہتے ہیں جو بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن شاید حقیقت یہ نہیں ہے۔ آپ اگر بلندی سے اس کو دیکھیں تو چمکیلا پانی

سبز نظر آئیگا جس کا سبب یہ ہے۔ کہ اس میں ریت ملی رہتی ہے۔ گہرے حصوں میں بھی بعض جگہ رنگ سبز نظر آتا ہے جس کا سبب ان بیشمار کیڑوں کا جھنڈ ہے جو چھوٹی مچھلیوں کی غذا کے لئے قدرت نے سمندروں میں پیدا کئے ہیں شمالی اٹلانٹک، اور بحر ہند و بحر پاسفک کے منطقۂ معتدلہ میں پانی کا رنگ عام طور پر واقعی نیلا نظر آتا ہے لیکن جتنا آپ قطب شمالی کی طرف بڑھتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ سبز ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ بحیرۂ شمالی کا پانی خالص سبز رنگ کا نظر آئے گا۔ بحر روم کا نیلگوں رنگ بہت مشہور ہے۔ لیکن صرف مشرقی حصہ کا، مغربی حصہ کا مائل بہ سبزی ہے۔ رنگ کا تعلق پانی کی صفائی سے بھی ہے یعنی پانی جتنا زیادہ صاف ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ نیلگوں نظر آئے گا۔ پانی کی صفائی دیکھنے کے لئے سفید رنگے ہوئے گول توے، اندر ڈالے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ نظر نہ آئیں۔ چنانچہ اس طریقہ سے سرگاسو ([illegible]) سمندر کا پانی بہت زیادہ شفاف معلوم ہوا ہے کیونکہ سات فٹ قطر کا توا ۲۱۶ فٹ کی گہرائی میں بھی وہاں صاف نظر آتا ہے۔ برخلاف اس کے بحر شمالی میں ۶۰ اور ۱۰۰ فٹ کے درمیان ہی نظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کے اندر کرنوں کے نفوذ کا بھی تجربہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ بحر روم میں بارہ سو فٹ تک روشنی کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر بیب (Beebe) نے ایک خاص آلہ کے ذریعہ سے ساحل برمودا کے قریب تک پہنچنے کی کوشش کی

تھی۔ تو دو ہزار فٹ کے بعد ان کو سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

لہروں کی پوری ضخامت و قوت کا اندازہ بھی کھلے ہوئے سمندروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی بڑی سی بڑی جھیل ایسی نہیں ہے۔ جہاں لہریں اپنی قوت کے ساتھ اُٹھ سکیں۔ بحر اٹلانٹک۔ بحر ہند۔ اور بحر پاسفک میں چونکہ ہوا بہت زور سے چلتی ہے۔ اس لئے وہاں موجوں کی پوری قوت کے ساتھ اُٹھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ مشہور ہے۔ کہ سمندر کی لہر پہاڑ کی طرح اُٹھتی ہے۔ اور وہ واقعی ایسی ہی معلوم بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ جب مسلسل اونچی اُونچی لہریں اُٹھتی ہیں اور پانی کے تھپیڑوں سے جو چھینٹے اُڑ اُڑ کر آتے ہیں۔ ان کے اندر سے سامنے کی فضا دھندلی ہو جاتی ہے۔ اور لہروں کی بلندی پہاڑ ہی کی طرح نظر آتی ہے۔ طوفان کے وقت لہروں کی بلندی عموماً چالیس سے پچاس فٹ ہوتی۔ گو کبھی کبھی طوفانی حالت میں وہ ستر فٹ تک پہنچ جاتی ہے ورنہ یوں سکون کی حالت میں اس کی بلندی ۲۰ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اگر ہوا کا رُخ بھی وہی ہو جو سمندر کے ہیجان کا ہے اور اس کی رفتار زیادہ ہو تو لہروں کا تسلسل بہت بڑھ جاتا ہے لہروں کی قوت ڈھلوان ساحلوں پر بہت بڑھ جاتی ہے۔ بحر اٹلانٹک اور بحر شمالی میں لہروں کا دباؤ فی مربع فٹ $2\frac{1}{2}$ ٹن دریافت کیا گیا تھا۔ حالانکہ سڑک کو کوٹنے والے رولر کا دباؤ فی مربع فٹ ایک

ٹن کے قریب ہوتا ہے

سمندر کی تباہ کاریاں تو ظاہر ہی ہیں لیکن اس کا ایک تعمیری پہلو بھی ہے۔ ۳۵ سال کے عرصہ میں برطانیہ کی ۶۶۴۰ ایکڑ زمین اگر دریا برد ہوئی تو ۴۸ ایکڑ زمین دوسری جگہ سمندر نے دے بھی دی۔

سمندر کے اندر جتنی دولتیں پنہاں ہیں۔ ان کا اندازہ مشکل ہے لیکن سب سے بڑی دولت اس کا مگنیشیم ہے۔ یہ ایک چمکدار دھات ہے جس کی چادریں، سلاخیں، اور ستون وغیرہ بن سکتے ہیں اور نئی دنیا نے یہ امیدیں قائم کی ہیں کہ آئندہ تمام مکانوں کی تعمیر اسی دھات سے ہوگی۔ اور کرۂ زمین ان تعمیروں سے جگ مگ جگ مگ کرنے لگے گی۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ جو اشیا سمندر میں پائی جاتی ہیں ان کے $\frac{1}{25}$ حصہ سے ۶۰ لاکھ ٹن مگنیشیم گیارہ کروڑ ستر لاکھ ٹن نمک، ۹ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن چاندی، ۲۰ لاکھ ٹن سونا حاصل ہو سکتا ہے۔ مونگا بھی سمندر کی بڑی دولت ہے جس کا علم عہد قدیم کے انسان کو بھی تھا۔ اور موتی کی قدر و قیمت تو خیر سبھی کو معلوم ہے۔

بعض چھوٹے چھوٹے سمندر ایسے ہیں۔ جن کے چاروں طرف خشکی کا حصہ ہوتا ہے۔ اور اصطلاح میں ان کا نام بحرِ محاط (Island Sea) ہے اس قسم کے سمندروں میں سب سے بڑا بحر اخضر (Caspean Sea) ہے

جس کا رقبہ ایک لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے۔ ان کو ہم ایک لحاظ سے جھیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ جھیلیں پہاڑوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایورسٹ کی چوٹی پر بھی ایک جھیل ہوائی جہاز سے دیکھی گئی ہے لیکن وہاں تک کوئی پونچ نہیں سکا۔ یہ جھیل بہت چھوٹی ہے، مگر بڑی جھیلوں میں سب سے اونچی جھیل ٹٹی کاکا ہے۔ جو جنوبی امریکہ کے پہاڑ میں سطح آب سے ۱۲۵۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ بعض جھیلیں ایسی ہیں جو سطح آب سے بہت نیچے واقع ہیں۔ ان میں بحرِ مُردہ (Dead Sea) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ یہ سمندر کی سطح سے ۱۲۹۲ فٹ نیچے واقع ہے

گہری جھیلوں میں سب سے زیادہ مشہور سائبیریا کی بیکال جھیل ہے جس کی گہرائی کا اوسط ۲۳۰۰ فٹ ہے لیکن بعض جگہ اس کی گہرائی اس سے دو چند ہے۔ افریقہ کی جھیل ٹنگانیکا دُنیا کی سب سے لمبی جھیل ہے۔ جو ۴۵۰ میل تک چلی گئی ہے اور گہری بھی بہت ہے یعنی بعض مقامات پر اس کی گہرائی ۴۷۰۰ فٹ ہے۔

یورپ کی سب سے بڑی جھیل لڈوگا ہے جو روس اور فن لینڈ کے درمیان سرحد پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ سات ہزار مربع میل ہے لیکن گہرائی بہت کم ہے یعنی صرف ۷۳۰ فٹ۔

سب سے بڑا دریا دنیا کا وہ ہے جو مسوری (missouri) اور مسس پی (mississippi) سے مل کر بنتا ہے۔ یہ امریکہ میں واقع ہے اور اس کی

لمبائی چار ہزار دو سو میل ہے۔

اس دریا سے ۱۲۵۰۰۰۰ مربع میل زمین میں آبپاشی ہوتی ہے جو امریکہ کا ایک تہائی حصّہ ہے دریائے امیزن بھی چار ہزار میل کا لمبا دریا ہے اور اس سے ۲۷۲۲۰۰۰ مربع میل زمین سیراب ہوتی ہے یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ ۲۳۰۰ میل تک اس میں بڑے بڑے جہاز چلے جاتے ہیں اور ۵۰۰ میل تک چھوٹے جہاز۔ اس کی گہرائی کا اوسط ۲۰ فٹ ہے۔ بارش کے زمانہ میں اس کا پاٹ کہیں کہیں ۵۰۰ میل کا ہو جاتا ہے۔ اس کا دہانہ ۲۰۰ میل چوڑا ہے۔ دریائے نیل بھی دُنیا کا نہایت مشہور دریا ہے۔ یہ ۲۴۵۰ میل لمبا ہے لیکن رقبہ آبپاشی بہت کم ہے۔

بعض دریا ایسے بھی ہیں جو اپنا راستہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً مسس پی یا شمالی چین کا یلو ریور (Yellow River) بعض ایسے دریا بھی ہیں جو سمندر میں نہیں گرتے۔ ان میں وسط ایشیا کا دریائے تارم بہت مشہور ہے۔

دُنیا کی سب سے اونچی آبشار امریکہ کی ذِنی زولا ہے۔ یہ ایک میل کی بلندی سے گرتی ہے۔ اور اتنا شور پیدا کرتی ہے۔ گویا ہزاروں گھنٹے بجائے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں آبشار جوگ جو (Western Ghats) میں واقع ہے ۹۶۰ فٹ کی بلندی سے گرتی ہے۔ برٹش گائنا کی ایک آبشار ۸۲۲

فٹ کی بلندی سے گرتی ہے اور ۱۴ فٹ تک۔ تو بالکل عمودی شکل میں گرتی ہے۔
چوڑی آبشاروں میں امریکہ کی نیاگرا بہت مشہور ہے جس کی چوڑائی چار ہزار فٹ ہے۔ اس کے بعد افریقہ کی آبشار وکٹوریا ہے۔

(فروری ۴۰ء)

دُنیا کی سب سے بڑی دُوربین

دُنیا میں سائنس کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا مطالعہ انسان کیلئے باعثِ حیرت نہ ہو، لیکن فلکیات کا مطالعہ تو انسان کو سراپا استعجاب بنا دیتا ہے۔ اس علم کے مقادیر یا اندازے اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ ان کو سُن کر سر چکرانے لگتا ہے۔ فلکیات میں ریاضی کے اعداد و شمار بالکل بیکار ہیں کیونکہ اس میں خیالِ انسانی سے بھی بلند ایسے فاصلوں سے بحث کی جاتی ہے۔ جہاں انسان کا مقرر کیا ہوا کوئی اندازہ کام نہیں دے سکتا۔

چاند ہماری زمین سے ۲۴۰۰۰۰ میل کی دوری پر واقع ہے اور یہ فاصلہ ایسا ہے۔ جسے ہم سمجھ سکتے ہیں۔ گویا اگر ہم زمین کے گرد نو یا دس مرتبہ چکر

لگالیں تو گویا اتنا ہی فاصلہ طے کرلیا۔ لیکن سورج اس فاصلہ سے ۴۰۰ گنا زیادہ دور واقع ہے اور یہ دوری اتنی ہے کہ ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے کیونکہ انتہائی سرعت رفتار پر قابو پا لینے کے بعد بھی کرہ زمین کے گرد ۳۵۰۰ مرتبہ چکر لگانے کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آفتاب کا قریب ترین فاصلہ زمین سے اندازاً ۹۲۹۰۰۰۰۰ میل ہے اور فلکیات میں یہ فاصلہ صرف اکائی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعہ سے ہم فضا کے دوسرے ستاروں کی دوری معلوم کرتے ہیں۔ ورنہ نظام شمسی سے ماوراء تو یہ اکائی بھی بیکار ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ فضا کے سمندر میں تو ہمارا نظام شمسی بھی ایک قطرہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

روشنی جس کی رفتار ۱۸۶۳۲۶ میل فی سیکنڈ ہے آٹھ منٹ میں سورج سے زمین تک پہنچتی ہے اور اسی روشنی کی رفتار کو معیار قرار دیکر ستاروں کے بعد کو ظاہر کیا جاتا ہے یعنی اگر کسی ستارے کی روشنی اسی رفتار سے ہم تک ایک سال میں پہنچتی ہے تو کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں ستارہ ہم سے ایک نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یعنی اگر ہم اعداد کی صورت میں اس فاصلہ کو ظاہر کریں تو تقریباً ۵۸۸۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ میل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ فاصلہ بھی ذہن انسانی کی سمجھ سے باہر ہے چہ جائیکہ ان ستاروں کا فاصلہ جن کی روشنی سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔ اور ان کو تو ہم اعداد میں ظاہر ہی نہیں

سکتے۔ اسی لئے فلکیات میں دوری کی پیمائش، روشنی کی رفتار یا نوری سال سے کی جاتی ہے۔

ماہرین فلکیات کی تحقیق ہے۔ کہ زمین سے قریب ترین سیارہ (Proxima Centauri) (قنطورس) ہے جس کی روشنی ۴ ۱/۴ سال میں ہم تک پہنچتی ہے۔ اور بعید ترین سحابی کرہ جسے ہم آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ (Andromeda) (المراۃ المسلسلۃ) ہے جس کی روشنی ہم تک ۹ لاکھ سال میں پہنچتی ہے۔ لیکن یہ بعد بھی فضا کی وسعت کے لحاظ سے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

آپ کہکشاں کو روز رات کے وقت دیکھتے ہیں لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ مجموعہ ہے۔ لاکھوں سیاروں کا جن میں سے ایک نہایت حقیر سیارہ ہمارا آفتاب بھی ہے۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ آفتاب کہکشاں کے وسط میں اس سے قریب واقع ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے۔ کہ کہکشاں کے مرکز سے وہ دو کروڑ یا اس سے زیادہ پانچ کروڑ نوری سال کے فاصلہ پر پایا جاتا ہے ایک شخص کو حیرت ہوگی۔ کہ یہ تمام باتیں کیونکر معلوم ہو سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ دوربین کی ایجاد سے انسان نے فضا کی وسعت، پر بہت کچھ قابو حاصل کر لیا ہے۔

۱۹۳۷ء میں ایک ایسے سدیم یا سحابیہ[۱] (Nebula) کے انخلال[۲] نور کی تصویر لی گئی جو زمین سے ۸ کروڑ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ تصویر رصدگاہ جبل ولسن (کیلی فورنیا) سے لی گئی تھی۔ اور دنیا کی اس سب سے بڑی دوربین کی مدد سے جس کا شیشہ ۱۳ انچ موٹا اور نو ہزار پونڈ وزنی تھا۔ اور جس کا قطر سو انچ کا ہے۔

اگر دوربین کی ایجاد نہ ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ انسان فضا کے حالات سے بالکل بے خبر ہوتا۔ کیونکہ آنکھ سے ہم کو بہت کم ستارے نظر آتے ہیں ۱۹۳۸ء میں ۳۵ سال کی کاوش و محنت کے بعد امریکہ کے ماہر فلکیات نے جو فہرست تیار کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے ہر حصہ سے دیکھنے کے بعد زیادہ دس ہزار ستارے آنکھ سے نظر آتے ہیں اور چھوٹی دوربین کی مدد سے ۴۲۳۰۳ دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ تعداد تمام فضا کے اندر پھیلے ہوئے سیاروں کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں ہے۔

گلیلو اور سر اسحاق نیوٹن کے بعد سے جو ترقی دوربین میں ہوئی ہے وہ بہت ہی شاندار ہے اس وقت دو قسم کی دوربین پائی جاتی ہے ایک Refractor (عاکس) دوسری Reflector

---

[۱] اس سے مراد وہ سیارہ ہے جو نہایت گرم گیس یا دھویں کی حالت میں پایا جاتا ہے اور اس میں انجماد کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔

[۲] مثلثی شیشے کے ذریعے دیکھئے تو روشنی مختلف رنگوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اسی کو انخلال نور کہتے ہیں

(کاسمر) دوسری قسم کی دوربین میں ایک چیز کا عکس براہ راست دوربین کے شیشہ پر حاصل کیا جاتا ہے۔ جو ایک چھوٹے (Lens ....

(عدسہ) کے ذریعہ سے بہت بڑا ہوکر نظر آتا ہے۔ اور پہلی قسم کی دوربین میں روشنی ایک بڑے مقعر (Concave) شیشے سے گزر کر بہت سے چھوٹے چھوٹے عدسات پر پڑتی ہے اور یہ شیشہ جتنا بڑا ہوتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ روشنی حاصل ہوتی ہے اسی لئے آجکل جتنی دوربینیں استعمال ہوتی ہیں۔ وہ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے ذریعہ سے دور کی بہت سی چیزیں جنہیں آنکھ نہیں دیکھ سکتی نظر آجاتی ہیں۔ چنانچہ ولسن رصدگاہ کی سو انچ شیشہ والی دوربین سے جس سدیم کی تصویر لی گئی وہ ۸ کروڑ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے اس قسم کی دوربین سے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا۔ کہ اگر کسی وقت تو دو سو انچ قطر شیشہ کی کوئی دوربین تیار ہو گئی۔ تو فضائے بسیط کے بہت سے راز ظاہر ہو جائیں گے لیکن چونکہ اتنی بڑی دوربین کی تیاری میں کم از کم ۳۰ لاکھ پونڈ کا صرف تھا۔ اس لئے عرصہ تک اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔ تاہم ایک وقت آگیا کہ ایسی دوربین تیار ہوئی۔ جو فلکیات کا علم کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔

دوربینوں کی ترقی

ایک صدی پہلے جو دوربین تیار کی گئی تھی۔ اس کا شیشہ صرف ۱۵ انچ قطر کا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں ۲۰ انچ قطر کی دوربین تیار کی گئی۔ ۱۸۸۷ء میں ۳۶ انچ قطر کا شیشہ بنایا گیا۔ درسنہ ۱۸۹۷ء

میں ۴۰ انچ قطر کا۔

عاکس قسم کی دُوربین البتہ اس سے زیادہ قوی تیار ہوئیں چنانچہ سر ولیم ہرشل (William Herschel) نے ۱۷۸۹ء ہی میں ۴۸ انچ کا شیشہ تیار کر لیا تھا۔ لیکن اس نے یہ راز کسی پر ظاہر نہ کیا کہ اس نے اتنا بڑا شیشہ کس طرح ڈھالا اور اس پر پالش کیونکر کی۔ اس کے ۶۰ سال بعد آئرستان کے ایک ماہر فلکیات ولیم پارسنز (William Parsons) نے ۷۲ انچ قطر کا شیشہ بنایا اور تقریباً ۸۰ سال تک یہ اس سے بڑی دُوربین کسی نے تیار نہ کی۔ لیکن چونکہ دُوربین کی تیاری میں برابر کوششیں جاری تھیں۔ اسلئے آخر کار رصدگاہ ولسن کی وہ دُوربین تیار ہوئی جس کا شیشہ ۱۰۰ انچ قطر کا ہے اس شیشے کی تیاری میں ۱۲۵۰۰۰ پونڈ صرف ہوئے ہیں۔ اور تقریباً نو سال میں تیار ہوا ہے۔ اس کی بڑائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا وزن ساڑھے چودہ ٹن ہے۔ بڑے بڑے پیپے جو پارہ بھرے ہوئے حوض میں تیر رہے ہیں اس کے وزن کو سنبھالے ہوئے ہیں اور ۵۰ موٹر اس کو حرکت میں لانے کے لیئے رصدگاہ میں لگائے گئے ہیں۔

ہر چھ مہینے کے بعد اس کا شیشہ نکال کر اس پر چاندی کی پالش کیجاتی ہے۔ کیونکہ روشنی کے اثر سے چاندی کی پالش جلد خراب ہوجاتی ہے۔ اور شیشہ اچھی طرح کام نہیں دیتا۔ یہ شیشہ پہلے چاندی کے تیزاب سے صاف

کیا جاتا ہے اور پھر اس پر پالش کی جاتی ہے۔ اس شیشے کو اتارنے چڑھانے کیلئے ایک زبردست (Hydraulic Jack) سے کام لیا جاتا ہے۔ جو موٹر کے ذریعہ سے چلتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتنا بڑا شیشہ ڈھالنا یا اس میں دو چار انچ کا اضافہ کر دینا مشکل بات نہیں لیکن اس کو ایک ماہر فلکیات ہی سمجھ سکتا ہے کہ اتنے بڑے دوربینی شیشے کا تیار کرنا کس قدر دقت طلب ہے۔

رصدگاہ ولسن کی دوربین کا شیشہ ڈھالنے میں آٹھ مرتبہ ناکام رہنے کے بعد نویں مرتبہ کامیاب ہوا۔ اور یہ کام اتنی مصیبتوں کے بعد پورا ہوا کہ شیشہ ڈھالنے والوں نے کہدیا کہ اس سے بڑا عدسہ تیار کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ماہرین فلکیات کا تقاضا اس سے بڑے شیشے کے لئے برابر جاری رہا۔

اس دوربین کے ذریعہ سے ۵۰ء۴ ملین نوری سال کی دوری پر واقع ہونے والے سیارے نظر آ سکتے ہیں اور ایک ارب ۵۰ لاکھ ستارے تصویر کشی کے حد میں آ گئے ہیں لیکن ماہرین کا خیال ہے کہ فضائے بسیط ہی کا قطر ۶ ارب نوری سال کے فاصلہ کا ہے۔ جس میں کم از کم ۳۰ ارب ستارے پائے جاتے ہیں اور ان کے دیکھنے کیلئے یہ دوربین بھی کافی نہیں۔ آخر کار برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے ماہرین نے ملکر ایک ایسا نقشہ تیار کیا۔ جس کا شیشہ ۲۰۰ انچ قطر کا ہو اور جبل ولسن کی دوربین سے وزن میں چوگنا ہو۔ صرف کا اندازہ ۱۲ لاکھ

پونڈ کیا گیا۔ اور امریکہ کے ایک کارخانہ کو یہ کام سپرد کر دیا گیا۔

اس کام کے ابتدائی اہتمام میں دو سال لگ گئے اور اول اول تین شیشے ۳۰، ۶۰، اور ۱۲۰ انچ کے تجربہ کے طور پر ڈھالے گئے۔ اور جب اطمینان ہو گیا تو پھر ۱۹۳۴ء میں اس بڑے شیشے کے ڈھالنے کا کام شروع ہوا۔

ایک بڑی بھٹی ۳۰ فٹ قطر کی برابر دس دن تک گرم کی گئی اور اس میں چالیس ٹن کانچ معہ دوسری اشیاء کے تین ہفتہ تک ۲۸۰۰ ڈگری کی حرارت پہنچا کر گلایا گیا۔

۲۵ مارچ اس کے ڈھالنے کی تاریخ مقرر تھی۔ اس تاریخ میں چھ ہزار آدمی اس کام کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے اور دنیا کا کوئی مقام ایسا نہ تھا۔ جہاں کے ماہرین فلکیات اس کے دیکھنے کے لئے فراہم نہ ہوئے ہوں۔

آخر کار سگنل دیا گیا اور چار آدمیوں نے ایک بڑا ڈویا جس میں ۴۰۰ پونڈ وزن کا پگھلا ہوا شیشہ آسکتا تھا۔ بھٹی میں ڈالا گیا۔ اور پگھلا ہوا شیشہ نکال کر ایک نہائیت گرم ہنڈے میں ڈالا گیا۔ یہ ہنڈا ایک ٹرالی کے ذریعہ سے سانچہ تک لے جایا گیا۔ جو خود بھی انتہائی گرمی کی وجہ سے سفید تھا۔

دس گھنٹہ تک یہ کام برابر جاری رہا۔ ہر پانچ یا دس منٹ کے بعد پگھلا ہوا شیشہ سانچہ میں ڈالا جا رہا تھا۔ اور سب اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے۔ کہ دفعتہً سانچہ میں شگاف پیدا ہو گیا۔ ہر چند انجینیروں نے فوراً اس شگاف کو بھر دیا۔ پھر بھی

نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ اس سے کیا نقص پیدا ہو جائیگا۔ بہر حال کام برابر جاری رہا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی طے کیا گیا۔ کہ دوسرا سانچہ بنا کر ایک اور شیشہ ڈھالا جائے پہلا شیشہ سات مہینے کے بعد (اکتوبر میں) سانچہ سے نکالا گیا۔ لیکن وہ اب بھی گرم تھا۔ چونکہ شیشہ کو آہستہ آہستہ ٹھنڈا کرنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے سانچہ کا درجۂ حرارت صرف ایک ڈگری روز کم کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ چھونے کے قابل ہو گیا۔

جس وقت دوسرا شیشہ ڈھالا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی ایک حادثہ پیش آگیا۔ یعنی سیلاب آگیا۔ اور کارخانہ کی کھڑکیوں تک پانی آگیا۔ لیکن خیر کسی نہ کسی طرح پانی کو اندر آنے سے روکا گیا۔ اور کام ختم ہو گیا۔

جب شیشہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تو اس کو فولادی شہتیروں میں پیک کر کے اسپیشل ٹرین کے ذریعہ سے براہ نہر پناما کیلی فورنیا بھیجا گیا۔ جہاں ایک خاص کارخانہ اس کے صیقل وغیرہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

اس شیشہ کے گھسنے، رگڑنے اور صیقل کرنے کا کام تین سال میں ختم ہو گا کیونکہ رگڑ کی گرمی سے اس کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے اور یہ کام بہت آہستہ آہستہ ہو گا۔ اس غرض کے لئے ایک خاص مشین تیار کی گئی ہے۔ جو ۴۰ فٹ لمبی ۲۰ فٹ اونچی اور ۰۰ ٹن وزنی ہے۔ گھسنے والا آلہ بالکل شیشہ کی تاب کا ہے اور ہر گردش میں ایک انچ کے دس لاکھویں حصّہ سے زیادہ نہیں گھستا کہا جاتا ہے

کہ جب یہ کام ختم ہو جائیگا۔ تو دو ٹن وزن شیشہ کا کم ہو جائے گا۔ اس شیشے کے پیچھے ایک المونیم کی تڑپ بھی لگائی جائے گی۔ جو ایک انچ کے ۴ لاکھویں حصہ سے زیادہ دبیز نہ ہوگی۔

جب یہ تمام مراحل ختم ہو جائیں گے۔ تو پھر اس شیشہ کو پالومر پہاڑ کی رصدگاہ میں لے جائیں گے جہاں وہ دوربین میں نصب کیا جائے گا۔

یہ دوربین ستر فٹ لمبی ہے اور ۲۰ فٹ کا قطر رکھتی ہے اس کا وزن شیشہ کو ملا کر ۱۰۰ پونڈ ہوگا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جبل ولسن کی دوربین سے اس کی قوت دو چند ہوگی یعنی اگر زمین کا محدب حصہ بیچ میں حائل نہ ہو۔ تو پالومر سے نیو یارک کی تمام عمارتیں نظر آئیں گی (جو تین ہزار میل دور ہیں)

جبل ولسن کی دوربین سے چاند کی وہ چیزیں نظر نہیں آئیں جن کا قطر ۲۰۰ فٹ سے کم ہے۔ لیکن اس دوربین کی مدد سے ۳۰ فٹ قطر کی چیزیں بھی نظر آئیں گی۔ گویا چاند جو دو لاکھ ۲۰ ہزار میل دور ہے اس کا فاصلہ ہم سے صرف ۲۰ میل رہ جائیگا۔

خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اس دوربین کی مدد سے اس امر کا بھی فیصلہ ہو جائے گا کہ سیارہ مریخ میں جاندار اشیاء پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اور سورج کے متعلق بھی یہ معلوم ہو سکے گا کہ آیا اس کے انفجار (پھٹ کر ابل پڑنے

کا امکان ہے یا نہیں۔

نگار، نومبر سنہ ۴۰ء



علم الافلاک کے بعض دلچسپ حقائق

سیاروں میں امکان آبادی پر علمی گفتگو

کہا جاتا ہے کہ جس کائنات سے ہمارا تعلق ہے اس کا سمجھنا ایک شئی محال کا سمجھنا ہے تاہم چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کرۂ ارض آباد ہے اس لئے یہ غور کرنا کہ ہمارے ساتھ جو دیگر سیارے آفتاب کے گرد گھومتے ہیں ان میں بھی آبادی ہے یا نہیں۔ اور جس طرح ان جھلملاتے سیاروں کی رنگا رنگ روشنی سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں اسی طرح وہاں کی آبادی ہمارے سیارہ کی تنویر سے لطف اٹھاتی ہے یا نہیں، بالکل فطری امر ہے۔

تقریباً دو ہزار چار سو برس گذرے کہ یونان کے حکماء عظام میں سے ایک شخص حکیم اناکشا غورث (Anaxaguras) نے یہی سوال

کیا تھا کہ "کیا ہماری دنیا کے علاوہ اور بھی آباد دنیائیں موجود ہیں" اور ہر چند اس قسم کا سوال اس وقت کرنا نہ صرف خطرناک بلکہ "ملحدانہ" سمجھا جاتا تھا کیونکہ تمام اجرام سماوی دیوتاؤں اور دیویوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ باانیہمہ۔ اناکسا غورث نے جرأت و جسارت سے کام لیکر یہ سوال اُٹھایا۔ اور خود ہی اس کا جواب اثبات میں دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حکیم دیمو قریطس (Democritus) نے بھی جرأت سے کام لے کر یہی بیان کیا۔ کہ اس لانہایت فضا میں صرف ہماری ہی دنیا کا وجود نہیں ہے۔ بلکہ بیشمار سیارے ایسے موجود ہیں جو دور دراز کے نظامہائے شمسی کے ارکان ہیں اور ان میں ایسی مخلوق آباد ہے۔ جو ہم سے اعلیٰ عقل و فہم کی مالک ہے۔ لیکن چونکہ دیمو قریطس ملک آلو نینا میں رہتا تھا۔ جو بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر یونان کی ایک خوشحال اور آزاد خیال نو آبادی تھی۔ اس لیئے اس کے اس بیان پر کوئی جرم قائم نہیں کیا گیا۔ البتہ حکیم اناکسا غورث کی حالت بالکل جداگانہ تھی وہ آزاد خیال آلو نینا میں نہیں بلکہ اتھنز میں رہتا تھا۔ اس لیئے اُسے فوراً پابزنجیر کر کے بحیثیت ملزم عدالت کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ مقدمہ چلا۔ جرم ثابت ہوا۔ اور مجرم کے لیئے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا گیا۔ لیکن ابھی اناکساغورث قیدخانہ کے اندر پڑا ہوا شمشیر جلاد کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ کہ اُسے فرار ہو جانے کا موقعہ مل گیا۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں راہب جیورڈانو برونو کے متعلق بھی اسی قسم کا فتویٰ صادر

ہوا کہ پاپائے اعظم کے قصر کے نیچے اس ملحد کو زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ وہ زندہ جلا دیا گیا۔ لیکن جہاں وہ جلایا گیا تھا۔ اسی جگہ "ملحد" کی ایک شاندار یادگار قائم ہے جس نے حقیقت و صداقت کی قربان گاہ پر اپنی جان قربان کی تھی۔ اس مظلوم راہب پر علاوہ الحاد کے ایک الزام یہ بھی عائد کیا گیا تھا۔ کہ دنیائے ارضی کے علاوہ کائنات میں اور بہت سے سیاروں کو بھی آباد بتاتا تھا۔ لیکن آج ہم کس قدر خوش قسمت ہیں کہ نہایت آزادی کے ساتھ پھر وہی پرانا سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا سیارے آباد ہیں؟ اور ہمارا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔

اس وقت ہر شخص جانتا ہے کہ کرۂ ارض اور آٹھ دوسرے بڑے بڑے سیاروں تک روشنی و حرارت پہنچنے کا کوئی ذریعہ سوائے آفتاب کے نہیں ہے جس کے گرد علاوہ نو بڑے بڑے سیاروں کے ۲۶ قمار (Satellites) تقریباً ایک ہزار سیارچے (Asteroids) بے شمار شہاب ثاقب لاتعداد دمدار ستارے گردش کرتے رہتے ہیں آفتاب ایک روشن و منور کرہ ہے جس کا قطر ۸۶۵۰۰۰ یعنی زمین کے حجم سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا۔ زمین کے قطر کا اوسط ۷۹۱۶ میل ہے۔ رقبہ انیس کروڑ ستر لاکھ مربع میل اور حجم دو کھرب ساٹھ ارب مکعب میل اور اس کا وزن . . . . ۶۵۰۰ ٹن ہے (ایک ٹن۔ تقریباً ۲۸ من) زہرہ کا وزن زمین کے وزن

سے باندازہ ۲/۵ زیادہ ہے اور عطارد کا وزن زمین کا صرف ۱/۲۴ ہے وزن وحجم کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کسی سیارہ کا وزن ایک مقررہ مقدار سے کم ہوگا۔ تو ہم سمجھیں گے کہ (بذریعہ کششِ ثقل) ایسا کرہ ہوائی اپنی گرفت میں رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ جو ذوی الارواح کے تنفس کے لئے ضروری ہے یہی باعث ہے کہ چاند جس کا وزن زمین کے وزن کا صرف ۱/۸۰ ہے۔ اپنے لطیف ذراتِ ہوا زائل کر چکا ہے۔ اور ناقابل آبادی ہو گیا ہے۔ یہی حال کرۂ مریخ کا ہے کیونکہ وہ کرۂ زمین سے بقدر ۱/۹ کم ہے۔ مگر مشتری، زحل، یورانس اور نیپچون کے متعلق یہ سوال نہیں ہوتا۔ اور یورانوس تو اتنا بڑا سیارہ ہے۔ کہ اگر وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا تو اس کے اندر پندرہ کرۂ زمین سما سکتے تھے۔

عطارد جس کا مدار آفتاب سے بہت قریب ہے۔ تمام سیاروں سے چھوٹا سیارہ ہے یعنی اس کا قطر صرف تین ہزار میل ہے اور مدار آفتاب سے اس کا اوسط فاصلہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے۔ یعنی جو فاصلہ آفتاب اور کرۂ زمین کے درمیان ہے اس سے یہ فاصلہ بقدر ۳/۸ کے کم ہے اس پر حرارت آفتاب کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

زہرہ جس کا مدار عطارد و زمین کے درمیان واقع ہے آفتاب سے

چھ کروڑ بہتر لاکھ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے جو زمین کے فاصلہ سے باندازہ ½ قریب ہے۔ اس لئے اس سیارہ کی سطح پر ہماری زمین سے تقریباً دو چند طاقت شمسی کا نزول ہوتا ہے۔ مگر چونکہ زہرہ اس طاقت شمسی میں سے بقدر ۵۹ فیصدی واپس کر دیتا ہے۔ اس لئے اس کی سطح پر زمین سے زیادہ گرمی نہ ہوتی ہوگی۔

سیارہ مریخ کا قطر زمین کے نصف قطر سے کچھ یونہی یعنی تقریباً ۴۲۰۰ میل زیادہ ہے۔ اور جس کا مدار اس کے مرکز نور و حرارت سے ۱۴۱۵۰۰۰۰۰ میل (یعنی ہماری زمین سے ۵۰ فیصدی زیادہ) ہے اس لئے حسب اصول ریاضیات فلکی اس سیارہ کو بہ نسبت زمین کے طاقت شمسی کا ⅖ حصہ ملتا ہے۔

سیارہ مشتری ہمارے نظام شمسی کا ایک عظیم الشان سیارہ ہے یہ زمین سے حجم میں تیرہ سو گنا بڑا ہے اور آفتاب سے ۴۸ کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ فاصلہ زمین و آفتاب کے فاصلہ کا پانچ گنا ہے۔

زحل اور آفتاب کے درمیان اس سے دو چند فاصلہ (یعنی ۸۸ کروڑ ۶۰ لاکھ میل ہے) زحل اور یورانوس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جس قدر زحل اور آفتاب کے درمیان۔ اس کے بعد اگر ہم نیپچون تک پہنچنا چاہیں، تو

ہم کو ایک ارب میل کا فاصلہ اور طے کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ سیارہ آفتاب کے گرد ۲۷۹۰۰۰۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر گردش کرتا ہے۔ اس عدد کو اگر دو سے ضرب کر دیا جائے تو ہمارے نظام شمسی کا قطر معلوم ہو جائے گا۔

مگر ابھی اس قیاس کے قوی اسباب موجود ہیں کہ ملاء نیچون سے آگے بھی ابھی کچھ سیارے اور موجود ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ نیچون کے آگے سب سے پہلا سیارہ زمین و آفتاب کے فاصلہ سے بقدر چوالیس گنا دور ہوگا۔ ان سیاروں کا علم اتفاق سے ہو جائے تو ہو جائے ورنہ یوں ممکن نہیں۔ کیونکہ پہلے ہی سیارہ کی حرکت فلکی سورج کے گرد ۲۹۰ سال میں ختم ہوتی ہوگی۔ اور ان کی حرکت اس قدر سست ہوگی کہ فوٹو کے پلیٹ پر بھی کوئی نشان نہ چھوڑ سکے گی۔ خود نیچون آفتاب کے گرد ۱۶۵ سال میں ایک گردش کرتا ہے اور اس کی رفتار فلکی ۳۷ر۳ میل فی سیکنڈ ہے یہ سیارہ ۱۸۴۶ء سے پہلے دریافت نہ ہو سکا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ آفتاب سے نیچون کا اوسط فاصلہ ۲۷۹۰۰۰۰۰۰۰ میل ہے یعنی اگر ہم ٹرین یا موٹر میں ایک میل فی منٹ کی رفتار سے سفر کریں اور مسلسل اسی رفتار سے چلتے رہیں تو پانچہزار سال میں اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکیں گے

اگر ہم اپنا یہ سفر جاری رکھیں کہ قریب ترین ثابت تک پہنچنا چاہیں (جن ستاروں کو ثوابت کہا جاتا ہے۔ وہ بھی در حقیقت ایک جگہ قائم نہیں ہیں۔ بلکہ نہایت تیز حرکت کرتے رہتے ہیں) تو قریب ترین "ثابت" "الف قنطورس" (Alpha Centauri) میں ساڑھے چار کروڑ برس میں پہنچیں گے۔ اور ایک شعاع نور کو جو ۶۷۰۰۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے ۴۲ سال درکار ہوں گے۔

اس کے بعد کا ستارہ ۶۔۱۰ نوری سال کی مسافت پر واقع ہے تیسرا ۷۔۹ سال نور کے فاصلہ پر ہے۔ اور اس کے بعد والا جسے "شعری یمانیہ" یا "کلب اکبر" (Dog Star یا Sirius) کہتے ہیں وہ ۸۔۸ نوری سال کی مسافت پر واقع ہے۔ الغرض بہت کم ثوابت ایسے ہیں۔ جو زمین سے چار کھرب میل کے اندر واقع ہوں۔ ہمارے نظام شمسی کے چاروں طرف ایک وسیع و تاریک خلا محیط ہے۔ جو اس دائرہ سے جو سیارہ نیپچون سورج کے گرد ایک بار گھوم کر بناتا ہے آٹھ کھرب گنا بڑا ہے۔

اس نظام شمسی سے آگے ایک ارب اور تین ارب کے درمیان اور بہت سے آفتاب لانہایت فضا کے اندر بے حد تیز رفتاری سے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں بہت سے ایسے ہیں۔ جو متعدد سیارے اپنے جلو میں رکھتے ہیں۔

امریکہ کے سب سے بڑے ہئیت داں سائمن نیوکومب (Simon Newcomb) نے لکھا ہے کہ:۔

"یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ فضا میں بے شمار دنیائیں ایسی ہیں جن میں نہ صرف ذوی الارواح بلکہ ناطق مخلوقات آباد ہیں" اور ڈبلو۔ ڈبلو کیمبل مہتمم رصدخانہ لک (Lick) کا قول ہے کہ "یہ فرض کرنا معمولی امکانات کے بھی خلاف ہے کہ صرف ہمارا ہی سیارہ ذوی الارواح سے آباد ہو۔"

ڈاکٹر سی۔ جی۔ ایبٹ ڈائرکٹر رصدخانہ ہائے واشنگٹن فرماتے ہیں کہ "یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ روشن ستاروں کے ساتھ ساتھ اجرام تاریک کی بھی تعداد کثیر ایسی ہو۔ جن کا وجود ہم اپنی طاقتور سے طاقتور دوربین (Telescope) اور آلہ طیف نما (Spectroscope) سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان میں خدا کی ذی حیات مخلوق آباد ہو۔"

مسٹر گاریٹ پی سرویس نے خوب لکھا ہے کہ کسی سیارہ کے اندر زندگی اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ سیارہ منازل ارتقار طے کرتے ہوئے اس حد تک پہنچ جائے کہ اس میں طبعی اور کیمیاوی قوتیں عمل کرنے لگیں۔ پھر ظاہر ہے۔ کہ ایسی کائنات میں جس کے اندر بے شمار اجرام موجود ہوں خدا معلوم کتنے سیارے ایسے ہوں گے جو ارتقار کے ان منازل کو طے کر چکے ہوں گے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ سوائے کرۂ ارض کے کسی اور سیارہ میں آثار حیات

نہ پائے جائیں۔ ۱۸۶۴ء میں سر ولیم ہگنس نے جو کسی زمانہ میں رائل سوسائٹی کے پریذیڈنٹ بھی تھے۔ مشاہدات طیفی کے ذریعہ سے بتایا تھا۔ کہ اکثر کیمیاوی عناصر جو ہم کو اس دنیائے ارضی میں معلوم ہیں وہی دور دراز فاصلوں پر واقع ہونیوالے ستاروں کے اندر بھی موجود ہیں۔ اور اس طرح گویا ایک جدید دنیا کی بنیاد پڑی جس کا نام ”طبیعیات النجوم“ (Astrophysics) ہے۔ سر ولیم کا قول تھا کہ ”جو ستارہ جھلملاتا ہے سمجھو کہ اس میں کیمیاوی عناصر موجود ہیں۔“

ڈاکٹر سی فرماتے ہیں کہ:- کائنات کی اس لامتناہی وسعت میں اجرام کا وجود اگر آبادی سے خالی مانا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ صرف ایک کرۂ ارض میں مخلوقات ذوی الارواح کا پایا جانا قدرت کی غلطی ہے۔ جو اس کے ایک عام قانون کے خلاف ہوتی ہے۔

ہر چند سائنس کو ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ حیات کیونکر پیدا ہوتی ہے مگر ہم اس قدر ضرور جانتے ہیں کہ جس آسانی سے وہ ہماری چھوٹی سی دنیا میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ دوسری دنیاؤں کے اندر بھی ظاہر ہوتی ہوگی۔ آئندہ ہم نظام شمسی کے ہر سیارہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ وہاں آبادی کا امکان ہے یا نہیں۔

عطارد | ہر چند ہم یہ کہنے کیلئے تیار نہیں کہ عطارد میں کسی ذی حیات کا وجود محال ہے۔ لیکن بعض قوی وجوہ اس خیال کی تائید میں ضرور موجود ہیں کہ عطارد

میں کسی جاندار شئی کا وجود سمجھ میں نہیں آتا۔

اول تو اس سیارہ کا مدار آفتاب سے اس قدر قریب ہے کہ اس کی سطح پر جو کچھ بھی مادۂ حیات رہا ہوگا۔ وہ گرمی کی شدت سے جل کر بالکل فنا ہو گیا ہوگا۔

پروفیسر ڈیوڈ ٹاڈ لکھتے ہیں کہ عطارد کا رنگ بالکل چاند کی طرح زرد ہے اس لیے معلوم ہوتا ہے۔ کہ چاند کی طرح وہ بھی غیر آباد ہے"

مسٹر لوویل کے مشاہدات اور ان نقشوں سے جو انہوں نے سطح عطارد کے متعلق تیار کئے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ عطارد کے خطوط بالکل بے رنگ ہیں۔ اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اس سیارہ کی روزانہ گردش اور گردش فصلی ایک ہے۔ یعنی قمر کی طرح عطارد کا بھی صرف نصف حصہ ہمیشہ آفتاب کی شعاعوں کے سامنے رہتا ہے۔

ایبے نورپو کا خیال ہے کہ کرۂ عطارد کا جو نصف حصہ آفتاب کے سامنے رہتا ہے۔ اس میں اتنی حرارت پائی جاتی ہے کہ سیسہ اور رانگا منجمد حالت میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ قول صحیح ہے تو ضرور عطارد کا ٹمپریچر کم از کم ۲۴۷ درجہ سنٹی ہوگا کیونکہ سیسہ ہماری زمین پر اسی درجہ کی آنچ سے پگھلتا ہے پھر چونکہ عطارد میں درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہے اس لئے ظاہر ہے۔ کہ وہاں فاسفورس، پوٹاشیم، اور سوڈیم بھی نہ ہوں گے۔ کیونکہ یہ تو اس سے بھی کم

گرمی میں پگھل جاتے ہیں۔ اور یہی وہ عناصر ہیں جنہیں لوازم حیات سمجھا جاتا ہے۔ جھیلیں اور دریا تو درکنار ایسے سیارہ کی زمین میں رطوبت تک نہ ہوگی۔ ڈاکٹر ایبٹ نے کافی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ کرۂ عطارد کا ٹمپریچر ۴۵۰ فارن ہیٹ ہے۔ اگر یہ صحیح ہے۔ تو غور فرمائیے۔ کہ ہماری زمین پر معمولی ہوا کے دباؤ میں ۲۱۲ درجہ فارن ہیٹ یا ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ پر پانی اُبلنے لگتا ہے۔ اس لئے عطارد میں اور زیادہ کم درجہ پر اُبلے گا۔ لہٰذا تمام پانی جو اس کرہ کی سطح پر رکھا جائے وہ فوراً نہایت گرم بھاپ میں منتقل ہو جائے گا۔ اس لئے جہاں تک ہم کو شرائط حیات معلوم ہیں سطح عطارد پر کوئی جاندار چیز نہیں رہ سکتی۔ لیکن گاریٹ پی سرویس (Garret. P. Serviss) کا خیال ہے کہ ممکن ہے وہاں ایسے حالات موجود ہوں جنہیں ہم نہ سمجھ سکتے ہوں اور گرمی کی شدت وہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہو۔"

مسٹر سی فسر ہوٹالسن لکھتے ہیں کہ یہ سمجھنا غلط نہیں کہ اگر قدرت نے ہماری زمین کے علاوہ دیگر سیارگان پر بھی ذوی الارواح پیدا کئے ہیں۔ تو ان کی صورت شکل اور وضع قطع ایسی ہوگی جس کا ہم کو قطعی علم نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ مخلوق ایسی ہو جسے نہ نباتات میں داخل کیا جا سکے نہ حیوانات میں۔"

گذشتہ ربع صدی میں تمام ماہرین فلکیات کا یہی خیال تھا کہ سیارہ

عطارد اپنے محور پر ایک ہی بار گردش کرتا ہے۔ اور ایک ہی بار آفتاب کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن جبل ولسن رصدگاہ میں ایک حرارتی جفت Thermo (Couple) کے ذریعے سے جس میں ایک مقناطیسی برق پیما (Galvanometer) بھی نصب کر دیا گیا تھا۔ جو حالات معلوم ہوئے ہیں۔ ان سے مندرجہ بالا نظریہ کی صحت میں کچھ شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان جدید تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ کرۂ عطارد سے جو اشعاع نور (Radiation) پیدا ہوتا ہے اس کی تحلیل طیفی (Spectral distribution) قریب قریب چاند کی طرح نظر آتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں سماوی کا سطحی ٹمپریچر (اشعاع) تقریباً یکساں ہے۔ اسی کے ساتھ اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ کہ کرۂ عطارد کے تاریک حصے کی طرف سے بھی حرارت ونور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ کرۂ عطارد کا زمانۂ تحویل (Rotation) بہت تھوڑا ہے۔

زہرہ | زہرہ کے زمانہ تحویل کے باب میں ماہرین فلکیات متفق نہیں ہیں۔ بعض کا یہ قول ہے۔ کہ کرۂ زہرہ بھی کرۂ عطارد کی طرح اپنے محور پر آفتاب کے گرد گردش کرتے ہوئے گھومتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ایک طرف ہمیشہ نور (دن) اور دوسری طرف ہمیشہ ظلمت (رات) رہتی ہے۔

اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جس وقت سیارہ مذکور نرم اور

لچک دار حالت میں تھا۔ اس وقت تمازت آفتاب کی شدت کے باعث اس میں زبردست مدوجزر واقع ہوتا تھا جس سے بہت سی سطح ابھر گئی اور بہت سی دب کر رہ گئی۔ پھر جب ابھری ہوئی سطح نے بطور "بریک" (Brake) کا کام کیا تو گردش میں سخت رگڑ پیدا ہوئی جس کے باعث زہرہ کا زمانہ تحویل رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ زہرہ کا کرہ ہوائی زیادہ کثیف (Dense) ہے۔ اور جب کسی کرہ کا ایک ہی نصف حصہ ہمیشہ آفتاب کی طرف رہے گا۔ تو گمان غالب ہے کہ ہوا زیادہ گرم شدہ نصف کرہ پر سے بیرونی سرد تاریک نصف کرہ کی طرف چلے گی۔ اور اپنے ساتھ روشن نصف کرہ کا پانی اور رطوبت لے جا کر کرہ کی سمت تاریک میں برف کی طرح منجمد کرے گی۔

زہرہ کا مشاہدہ کرتے وقت اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ قرص زہرہ کی غیر روشن سمت میں خفیف سی چمک دکھائی دیتی ہے جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ جمع شدہ برف کی چمک ہے۔ بعض اوقات زہرہ کے قطبین پر برف کے تودے بھی دیکھے گئے ہیں اور دائرہ نور و ظلمت کے انحنا میں جو بے قاعدگی پائی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زہرہ کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑ بھی ہیں۔

ڈاکٹر لوویل اور ان کے رفقا نے رصدگاہ لوویل میں زہرہ کا مطالعہ کر کے وہاں وسیع منطقے مشاہدہ کئے ہیں لیکن بہت سے ماہرین فلکیات ان

نشانات کو محض خیالی سمجھتے ہیں۔ البتہ ارصاد طیفی سے جو ثبوت حاصل ہوئے ہیں۔ ان سے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے۔ کہ زہرہ کا زمانہ تحویل ۲۲۵ یوم ارضی ہے۔

مشہور و معروف اطالوی ماہر فلکیات ڈاکٹر جی۔ وی شیاپریلی (G. V. Shiaparelli) نے اور جس نے کرہ مریخ کی سطح پر نہریں معلوم کی تھیں سب سے پہلے یہ بیان کیا کہ سیارہ زہرہ کا ہمیشہ ایک ہی رخ آفتاب کے سامنے رہتا ہے۔ اسی وقت سے تمام ماہرین فلکیات اس مسئلہ پر مختلف رہے ہیں کہ اس کا زمانہ تحویل طویل ہے یا قلیل سنہ ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر ڈبلو۔ ایچ پکرنگ ہارورڈ یونیورسٹی نے جزیرہ جمیکا کی صاف اور مستقل فضا میں جو خط استوا کے قریب ہے جب زہرہ کا مشاہدہ فرمایا تو انہوں نے ایک جدید اور حیرت انگیز توجیہ پیش کی یعنی یہ کہ زہرہ کا زمانہ تحویل ۶۸ گھنٹہ ہے۔ اور اس کا محور تحویلی اس کے فلک کی سطح میں واقع ہے یعنی صرف چار یا پانچ درجہ کا زاویہ بناتا ہے۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے۔ تو وہاں کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہوگی نہ گرمی ہی نہ سردی۔ اگرچہ قرب آفتاب کے باعث نظری طور پر اس کا اوسط ٹمپریچر ۱۵۰ درجہ فارن ہیٹ بمقابلہ ۶۰ درجہ فارن ہیٹ ہماری زمین کے ہوگا۔ لیکن چونکہ اس کا ہوائی لفافہ زیادہ کثیف ہے۔ اس لئے کرہ تمازت آفتاب کی شدت

سے محفوظ رہتا ہے۔ اور اس طرح اس کا ٹمپریچر صرف ۶۰ درجہ فارن ہیٹ رہ جاتا ہے۔

اگر زہرہ کا خط محور واقعی اس کے فلک کی سطح میں عمودی طور پر واقع ہوا ہے تو ہماری زمین کے خلاف وہاں کے باشندے تغیرات فصلی سے واقف ہی نہ ہوں گے۔ سال بھر یکساں حالت رہتی ہوگی۔ اور ہر منطقہ کی آب و ہوا میں بلحاظ عرض البلد فرق ہوگا۔ اور اگر وہاں کا نظام معاشرت و مدنیت زمین جیسا ہوگا۔ تو لوگ زیادہ تر قطبین کی طرف رہنا پسند کرتے ہوں گے۔ کیونکہ باوجود کثافت ہوا بھی ممالک خط استوا میں رہنا غیر قابل برداشت ہوگا۔ اگرچہ عادی ہونے کے باعث ممکن ہے لوگ ان استوائے ممالک میں بھی رہتے ہوں۔

چونکہ کرۂ زہرہ کا ہوائی لفافہ بہت زیادہ کثیف ہے۔ اور وہاں زیادہ تر ابر چھایا رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے اس کی سطح کا مشاہدہ سخت دشوار ہو گیا ہے اور اس کے زمانہ تحویل کے متعلق کوئی خاص نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا مسٹر سروس (Mr. Serviss) فرماتے ہیں۔ کہ "اگر زہرہ اپنے چہرۂ زیبائے تھوڑی دیر کے لئے وہ عجیب و غریب نقاب ہٹا دے جو ہر وقت اس کے روئے روشن پر پڑا رہتا ہے تو وہ تمام نظام شمسی کے اندر یقیناً سب سے زیادہ دلچسپ سیارہ نظر آئے۔"

ڈاکٹر سی جی ابیٹ کا خیال ہے کہ بقائے حیات کے لئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے وہ سب زہرہ میں پائی جاتی ہیں کیونکہ اس سیارہ کی زبردست انعکاسی قوت یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ زیادہ تر پردہ سحاب میں روپوش رہتا ہے جس سے غالباً وہاں کا ٹمپریچر بالکل ہماری زمین جیسا ہو گا۔

چنانچہ ڈاکٹر ابیٹ بھی کہتے ہیں کہ اس سیارہ کی زبردست انعکاسی قوت جو ۶۰ فیصدی کے قریب ہے بادلوں کے وجود کی متقاضی ہے۔ اور یہ بادل بغیر پانی اور کسی مادہ کے متشکل ہو سکتے ہیں اگر زہرہ کی تحویل کا زمانہ اس کی آفتاب کے گرد گردش کے زمانہ کے برابر ہوتا تو گرم طرف کا تمام پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا۔ اور سرد جانب آجمتا اور بایں صورت تمام چادر سحابی غائب ہو جاتی۔

بعض لوگوں نے مشاہدہ کر کے بیان کیا ہے کہ زہرہ کی بعض سطحی خصوصیات غائب ہو کر پھر ۲۳ گھنٹہ اور ۲۱ منٹ بعد نمایاں ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر ٹی۔ جے۔ سی نے لکھا ہے۔ کہ بمقابلہ مریخ کے زہرہ میں آبادی کا امکان زیادہ ہے۔ کیونکہ زہرہ کا زمانۂ تحویل ۲۳ گھنٹہ ۲۱ منٹ ہے اور تمام باتوں میں کرۂ ارض سے اس قدر مشابہ ہے گویا زہرہ و ارض دونوں توام بہنیں ہیں۔ زہرہ کے اندر ہوا، بادلوں، پانی، پہاڑوں، جھیلوں، سمندروں، اور دریاؤں کی کثرت ہے۔ موسم بھی قریب قریب ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے زمین پر صرف اس قدر فرق ہے کہ وہاں کا ہر موسم چھوٹا ہوتا ہے کیونکہ زہرہ کا سال

صرف ۲۲۵ دن کا ہوتا ہے پھر کیا وجہ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے سیارہ میں کوئی ذی حیات نہ پائی جائے"۔

لیکن ڈاکٹر سینٹ جان نے آلۂ طیف پیما سے مشاہدہ کر کے یہ معلوم کیا ہے کہ "زہرہ کے گرد جو ہوا ہے۔ اس میں آکسیجن ہی نہیں" بہر حال زہرہ کے متعلق اس وقت تک جتنی تحقیق ہو چکی ہے۔ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کسی ذی حیات کا پایا جانا مستبعد نہیں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ وہاں بھی انسان ہی کی طرح کوئی ذی شعور مخلوق پائی جاتی ہو لیکن چونکہ زہرہ کے چاروں طرف ہوا اور بادل کی نہایت کثیف تہ موجود ہے۔ اس لئے ہمارے آلات رصد ابھی تک سطح زہرہ کا کوئی صحیح حال معلوم نہیں کر سکے۔

مشتری | مشتری اپنے حجم و وزن کے نہایت عظیم الشان سیارہ ہے یعنی اگر کسی ترازو کے پلڑے میں مشتری کو رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں نظام شمسی کے اور تمام سیارے۔ تو مشتری کا پلہ بھاری رہیگا۔ جس طرح ہماری زمین کے ساتھ ایک چاند ہے اسی طرح سیارہ مشتری کے ساتھ نو چاند ہیں ان میں سے چار چاند سنہ ۱۶۱۰ء میں گلیلو (Galileo) نے دریافت کئے تھے۔ ان میں سے ایک چاند جس کا نام "گانمیڈ" ہے۔ عطارد کے قطر سے ۶۰۰ میل بڑا قطر رکھتا ہے۔ دوسرا چاند "کالسٹو" عطارد کے برابر ہے۔

اس عظیم الشان کرہ کی طبیعی حالت جس قدر ہم کو معلوم ہے اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ یہاں کسی جاندار چیز کا وجود نہیں پایا جا سکتا۔ اس عظیم الشان سیارہ کا ٹمپریچر اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی سطح پر باریک سا چھلکا یا ٹھوس خول بھی ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں تحلیل طیفی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو مادی اشیاء اس کی بیرونی سطح پر پائی جاتی ہیں وہ ان اشیاء سے قطعی مختلف ہیں۔ جو ہم کو سطح ارض پر اب تک معلوم ہو سکی ہیں۔

ابھی یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ ہم مشتری کی اصلی سطح اب تک دیکھ سکے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ اس کی سطح پر رنگین بادل بکثرت نظر آتے ہیں جو ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا بڑے بڑے ذخار دریا بہہ رہے ہیں۔ یہ سحابی منطقے خود بھی کسی قدر بدلتے رہتے ہیں یعنی کبھی شمال کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور کبھی جنوب کیطرف ان سحابی منطقوں کے کناروں پر اکثر سرخ رنگ کی روشنی دیکھی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نیچے جو مواد پایا جاتا ہے۔ وہ بالکل آگ کی طرح سرخ ہے۔ کرۂ مشتری کے منطقہ خط استوا میں طاقتور دوربینوں کے ذریعہ سے دیکھا گیا ہے کہ مختلف قسم کے دھبے اور عجیب و غریب دھاریاں پائی جاتی ہیں۔

اسی طرح اس کے کرۂ ہوا میں چھوٹے چھوٹے مختلف الالوان دھبے نظر آتے ہیں۔ جو دھبے خط استوا پر ہیں۔ ان کا زمانہ تحویل ۹ گھنٹہ ۵۰ منٹ اور جو دھبے زیادہ جنوب کی طرف واقع ہیں۔ ان کا زمانہ تحویل ۹ گھنٹہ ۵۵ منٹ ہے۔ اگر سیارہ مشتری کی سطح سخت ہوتی تو خط استوا پر حرکت زیادہ یا شمالی

وجنوبی منطقوں کی حرکت سے زیادہ تیز نہ ہوتی۔

گذشتہ چالیس برس سے جرم مشتری پر جو سب سے زیادہ نمایاں داغ نظر آرہا ہے اس کو عرف عام میں داغ سرخ کبیر" یا Great Red Spot) کہتے ہیں۔ ایک انگریز ماہر فلکیات کا قول ہے کہ یہ کرۂ مشتری کا ایک چاند ہے جو ہنوز دور تکوین میں ہے۔ اس انگریز کا دعویٰ ہے کہ یہ مادہ جسے ہم سُرخ داغ" کہتے ہیں آہستہ آہستہ مشتری کی سطح سے پیچھے کی طرف ہٹ رہا ہے اور ایک دن آئے گا جب یہ مشتری سے بالکل علیحدہ ہو کر اس کا دسواں چاند بن جائیگا۔ اس وقت تک جو ۹ چاند مشتری کے معلوم ہوئے ہیں ان میں سے آٹھویں اور نویں چاند کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ اُلٹے چلتے ہیں یعنی بائیں سے داہنے یا مشرق سے مغرب کی طرف چلتے ہیں۔ حالانکہ خود مشتری کی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف ہے۔

بعض کی رائے ہے کہ وہ داغ سُرخ" کوئی چاند نہیں ہے بلکہ سطح مشتری پر ایک ٹھوس چھلکا بن رہا ہے اگر یہ داغ آہستہ آہستہ مشتری کے گرد پیچھے کی طرف نہ ہٹتا ہوتا تو یہ کہا جاسکتا کہ وہ کسی عظیم الشان کوہ آتش فشاں کا وسیع دہانہ ہے۔ جو ۱۸۸۵ء میں تیس ہزار میل طویل اور آٹھ ہزار میل عریض تھا۔

۱۸۸۶ء سے ۱۸۹۴ء تک یہ داغ قریب قریب غائب ہو گیا تھا۔

مگر ۱۹۰۰ء میں یہ بیضوی شکل میں نظر آنے لگا۔ رنگ البتہ سرخ کے بجائے کسی قدر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں یہ داغ قطعی نظر نہ آتا تھا۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں وہ کئی ہفتہ تک زیادہ نمایاں رہا۔ یہ داغ اب بھی نظر آتا ہے مگر بہت دھندلا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اب وہ رفتہ رفتہ سرد ہوتا جاتا ہے اور جو گہرا سرخ رنگ اس داغ کا ۱۸۷۸ء میں دیکھا گیا تھا۔ پھر نہیں دیکھا گیا۔

مشتری کی ہوا بہت کثیف اور گرم ہے۔ ڈاکٹر ای سی سیلیفر کا قول ہے کہ جس قدر معلومات ہم کو سیارہ مشتری کے متعلق حاصل ہوئی ہیں وہ اس امر کی شاہد ہیں کہ مشتری کے اندر شدید ہیجان کا باعث سیارہ مذکورہ کی سخت اندرونی حرارت ہے جس کا اثر اس کے کثیف لفافہ بخارانی پر بھی پڑتا ہے۔

ڈاکٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو کیمبل (Campbell) مشتری کے کرہ ہوائی کی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ ہنوز بالکل گرم ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ سیارہ مشتری کے نو چاند ہیں۔ منجملہ ان کے دو چاند سب سے بڑے ہیں ایک کا نام "گانمیڈ" ہے۔ اس کا قطر ۳۵۵۸ میل یعنی سیارہ عطارد کے قطر سے تقریباً ۶۰۰ میل زیادہ ہے۔ اس چاند کا مدار مشتری کے مرکز سے ۶۴۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے اور خود مشتری کا قطر ۸۰ ہزار میل ہے۔ چونکہ یہ قمر عظیم مشتری سے بہت قریب واقع ہے۔ اس لئے وہاں مشتری سے بعید حرارت پونہچتی ہو گی۔ لیکن نہ اتنی جتنی ہمارے چاند کو آفتاب سے پونہچتی رہتی ہے کیونکہ مشتری کا

یہ چاند بہ نسبت ہمارے چاند کے آفتاب سے بہت زیادہ دور واقع ہے۔

جہاں تک ٹمپریچر کا تعلق ہے گانمیڈ اور آیو دونوں چاندمیں نہایت منظم آبادی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ امر مشتبہ ہے۔ کہ ان دونوں کی ہوا میں آکسیجن کی بھی کافی مقدار موجود ہے یا نہیں۔

زحل | یہ خوبصورت حلقہ دار سیارہ بمقابلہ ہماری زمین کے آفتاب سے ساڑھے نو گنا دور ہے۔ اور اس کا حجم ہماری زمین سے ۷۶۲ گنا بڑا ہے چونکہ یہ سیارہ آفتاب ۸۶۰۰۰۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اس لیئے اس کی سطح تک سطح ارض کے مقابلہ میں نور وحرارت شمسی کا صرف ۱/۱۰۰ حصہ پونچتا ہے اگر جرم زحل تک صرف آفتاب ہی کی حرارت پونچتی ہے۔ تو اس کا ٹمپریچر درجہ صفر سے ۲۴۰ درجہ فارن ہیٹ نیچے ہوگا۔ جو یقیناً اس قدر کم ہے کہ اس میں کوئی ذی حیات چیز نہیں پائی جاسکتی۔ مشتری کی طرح زحل بھی مخصوص جرم کی طرح حرکت نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے اندر کے طبقات اندر ہی اندر تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ طبقات غیر مساوی سرعت کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ اس لئے آپس کی رگڑ سے یقیناً زبردست حرارت پیدا ہوجاتی ہوگی۔ مشتری کی طرح یہ سیارہ بھی گداخت یا گیس کی سی حالت رکھتا ہے اگر اس سیارہ کی ترکیب انہیں اجزا سے ہوئی ہے۔ جو کرۂ ارض کے ہیں (اور بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو) تو پھر اس کی سطح پر کوئی سخت چھلکا نہیں

ہو گا۔ بلکہ صرف گیسوں کے طبقات ہوں گے۔ جو بوجہ عمق بہت زیادہ کثیف بن گئے ہوں گے۔ اور مرکز کے قریب بدرجہ غایت تاریک ہوں گے۔

ٹاڈ کا خیال ہے کہ یہ زحل کا طیف بھی بالکل مشتری جیسا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ زحل کے جرم میں بعض ایسے عناصر گیس موجود ہیں جو ابھی تک زمین یا آفتاب میں دریافت نہیں ہوئے۔

سیارۂ زحل کے دس چاند ہیں۔ جن میں ایک (یاپٹیوس) کا قطر ۲۰۰۰ میل ہے اور دوسرا چاند (ٹائیٹان) سیارۂ عطارد کے برابر ہے۔ چونکہ یاپٹیوس سیارہ زحل سے ۲۲۲۱۰۰۰ میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے اسے زحل سے کافی حرارت نصیب نہیں ہوتی لیکن چونکہ اس کا کرۂ ہوا نہایت ہی لطیف اور تنک ہے اس لئے اس بات کا قوی گمان ہے۔ کہ اس کی سطح پر اعلیٰ طبقہ کے نشو ونما یافتہ جاندار موجود نہ ہوں گے۔ دوسرے چاند ٹائیٹان کی حالت دوسری ہے۔ اور یہ نسبت ہماری زمین کے اس میں زیادہ ادنیٰ قسم کے جاندار پائے جانے کا امکان ہے۔

یورانوس و نیپچون | ان دونوں سیاروں کو آفتاب سے نسبتاً بہت کم حرارت روشنی پونچتی ہے یعنی یورانوس کو بمقابلہ زمین کے $\frac{1}{361}$ حصہ نور و حرارت کا پونچتا ہے۔ نیپچون کو صرف $\frac{1}{900}$ اس لئے نیپچون میں دوپہر کو صرف اتنی روشنی ہوتی

ہوگی جتنی زمین پر شام کے وقت ہوتی ہے۔ اور یورانوس میں اس سے کچھ زائد۔ یورانوس کا ٹمپریچر (۳۸۰) درجہ اور نیپچون کا ٹمپریچر (۴۰۰) درجہ بتایا جاتا ہے اس لئے وہاں سردی اتنی شدید ہوگی۔ کہ اگر ہماری زمین کی ہوا کسی صورت سے نیپچون تک پہنچا دی جائے۔ تو فوراً منجمد ہو کر ایک "ٹھوس" چیز کی حیثیت اختیار کرلےگی۔

بعض کا خیال بالکل اس کے برعکس ہے وہ کہتے ہیں کہ یورانوس جو کرۂ ارض سے ۶۱ گنا اور نیپچون جو زمین سے ۸۵ گنا بڑا ہے۔ دونوں سخت گرم سیارے ہیں۔ اور گیس کی صورت رکھتے ہیں۔

دوربین کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یورانوس بہت دور واقع ہے یہاں تک کہ اس کے ہلکے سبز رنگ کی سطح پر جو نشانات ہیں وہ اچھی طرح دکھائی نہیں دیتے لیکن بعض ماہرین فلکیات نے یورانوس میں مشتری جیسے طبقات بھی دیکھے ہیں۔

تقریباً پندرہ سال گزرے اس امر کا اعلان ہوا تھا کہ آلۂ طیف پیما یا موشور کے ذریعہ سے یورانوس اور نیپچون میں کلوروفایل (Choloroophyll وہ چیز جس سے نباتات میں سبز رنگ پیدا ہوتا ہے) کا وجود پایا جاتا ہے اور یورانوس اور نیپچون میں ویسے ہی حلقے نظر آتے ہیں جیسے کلوروفائل کے محلول سے شعاعیں گزرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں واضح ہو کہ کلوروفائل کوئی

عنصر نہیں بلکہ نائٹروجن کا ایک نہایت ہی پیچیدہ مرکب ہے جو پودوں کے بعض خلایا میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مرکب یورانوس اور نیپچون کے ہوائی طبقات کے اندر کیونکر آ گیا۔

مسٹر گاریٹ پی سردس کہتے ہیں کہ جو سیارے گیسی حالت میں ہوتے ہیں وہاں کی مخلوقات بھی ویسی ہی گیس کی قسم کی ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ لوگ جو اشیاء کو دنیوی اوزان اور پیمانوں کے معیار سے جانچنے کے عادی ہیں۔ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک گیسی صورت حیات کیا ہو سکتی ہے لیکن مخلوقات کا تنوع ایک ایسی بداہت ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی دلیل کی جستجو کرنا بیکار ہے۔

مریخ ۲۳ اگست ۱۹۲۴ء کو مریخ کرۂ ارض سے بقدر ...... میل قریب آ گیا تھا۔ اور یہ قریب اتنا تھا کہ گذشتہ ایک سو بیس سال میں نہ ہوا تھا۔ اور نہ آئندہ ایک سو سال تک اس کا امکان ہے۔ اس تاریخ کی شام کو مریخ زمین سے صرف ......۳۴۵ میل کے فاصلہ پر تھا۔

جب زمین اور مریخ اس طرح واقع ہوں کہ اگر آفتاب سے ایک خط مستقیم مریخ تک کھینچا جائے۔ جو کرۂ ارض سے ہوتا ہوا گذرے تو اس وقت اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ ان تینوں کا "قران" ہو گیا ہے لیکن چونکہ مریخ کا مدار بہت ہٹا ہوا ہے۔ اس لئے وہ زمین سے قریب تر آ جانے کے باوجود

بہت دور رہتا ہے مثلاً اگر کرۂ ارض کا فاصلہ آفتاب سے اوج شمسی کے وقت صرف ۳۰۰۰۰۰۰ میل ہوتا ہے تو مریخ اسی نقطہ پر ۲۶۰۰۰۰۰ میل دور ہوتا ہے۔ فروری یا مارچ کے مہینے میں جب آفتاب مریخ اور زمین ملیتوں ایک خط میں ہوتے ہیں تو اسوقت مریخ اور زمین کے درمیان تقریباً ۶۱۰۰۰۰۰ میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہی صورت اگست یا ستمبر میں واقع ہو تو فاصلہ کم ہو کر ۲۵۵۰۰۰۰ میل رہ جاتا ہے الغرض ایسے تمام قرانوں کا بُعد اوسط ۴۸۶۰۰۰۰ میل ہوتا ہے۔ دوربین کے ذریعہ سے مریخ کا قطر اقتران کے وقت ۲۵ انچ نظر آتا ہے۔ مگر اس کا انحصار دوربین کی طاقت پر ہے۔ کیونکہ اگر دوربین بہت قوی ہو تو مریخ ہمارے چاند کے برابر نظر آسکتا ہے۔

پروفیسر پکرینگ نے کافی مشاہدہ کرنے کے بعد یقین کر لیا ہے کہ کرۂ مریخ میں جاندار مخلوق ضرور موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ماہرین فلکیات نے رصد گاہ تو ویل سے معلوم کیا ہے کہ وہاں نہروں کا ایک سلسلہ پایا جاتا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ مریخ میں نباتات کا ہونا لازم ہے۔

رہا یہ امر کہ مریخ میں جاندار مخلوق ہیں یا نہیں۔ اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ کہ اگر کسی جگہ نباتات کا وجود ثابت ہو جائے۔ تو ادنیٰ درجہ کے حیوانات تو یقیناً پائے جائیں گے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مریخ میں حیوانات کا وجود یقیناً ہوگا۔

۱۶۵۹ء میں ماہر فلکیات کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی۔ کہ کرۂ مریخ کی سطح پر خاص قسم کے داغ دھبے موجود ہیں۔ لیکن ۱۸۳۰ء میں سب سے پہلے مریخ کا نقشہ مشہور جرمن ہیئت دان جے۔ آر۔ ایچ۔ فان ماڈلر نے کھینچا۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں ایک اطالوی ہیئت دان جی۔ وی شیاپریلی نے ان دھبوں کو معلوم کیا جنہیں "سلسلہ انہار" کہتے ہیں۔ ۱۸۸۱ء میں اسی شخص نے اعلان کیا کہ بعض اوقات یہ نہریں بہت بڑی ہو جاتی ہیں اور اس زمانہ سے ان نہروں کا خاص طور پر مطالعہ ہونے لگا۔

سر ولیم ہرشیل نے معلوم کیا کہ مریخ کے قطبین پر برف کے تودے ہیں اور جب کبھی ان تودوں میں سے کوئی کم ہوتا ہے تو سطح مریخ پر عجیب قسم کے نشانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور باریک خطوط کا ایک جال سا پیدا ہو جاتا ہے۔

مریخ کا مدار بیضاوی شکل کا ہے۔ اس کا قطر ۴۲۱۵ میل ہے اس کا حجم زمین سے $\frac{1}{7}$ ہے۔ اور اس کا سطحی رقبہ زمین کا $\frac{2}{7}$ ہے۔ اور اس کی کثافت $\frac{1}{9}$ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ میں بمقابلہ زمین کے کشش ثقل کی نسبت $\frac{38}{100}$ ہوگی یعنی جو چیز زمین پر سو پونڈ وزن رکھتی ہے وہ مریخ پر ۳۸ پونڈ ہوگی۔ مریخ کے خط استوار کا جھکاؤ اپنے مدار کی طرف تقریباً ۲۴ درجہ ۵۰ دقیقہ ہے۔ اس لئے کرۂ مریخ پر موسم بھی کرۂ ارض کی ہی

طرح بدلتے ہوں گے۔ اس کی رفتار تحویلی بھی قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی کہ کرۂ ارض کی یعنی ۲۴ گھنٹہ، ۳۷ منٹ، ۲۲٫۶ سیکنڈ۔ مریخ اپنے فلک پر سورج کے گرد یہ حساب ۹۸٫۴ میل فی سکنڈ، ۶۸۶٫۹۷ دن میں گردش کرتا ہے۔ آفتاب کے گرد مریخ کی گردش کا زمانہ ایک سال ساڑھے دس مہینہ ہوتا ہے یہ گویا مریخ کا ایک سال ہے اور زمین ہی کی طرح وہاں بھی بہار، گرما، خزاں اور سرما ہوتے ہیں مگر ہر فصل کی مدت تقریباً دگنی ہوتی ہے۔ جب زمین پر جون کا مہینہ ہوتا ہے تو مریخ پر خزاں ہوتی ہے ۱۹۲۰ء میں ۴ جون کو مریخ پر پہلی برف پڑی تھی جس طرح زمین کے شمالی و جنوبی حصوں میں تفریق موسم ہوتی ہے۔ اسی طرح کرۂ مریخ میں بھی ہے۔ مریخ میں فصل بہار ۱۹۹ دن، گرما ۱۸۳ دن، خزاں ۱۴۷ دن اور سردی ۱۵۸ دن ہوتی ہے۔

مریخ کے درجۂ حرارت کے متعلق بعض کا خیال ہے کہ ۴۰ درجہ ہے اور بعض نے ۶۰ درجہ اندازہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اقوال محض ریاضیات فلکی کے بعض اصول کی بناء پر ہیں۔ صحیح علم اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ بکرنک کا قول ہے کہ مریخ کا اوسط ٹمپریچر ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن وہ ۳۲ درجہ سے یقیناً کم ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ ۲۰ درجہ ہو کیونکہ مریخ کے استواء پر دوپہر کے وقت کبھی برف نظر نہیں آتی لیکن جب مریخ نقطۃ الذنب کی طرف ہوتا ہے تو طلوع آفتاب کے بعد استواء پر برف

نمودار ہو جاتی ہے۔ نیز سہ پہر کے وقت منطقہ حارہ میں کہر اور دھند بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے اس زمانہ میں بوقت شب ٹمپریچر ۲۲ درجہ سے کم ہو جاتا ہوگا۔ اور دوپہر کے وقت غالباً ۶۰ یا ۷۰ درجہ تک پونچ جاتا ہوگا۔

کرۂ مریخ میں ایسا کوئی کرۂ ہوا نہیں ہے۔ جیسا زمین کے گرد پایا جاتا ہے نہ وہاں دوپہر کے وقت ابر ہوتا ہے نہ ٹھنڈے سمندر ہوتے ہیں صرف قطبین پر کسی قدر برف ہوتی ہے مریخ کی سطح کا مقابلہ کرۂ ارض کے ریگستانی علاقوں سے کسی قدر ہو سکتا ہے۔

الغرض دوربین کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریخ میں اس کے قطبین کے قریب دو سفید داغ پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اسی قسم کے سفید داغ اس کی سطح کے اور حصوں پر بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ۹ر جولائی ۱۹۲۲ء کی شب کو تین لاکھ مربع میل کی وسعت کا ایک بہت بڑا سفید دھبہ یکایک نمایاں ہو گیا تھا۔ قطبین کے گرد جو سفید دھبے نظر آتے ہیں وہ قطر میں ۱۲ ہزار میل سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ برف کے تودے ہیں لیکن ۹ر جولائی کی شب کو جو سفید دھبہ یکایک نمایاں ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کرۂ ہوا میں منجمد ہو جانے والے بادل تھے۔ یہ ابر مریخ کے باشندہ کو تو سیاہ نظر آتا ہوگا۔ مگر ہم کو آفتاب کی شعاعوں کی وجہ سے سفید دکھائی دیتا ہے۔ اور اس لئے سطح مریخ پر اس قسم کے سفید دھبے نظر آنے کے معنی یہ ہیں کہ وہاں

سخت گھٹا چھائی ہوئی ہے اور طوفان ابر و باراں برپا ہے اس قسم کا ایک حادثہ مریخ میں ۹ مئی ۱۹۲۱ء کو پلکاف کی رصدگاہ میں دیکھا گیا تھا۔ اس کے متعلق پروفیسر ملشکاف کا بیان ہے۔ کہ یہ چادر ابر اس قدر وسیع تھی۔ کہ سطح مریخ پر جو نشانات عموماً نظر آیا کرتے ہیں۔ وہ سب پوشیدہ ہو گئے تھے۔

ایڈگر لوسیّن لارکن کو یقین نہیں ہے کہ کرۂ مریخ پر کوئی سلسلہ انہار ہے مگر انہوں نے ۱۷ جون ۱۹۲۲ء کو سطح مریخ پر بھورے رنگ کے جدید داغ دیکھے تھے۔ اور یہ امریکہ کے رقبہ کے برابر وسیع تھے۔ ان کو مریخ کا ریگستانی حصہ سمجھا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ سطح مریخ پر سفید داغ عموماً اس زمانہ میں نمودار ہوتے ہیں جبکہ وہاں موسم گرما ہوتا ہے۔ یعنی جب قطبین کی برف گھل کر بہت کم ہو جاتی ہے۔ اور ہوا میں رطوبت پیدا ہو جاتی ہے۔

جب شمالی نصف کرہ میں گرمی ہوتی ہے تو شمالی تودۂ برف غائب ہو جاتا اور جنوبی تو وہ رفتہ رفتہ بڑھنے لگتا ہے۔ شمالی دھبہ ۱۲ ہزار میل قطر کے رقبہ سے موسم گرما میں کم ہو کر ۲۰۰ میل قطر کا رہ جاتا ہے۔ لیکن جنوبی داغ بعض اوقات بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اور جاڑوں میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔

تقریباً نصف صدی قبل یہ کہا جاتا تھا کہ کرۂ مریخ میں کوئی طبقہ ہوا نہیں ہے اگر ہے بھی تو وہ بہت ہلکا ہے۔ اور اس میں بخارات آبی مطلق نہیں ہیں۔ اس لئے قطبین پر برف ہرگز جم نہیں سکتی۔ مگر جو واقعات ہم بیان کر چکے ہیں۔

ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مریخ کے متعلق کرۂ ہوائی ضرور ہے اور اس میں رطوبت بھی کافی ہے جس سے برف اور باراں بن سکتے ہیں۔

بعض کا قول یہ بھی ہے کہ مریخ کے قطبین پر جو سفید داغ نظر آتے ہیں وہ منجمد شدہ کاربن ڈائی آکسائڈ ہے مگر پروفیسر پکرنگ کہتے ہیں کہ ا۔ جب قطبین پر تودے بنتے ہیں تو وہ گرد و نواح کی سطح سے ممتاز نظر آتے ہیں یہ بھی صحیح طور پر معلوم ہے کہ یہ داغ کب محو ہونے لگتے ہیں۔ اور چند ہفتہ بعد ایک سیاہ خط النصف النہار سے شروع ہو کر مغربی افق کے سرے تک زیادہ زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے اور پھر چند ہفتہ بعد وہ خط وسیع ہوتے ہوتے افق مشرق تک پونہچ جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس قطبی تودہ کو کرہ کے دوسرے حصوں سے قطعی علیحدہ کر دیتا ہے۔ بعد ازاں وہ خط کئی سو میل چوڑا ہو جاتا ہے اور جوں جوں بالائی داغ محو ہوتا جاتا ہے یہ خط بھی پیچھے ہٹ کر اس سے ملتا جاتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سطح میں سیاہ خلیجیں بننے لگتی ہیں جن میں سے زرد رنگ کے بادل اُٹھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب وہ تودہ گھٹنے لگتا ہے تو اس کے حدود میں ایک سیاہ رقبہ نمایاں ہو جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیاہ رقبہ برف کے گھلنے سے پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح چار ملی میٹر سے کم دباؤ میں پانی قائم نہیں رہتا اسی طرح کاربن ڈائی آکسائڈ بھی پانچ ملی میٹر سے کم دباؤ میں قائم نہیں رہ سکتی اس لئے یہ

سفید تودے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے نہیں بلکہ برف کے ہیں۔ علاوہ ازیں مسٹر اسلیفر کا بیان ہے کہ مریخ کے سحابی رقبے بھی اسی مادہ کے بنے ہوئے ہیں جس کے ہماری زمین کے بادل بنتے ہیں۔

الغرض شہادتیں اس قدر ضرورت سے زیادہ ہیں کہ ہم کو مجبوراً یہ ماننا پڑتا ہے کہ مریخ میں بخارات آبی ضرور موجود ہیں اور جن ارصادات طیفی سے یہ ثابت ہوا کہ مریخ پر بخارات آبی کا وجود ہے انہیں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہاں آکسیجن بھی ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی دلچسپ ہے کہ اگست ۱۹۲۲ء میں لاس اینجلیز سے سو میل کے فاصلہ پر ایک برفانی دریا کی سطح پر مٹی کی تہ پائی گئی تھی جس پر کچھ سبزی سی اُگی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے برف تھے۔ اسی طرح جب مریخ میں قطبین کی برف پگھلتی ہے۔ تو وہ دھاریاں جنہیں "نہریں" کہتے ہیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ سیاہ خطوط کا ایک جال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ خطوط چھوٹے چھوٹے سیاہ داغوں سے جا کر ملتے ہیں۔ جنہیں "نخلستان" کہتے ہیں یہ نخلستان وسعت میں بڑے چھوٹے ہوتے ہیں جن کا اوسط قطر ۱۳۰ میل ہوتا ہے۔ ان میں بہت ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے جھیلیں اور اُن سے نہریں چاروں طرف اس طرح نکلتی ہیں جیسے پہیہ کے وسط سے آرے اگر کوئی داغ بڑا ہوتا ہے۔ تو اس میں سے سات نہریں نکلتی ہیں ان میں ایک دھبہ

بہت بڑا ہے جسے سورج کی جھیل کہتے ہیں۔ اس کا قطر ۳۰۰ میل ہے اور طول ۴۵۰ میل۔ اس میں سے دو دھری نہریں نکلتی ہیں۔ جن کا طول اوسطاً کم ہے سب سے بڑی نہر ان میں ۲۵۰۰ میل ہے۔ ان نہروں کی اوسط چوڑائی ۳۰۰ میل ہے اب تک ۲۰۰ نہروں سے زیادہ دیکھی جا چکی ہیں۔ جن کے نقشہ کھینچ کر نام بھی رکھدئے گئے ہیں۔ مشاہدات دوربینی اور فوٹوگرافی دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہریں ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک باقاعدہ جاتی ہیں۔ ہر زاویہ پر ان نہروں کا پورا انقاطع ہوتا ہے۔ اور کئی نہریں ایک ہی مرکز پر آکر مل جاتی ہیں کسی جگہ دو نہریں ایک دوسرے کو قطع کر کے سیدھی چلی جاتی ہیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ جس مقام پر پہلے ایک نہر دکھائی دیتی تھی رات بھر میں اسی مقام پر دوسری نہر نمودار ہو گئی اور یہ دونوں نہریں متوازی بہتی ہیں۔ ان توأم نہروں کا درمیانی فاصلہ عموماً ۵۰ یا ۲۰۰ میل ہوتا ہے۔ بعض توأم نہروں کے فوٹو بھی لئے جا چکے ہیں۔

ان نہروں اور نخلستانوں کی تشریح پروفیسر پکرنگ اور لوویل نے اس طرح کی ہے کہ چونکہ مریخ میں پانی کم ہے۔ اس لئے قطبین کی پگھلنے والی برف سے مخرج کا کام لیا جاتا ہے۔ اور وہاں سے پانی پیدا ہو کہ تنگ نہروں کے ذریعہ سے چاروں طرف تقسیم کیا جاتا ہے ماہرین فلکیات کو جو خطوط نظر آتے ہیں۔ وہ نہریں نہیں بلکہ نباتاتی منطقے ہیں جو بہار کی آمد پر نمایاں ہو جاتے ہیں

اور موسم سرما میں غائب ہو جاتے ہیں۔

یہی توجیہ نخلستانوں کی گئی ہے۔ اُس واقعہ سے مندرجہ بالا دلیل کو اور بھی زیادہ تقویت ہوتی کہ نخلستان صرف نہروں کے سنگم پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظریہ کا تسلیم کر لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ کرۂ مریخ میں قریباً قرن سے ایسی مخلوق آباد ہے۔ جو نہایت عقیل و فہیم ہے اور پانی کی قدرتی کمی کو انہوں نے آبپاشی کے وسیع کاموں سے پورا کیا ہے۔

مگر بعض دیگر ہیئت دانوں کا خیال یہ ہے کہ جب مریخ میں موسم گرما ہوتا ہے تو وہاں رات کے وقت بارش ہوتی ہے جس کے باعث سبزہ نمودار ہو جاتا ہے پہلے ان سیاہ رقبوں کو سمندر خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اب امر یقینی یہ ہے کہ یہ طبقات موسم کیساتھ اپنا رنگ بدلتے ہیں۔ موسم سرما میں رنگ غائب ہو جاتا ہے اور بہار میں پھر پیدا ہو جاتا ہے یہ موسمی تغیر نہروں کی وجہ سے نہیں بلکہ رات کے وقت بارش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ وسیع رقبے جو زرد سے سیاہی مائل بھورے ہو جاتے ہیں وہ دلدلیں ہیں جن کے رنگ میں پانی کے عمق کی وجہ سے فرق پڑتا ہے۔

ایک انگریز محقق ڈبلیو۔ ایچ۔ وٹھ (؟) اس بات کا یقین نہیں کرتا کہ سطح مریخ پر جو نظام انہار ہے وہ مصنوعی نہیں یعنی انجینیروں کا بنایا ہوا نہیں ہے وہ کہتا ہے" کہ ممکن ہے بمقابلہ زمین کے مریخ میں تبخیر کم ہوتی ہو اس لئے وہاں

بڑے بڑے تالاب ہوں گے۔ جن میں برف پگھلنے کے بعد پانی بھر جاتا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ مریخ کی نہریں مسقف ہوں تاکہ پانی سوکھ نہ جائے۔

مسٹر مارکونی نے حال ہی میں جو لاسلکی امواج کے منتقل کرنے کا آلہ ایجاد کیا ہے۔ اس سے ممکن ہے۔ کہ کسی وقت ہم لاسلکی پیام مریخ یا زہرہ تک براہ راست پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ مارکونی کا بیان ہے کہ وہ یقیناً دوسری دنیاؤں سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ وہاں ایسے لوگ آباد ہوں جو ہمارا پیغام سمجھ سکیں اگر وہ ہمارا پیغام سن سکیں گے تو یقیناً وہ جواب بھی دے سکیں گے۔

مشہور موجد اڈیسن کی یہ رائے ہے کہ غالباً اور سیاروں کے باشندے اب بھی اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم سے بات چیت کریں ان کی پیشین گوئی ہے کہ آئندہ چند سال کے عرصہ میں مختلف سیاروں کے درمیان لاسلکی طریقہ پیغام رسانی قائم ہو جائیگا۔ امریکن سائینس داں میک آئی کہتا ہے۔ کہ "مجھے کامل یقین ہے کہ مریخ میں آبادی ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اسے بہت جلد ثابت کیا جا سکے گا۔"

(نگار جون / جولائی ۱۹۳۲ء)

وقت و زمان کی حقیقت

س :- قریلیو! اب کیا وقت ہے؟

ق :- سات بج کے ۲۳ منٹ آئے ہیں۔

س :- اوہو! میرے اندازہ سے کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ "سات بج کر تیئیس منٹ" کے کیا معنی ہیں؟

ق :- اس کے معنی یہ ہیں کہ دوپہر کے بعد سات گھنٹے اور ۲۳ منٹ گزر چکے ہیں

س :- معاف کیجئے میں ابھی نہیں سمجھا مگر مہربانی کر کے یہ بتا دیجئے کہ گھنٹے اور منٹ کیا چیز ہیں؟

ق :- جناب یہ تقسیم اوقات کے آحاد ہیں، ایک سیکنڈ وقت کی سب سے

چھوٹی اکائی ہے اور ساٹھ سیکنڈ مل کر ایک منٹ اور ساٹھ منٹ مل کر ایک گھنٹہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو ایسی بات ہے جسے آپ اور ہم دونوں جانتے ہیں۔

س :۔ بالکل درست ہے لیکن جس چیز کا نام آپ نے "وقت" رکھا ہے وہ کیا چیز ہے؟

ق :۔ یہ بتانا تو بہت دشوار ہے کہ "وقت" کیا چیز ہے لیکن اس امر کا احساس کہ کچھ واقعات زمانہ ماضی میں گذر چکے ہیں کچھ واقعات "اب" رونما ہو رہے ہیں، اور کچھ واقعات ایسے ہیں جن کی نسبت ہم کو زمانہ مستقبل میں پیش آنے کی توقع ہے۔ وقت کی تعیین کرنے کے لئے کافی ہے۔

س :۔ تو کیا واقعی "وقت" کچھ اصلیت رکھتا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت ہے۔

ق :۔ یقیناً! اس سے زیادہ کھلی ہوئی بات اور کیا ہو سکتی ہے وقت ایسی ہی حقیقت رکھتا ہے۔ جیسی ہماری اور آپ کی ہستی اگر وقت معدوم ہو جائے تو اس کے ساتھ ہماری ہستیاں بھی معدوم ہو جائیں۔ ہم کو بہت سے واقعات ایسے معلوم ہیں جو زمانہ ماضی میں گذر چکے تھے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ "اب" کیا ہو رہا ہے اور ہم آئندہ یا مستقبل کی توقع لیں جیتے ہیں۔

س :۔ مجھے یہ بات سن کر بہت تعجب ہو رہا ہے سنیئے! ہم وقت کی نسبت

کہا کرتے ہیں کہ کبھی زمانۂ ماضی تھا، آئندہ زمانہ مستقبل ہوگا۔ اور اب زمانہ حال ہے۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مستقبل زمانۂ حال کے بعد آتا ہے۔ اور ماضی زمانہ حال سے پیشتر گزر جاتا ہے۔ حالانکہ اگر ہم وقت کی نسبت یہ خیال کریں کہ وہ ہمارے ساتھ ساتھ گزرتا ہے اور اپنے ساتھ ہمارے تجربات بھی لاتا رہتا ہے۔ تو اس صورت میں مستقبل کو سب سے آگے ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر ہم اپنی نسبت یہ سمجھیں کہ ہم خود وقت سے گذر رہے ہیں تو ہمیں سب سے اول زمانہ ماضی سے گذرنا چاہیئے اس کے بعد مستقبل سے۔ مگر نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ماضی اس وقت تک ہرگز ماضی نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان واقعات کو نہ دیکھ لیں جن کا تعلق اس زمانہ سے ہے۔ اور یہ واقعات ہمیشہ زمانہ حال میں گذرتے ہیں پس یہ امر یقینی ہے کہ ہم مستقبل سے کبھی نہیں گزریں گے سہولت استدلال کے لئے یہ تصور کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وقت ہمارے ساتھ ساتھ گذرتا ہے اس صورت میں مستقبل سب سے آگے ہوگا۔ اسی طرح جو واقعہ گزرنے والا ہے۔ وہ ہم سے زیادہ قریب ہوتا جائے گا۔ جب وہ واقعہ رونما ہو رہا ہوگا۔ تو وہ حال ہوگا۔ اور جب وہ واقعہ ہو چکے گا تو ماضی اب آپ بتایئے کہ حال کی نسبت آپ کیا سمجھتے ہیں!

ق:۔ یہی کہ مثلاً ہماری گفتگو زمانہ حال سے تعلق رکھتی ہے آپ اور ہم دونوں

"اب" باتیں کر رہے ہیں۔ یعنی جیسے آپ اب کہتے ہیں یہی ہے حال۔

س :- دیکھیے! آپ کی زبان نے سب سے آخری لفظ "حال" ادا کیا ہے تو کیا یہ کہنا مناسب ہوگا۔ کہ یہ واقعہ اب ماضی ہو گیا ہے؟

ق :- یقیناً ماضی بن گیا ہے۔ اور بالکل اسی طرح وہ آخری لفظ جو میری زبان سے نکلتا جاتا ہے ہر لمحہ ماضی بنتا جاتا ہے لیکن میں "حال" کا تصور زیادہ عام اور عملی معنی میں کر رہا ہوں۔

س :- اگر ہم علمی گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے الفاظ بالکل "نپے تلے" ہونا چاہئیں۔ اگر آپ کسی چیز کے "تصور عمومی" پر بھروسہ کریں گے۔ تو بتائیے کہ آپ حد فاصل کا خط کہاں کھینچیں گے؟

ق :- یہاں بیشک ایک مشکل پیش آتی ہے آپ ہی بتائیں کہ خط کہاں کھینچا جائے گا۔

س :- جب ہم اپنی قوت شعور سے کام لیکر یہ تعین کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ مستقبل کہاں ختم ہوتا ہے اور ماضی کہاں سے شروع ہوتا ہے تو ہم کامیاب نہیں ہوتے اور اس بارہ میں کوئی خاص رائے قائم نہیں کر سکتے کہ "حال" کا زمانہ کب تک رہتا ہے اگر اس بات کا زیادہ گہری نظر سے تجزیہ کیا جائے۔ تو ہمیں یہ صرف ایک خط فاصل معلوم ہوتا ہے جس میں "عرض" کچھ نہیں اور عین جس وقت ہم پر کوئی واقعہ

گزرتا ہے۔ اس کے لمحہ بھر بعد وہ واقعہ ماضی سے متعلق ہو جاتا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

ق:۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے ہاں آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے۔

س:۔ قرلیطو! کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل جو اُن واقعات سے معمور ہے جن کا ہنوز ظہور نہیں ہوا۔ درحقیقت کوئی وجود رکھتا ہے؟ یا ایک واقعہ جو ایک ہزار سال پیشتر گذر چکا ہے اب بھی بحیثیت واقعہ کوئی حقیقی وجود رکھتا ہے؟

ق:۔ نہیں! میرے خیال میں تو نہیں رکھتا۔

س:۔ اگر مستقبل اور ماضی واقعی یقینی حقیقتیں ہیں پھر "حال" کا وجود کہیں نہیں رہا۔ لیکن بغیر حال کے ہماری ہستی ہی غائب ہو جاتی ہے کیونکہ ہم نہ ماضی میں رہ سکتے ہیں نہ مستقبل میں اور بقول آپ کے حال ضرور ہونا چاہیئے۔ لہٰذا تمام وقت "حال ہی حال" ہے کہئے آپ کا کیا خیال ہے؟

ق:۔ میرا تو دماغ چکرا گیا۔ اور میں از روئے منطق آپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا لیکن مستقبل، حال اور ماضی ضرور ہیں۔

س:۔ اچھا تو اب آپ اس معاملہ کو دوسرے پیرایہ میں سمجھئے یعنی واقعات کا مقابلہ کیجئے۔ آپ وقت کی نسبت کیا جانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہم کو شعوری طور پر اس کا علم حاصل ہے۔ کیا اس سے آپ کا مطلب

یہ ہے کہ آپ دماغی یا ذہنی طور پر اس کے وجود کا احساس کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے قوائے احساس قطعی ناقابل اعتبار ہیں چنانچہ میں ثابت کئے دیتا ہوں فرض کیجئے۔ کہ اسی گھنٹہ میں ایک شخص مسمیٰ زید کسی ایسے شغل میں مصروف ہے۔ کہ جس میں اس کو بیحد لطف حاصل ہو رہا ہے مثلاً شطرنج۔ اور اُسی وقت دُوسرا شخص بکر نہایت اضطراب کے ساتھ کسی کام کے ہونے کا منتظر ہے جس میں دیر ہوتی جاتی ہے اب ان دونوں کے پاس اپنے اپنے قوی احساس کے سوا اور کوئی طریقہ وقت شماری کا نہیں ہے تو تبلایئے کہ زید کے نزدیک وہ گھنٹہ طویل ہوگا یا قلیل؟

ق :۔ یقیناً قلیل ہوگا۔

س :۔ اور بکر کے نزدیک کیا ہوگا؟

ق :۔ طویل۔

س :۔ ایک ہی گھنٹہ ایک شخص کے لئے قلیل ہوگا اور دوسرے کے لئے طویل ـــــ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

ق :۔ بیشک وقت تو ایک ہی ہے لیکن جو فرق آپ نے بیان کیا ہے وہ ان دونوں شخصوں کے حسیات و محسوسات کا فرق ہے جو ذہن کی مختلف حالتوں سے اثر پذیر ہیں۔ اب میں تسلیم کئے لیتا ہوں کہ وقت کے متعلق ہمارے قوائے احساس ہمیشہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔

س :- اچھا تو اس صورت میں وقت یا تو ایسی کوئی چیز نہیں جو ہستی انسانی سے علیحدہ کوئی وجود حقیقی رکھتا ہو۔ یا پھر ہر شخص کے ساتھ وقت کی حیثیت جداگانہ ہوتی ہے اور اسی صورت میں وقت لاشئی محض قرار پاتا ہے۔

ق :- میں اس وقت آپ کے دلائل کو نہ تسلیم کرتا ہوں نہ ان کی تردید کر سکتا ہوں۔ لیکن آپ سلسلہ گفتگو جاری رکھیں کیونکہ آپ کا طریقۂ تجزیہ بہت دلچسپ ہے :-

س :- اسی "گھنٹہ" سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ گھنٹہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا تھا۔ کہ وہ وقت کی ایک "اکائی" ہے پس جبکہ ہمارے قوی احساس اس قدر نا قابل اعتبار ہیں تو پھر ہم وقت کا اندازہ یا پیمائش کس طرح کر سکتے ہیں آپ اس کا جواب غالباً یہ دیں گے کہ گھنٹہ اس حصہ وقت کہتے ہیں کہ گھڑی کی منٹ والی سوئی ڈائل کی ایک گردش پوری کرے۔ لیکن اگر میں اپنے ہاتھ کی انگلی سے منٹ کی سوئی کو ڈائل کا ایک پورا چکر دے دوں تو کیا یہ وقت ایک گھنٹہ ہو جائے گا؟

ق :- یقیناً نہیں۔ ایسا دعوی کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

س :- گویا منٹ کی سوئی کی رفتار بالکل یکساں اور اس معیار کے مطابق ہونا چاہیئے۔ جس کی پابندی تمام گھڑیاں کرتی ہیں لہذا جس چیز کو ہم وقت کہتے ہیں۔ وہ اس طریقہ استدلال کے بموجب محض حوادث

حرکاتی ہیں داخل ہونے والی ایک چیز ہے یا کم از کم اس کا تعلق حرکت سے ہے۔ اور ہم اس کی پیمائش حرکت اور وسعت کے لحاظ سے کرتے ہیں یعنی ایک مادی چیز جیسے منٹ کی سوئی کہتے ہیں وہ ایک مقررہ اور یکساں رفتار کے ساتھ ایک مقررہ فاصلہ طے کرتی ہے تو ہمیں وقت معلوم ہوتا ہے وقت کی پیمائش یا محسوس کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہم کو معلوم ہے لیکن جس طرح حرکت، وسعت زمانی وقت نہیں ہے اسی طرح وقت بھی حرکت وسعت نہیں۔ حرکت اور وسعت دونوں قطعی مختلف چیزیں ہیں اس لئے وقت، ان دونوں متضاد چیزوں کا مرکب بھی نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ وقت (جیسا کہ ہم اس کی نسبت عموماً خیال کرتے ہیں) تجربات و واقعات انسانی سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا کیونکہ حرکت اور وسعت ایسی چیزیں نہیں جو دونوں ملکر ایک تیسری مستقل چیز پیدا کر سکیں تو گویا ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے جو ہم نے پہلے اخذ کیا تھا یعنی یہ کہ وقت کوئی چیز نہیں ہے۔ اور جو کچھ ہے وہ حال ہی حال ہے۔

ق :- آپ کے جو جی میں آئے کہئے۔ میں تو اپنی اسی رائے پر قائم ہوں جو پہلے تھی۔

س :- تحقیق و تدقیق کے لئے خواہ آپ کتنے ہی مختلف طریقے اختیار کر لیں۔

لیکن کیا آپ یہ تسلیم نہ کریں گے۔ کہ آخر میں یہی نتیجہ نکلتا ہے ؟

ق :- ہاں منطقی لحاظ سے تو یہی بات ہے۔

س :- آپ کو جو دقت پیش آ رہی ہے وہ محض اس قدر ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ خیال نہایت پختہ ہو گیا ہے کہ وقت ایک چیز ہے۔ جو مستقل وجود رکھتی ہے اور اس کے تین حصے ماضی، حال اور استقبال ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا کئے جا سکتے ہیں اور اسی خیال کی وجہ سے ہم ان نتائج کو منظور نہیں کرتے جن تک ہم از روئے منطق پہنچے ہیں لیکن اگر ہم ان منطقی نتائج کو منظور کر لیں تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا۔ کہ حالات میں کوئی تغیر ہو جائے گا۔

ق :- قطع کلام معاف! اگر یہ نتیجہ جو آپ نے اخذ کیا ہے صحیح ہے۔ اور جیسا کہ آپ کا منشا ہے اس نتیجہ سے وقت لاشئ محض رہ جاتا ہے۔ تو لازم ہو گا۔ کہ انسان کے اندر ایک ہر چشمہ رستیاب ابدی قائم ہو جائے کیونکہ اگر وقت کوئی چیز نہیں اور جو کچھ ہے وہ حال ہی حال ہے تو پھر کوئی شخص بوڑھا نہیں ہو سکتا ہر شخص ہمیشہ جوان رہے گا۔ پھر اس بڑھاپے کی آپ کیا علت بیان کریں گے یا آپ انسان کی اس حالت سے بھی انکار کر بیٹھیں گے۔ جسے بڑھاپا کہتے ہیں ؟

س :- میں اس سے ہرگز انکار نہیں کرتا۔ اگر آپ ذرا تامل کے ساتھ اس

بات پر غور کریں کہ بڑھاپا کیا چیز ہے؟ تو میں آپ کو بہت جلد بڑھاپے کی وجہ بتا دوں گا۔ اور وہ بھی ایسے طریقے سے جو میرے استدلال کے عین مطابق ہو۔ سنو! بڑھاپا نام ہے۔ صرف تغیر کا جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شخص کے چہرے میں جھریاں پڑ گئی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ "بڑھاپا آگیا" فرض کرو کہ ایک بیست سالہ نوجوان کے بال کسی غیر فطری سبب سے سفید ہو گئے ہیں۔ اس کے چہرہ پر جھریاں پڑ گئی ہیں۔ چلتے ہوئے اس کے قدم رک رک کر پڑتے ہیں۔ تو محض صورت دیکھ کر ہم "بڑھاپے" کا فتویٰ دیدیں گے۔ اگر کسی کپڑے کا رنگ اڑ جائے اور وہ گھس جائے تو ہم کہتے ہیں کہ "پرانا ہو گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی غور کیجئے کہ ایک جوہری کی دکان میں کسی انگشتری کے اندر حال ہی میں ایک بیش قیمت ہیرا جڑا گیا ہے۔ خواہ وہ ہیرا کسی زمانہ میں بلقیس ملکہ سبا نے پہنا ہو تو کیا آپ یہ کہہ دیں گے۔ کہ یہ انگشتری "پرانی" ہے۔ کیا آجتک کسی نے کسی ہیرے کو پرانا کہا ہے؟ نہیں۔ کیونکہ ہیرے میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ اس لئے وہ "نیا" ہو گا۔

ق:۔ میں نے اس بارہ میں اس طرح کبھی فکر نہیں کیا۔ پھر بھی وہ ہیرا خواہ کوئی ہیرا ہو پرانا ہی کہلائے گا۔

س:۔ اچھا اب میں اس مسئلہ کو زیادہ واضح کرنے کے لئے ایک دوسرا

سلسلۂ خیال قائم کرتا ہوں۔ ہمارے استادوں نے حروف ابجد کی ترتیب اسی طرح سکھلائی ہے کہ ہم الف سے شروع کرکے ترتیب وار یا تک سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ جب ہم حروف تہجی اپنی زبان سے بولیں گے اور یا تک پونچیں گے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ ہم الف کہہ آئے ہیں اب آپ ہی فرمائیے کہ دونوں میں کون "پرانا" ہوا یعنی الف یا یا۔ ظاہر ہے کہ ہم نے یا سے پہلے الف کہا تھا۔ لیکن اس وجہ سے الف بمقابلہ یا کے پرانا نہیں ہوگیا۔ اب اسی مثال کا اطلاق آپ اور جگہ بھی کیجیئے۔ یعنی حالات طبعی کے ماتحت ایک چکنا اور صاف چہرہ سیاہ بال اور چکیلا رخسار عموماً ایک جھریوں دار چہرہ سے بیشتر اسی ایک شخص کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس وجہ سے اور کیوں؟ مگر ہوتا ہمیشہ یوں ہی ہے۔ جب ہم بزاز کی دکان سے کپڑا خریدتے ہیں تو کپڑے کی چمکدار اور خوشنما حالت پہلے اور اس کی خستہ اور بوسیدہ حالت بعد میں ہوتی ہے۔ لیکن جس کاریگر نے وہ کپڑا تیار کیا ہے اس نے اس کپڑے کی حالت ننگے جانے سے بھی قبل دیکھی تھی۔ اس وقت کپڑے کی مکروہ اور بدنما حالت پہلے تھی۔ اور اس کی خوشنما اور رنگین حالت بعد میں ہوئی تھی۔ اس طرح گویا کپڑے کی یہ موخر الذکر حالت "پرانی" ہوگئی۔ اور وہ مکروہ اور بوسیدہ حالت پہلی ہوئی۔ کیا یہ بات قانون

قدرت کے مطابق ہوگی۔ کہ ایک شخص جھریوں والا چہرہ اور سفید بال لیکر پیدا ہو اور جب اس کی دنیوی زندگی کا اختتام ہو تو اُس کا چہرہ صاف روشن اور اُسکے بال سیاہ ہو جائیں اگر یہ حالت ہو تو جن علامات کو ہم جوانی کی علامات سمجھتے ہیں وہ بڑھاپے کی اور بڑھاپے کی علامات شباب کی نشانیاں سمجھی جائیں گی۔ لہذا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وقت یا عمر سلسلۂ تغیرات کا ایک منظر ہے۔

اس مسئلہ پر زبان کے ذریعہ سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ آج سے قبل زمانہ ہوا' حال ہی میں' وغیرہ ان سب الفاظ سے فاصلہ یا وسعت کا اظہار ہوتا ہے مگر جب ہم کہتے ہیں کہ "وقت بہت جلدی گذرا" چشم زدن' "وقت اڑا چلا جا رہا ہے" "وقت کٹتا ہی نہیں" وغیرہ تو ان محاورات سے حرکت' کا اظہار ہوتا ہے۔ کیا آپ وقت کی نسبت کوئی اور حقیقت بیان کر سکتے ہیں۔ جو حرکت و وسعت سے متعلق نہ ہو؟

ق :۔ کیوں نہیں! ہم روز کہتے ہیں کہ "بڑا کٹھن وقت ہے" یا وقت اچھا گذرا یا دہ اور وقت ہتے' ان جملہ محاورات سے وقت کی حالت کا اظہار ہوتا ہے۔ پیمائش نہیں ہوتی۔ لیکن یہ محض استعارے اور تشبیہات ہیں۔

س :- اچھا تو اب اس مسئلہ پر عملی طریقہ سے غور فرمائیے۔ فرض کیجئے کہ آپ شکاگو سے نیویارک تک براہ ڈٹرائیٹ سفر کر رہے ہیں اگر آپ کو ڈٹرائٹ میں کوئی دیر نہ ہو تو آپ دیکھیں گے۔ کہ ونڈسر کی گھڑی کے حساب سے آپ ایک گھنٹہ اور کچھ منٹ میں ونڈسر پہنچے حالانکہ ریل پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ اور فاصلہ صرف چند میل کا ہے۔ اب اپنی گھڑی کو ونڈسر کی گھڑی کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھئے تو معلوم ہو گا۔ کہ وہ ایک گھنٹہ سست ہے اور وہ ہمیشہ اتنی ہی سست رہیگی جب تک آپ ڈٹرائٹ کے مشرق میں رہیں گے یعنی یہاں آپ باندازہ ایک گھنٹہ زیادہ معمور رہیں گے اور آپ کی سالگرہ ہمیشہ ایک گھنٹہ پیشتر ہوگی۔ اس تغیر کا سبب یہ ہے کہ آپ کا جسم اس رفتار سے زیادہ تیز حرکت کرتا رہا جس رفتار سے زمین اپنے محور میں گردش کرتی ہے۔ اور اس لئے وقت پورا کرنے کے لئے آپ کو ہر پندرہ درجہ طول البلد کے بعد اپنی گھڑی ایک گھنٹہ بڑھانا پڑے گی۔

اگر آپ بحر الکاہل میں کسی جہاز پر ہوتے اور آپ کا سفر خط استوار کے قریب جانب مشرق ہوتا اور آپ جزائر فیجی کی کسی بندرگاہ میں پہنچے اور پھر وہاں سے شنبہ کے روز بارہ بجے بذریعہ طیارہ جزائر سامواکو جاتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ وہاں کی جنتری کی رو سے وہ دن اتوار ہے اور وقت کے لحاظ سے شام کے تین بجے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر زمین کے

گرد مغرب سے مشرق کی طرف سفر کیا جائے۔ تو بجائے گھنٹہ کے پورا ایک دن ضائع ہوتا ہے۔ کیونکہ مسافر زمین کے مقابلہ میں ایک گردش زیادہ کر لیتا ہے۔

ق: یہاں تک تو آپ نے صحیح فرمایا اور ان واقعات سے آپ کے استدلال کی تائید ہوتی ہے لیکن اصلی بات یعنی وقت کا مسئلہ بدستور باقی رہا۔ آپ یہ بیان فرمائیں کہ ایک ہفتہ یا ایک مہینہ کیونکر ضائع ہو سکتا ہے۔

س:۔ ہفتے اور مہینے محض تعدادی باتیں ہیں۔ یعنی ہفتہ دنوں کا مجموعہ اور مہینہ سال کا ایک حصّہ ہے۔ سات مرتبہ زمین کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف چکر لگا لیجئے تو ایک ہفتہ ضائع ہو جائیگا۔ اور اگر یہی عمل تیس یا اکتیس مرتبہ کیا جائے۔ تو ایک مہینہ ضائع ہو جائیگا۔ فرض کیجیئے کہ ہماری زمین کی طرح کا ایک اور سیارہ ہے اور اس میں ہماری زمین کی طرح انسانوں کی بھی آبادی ہے اور یہ سیارہ محور زمین کے اندر اندر آفتاب کے گرد زمین سے نصف مدت میں گردش کرتا ہے۔ لیکن اپنے محور پر زمین سے دگنی رفتار کے ساتھ گھومتا ہے۔ اور جس طرح زمین کا محور اس کے مدار سے زاویہ بناتا ہے۔ اسی طرح اس سیارہ کا محور بھی وہی زاویہ بناتا ہے۔ اور اس سیارہ میں بھی موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اگر یہ صورت ممکن ہو اور میں اس سیارہ پر یکم جنوری ۱۹۲۸ء کو پہنچوں اور دیکھوں کہ وہاں کے آدمی بھی ہماری طرح

وقت کی پیمائش کرتے ہیں تو معلوم ہوگا۔ کہ وہاں گھنٹہ والی گھڑی کی سوئی اتنے عرصہ میں ڈائل کے دو چکر لگاتی ہے۔ جتنے عرصہ میں وہ سیارہ اپنے محور کے گرد گھوم کر دن اور رات پیدا کرتا ہے اگر میری گھڑی اسی طرح چلتی رہی جیسے کہ وہ زمین پر چلتی تھی اور وقت بھی بالکل صحیح دے اور میں اپنی گھڑی کی حرکت کی بنا پر یوم شماری کروں تو یکم جولائی ۱۹۲۸ء کو میں اس سیارہ کے فلک پر اسی مقام میں ہوں گا۔ جہاں میں نازل ہوا تھا۔ اور اس وقت یہاں پھر موسم سرما کا وسطی زمانہ ہوگا۔ اور بہار، گرما، خزاں اور سرما کا نصف زمانہ گزر چکا ہوگا۔ اور یہاں کے جو باشندے میرے اردگرد ہوں گے وہ اپنے حساب سے بمقابلہ میرے چھ ماہ "بڑے" ہوں گے۔ کیونکہ ان کے نزدیک تو وہ دن یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہوگا۔ اب فرض کیجیئے کہ میں بھی انہیں لوگوں کے حساب پر چلنے لگا۔ تو جب یہ سیارہ ایک پوری گردش اور طے کر لیگا۔ تو ان کے حساب سے پھر یکم جنوری ۱۹۳۰ء ہوگا۔ اگر اس وقت مجھے کچھ ایسے ذرائع حاصل ہوں کہ میں اس زمین پر اپنے احباب سے فوراً رسل و رسائل اور نامہ و پیام کر سکوں تو وہاں سے جواب آئیگا۔ کہ کرۂ زمین پر اس وقت یکم جنوری ۱۹۲۹ء ہے حالانکہ میرے نزدیک وہ دن یکم جنوری ۱۹۳۰ء تھا۔ کیا قریطو یہ معاملہ اسی طرح نہ ہوگا؟

ق :- ہاں ہوگا تو ایسا ہی۔

س ۔ اچھا ایک بات اور فرض کرو کہ وہ سیارہ جس پر میں جا اترا تھا اپنے محور پر سال بھر میں ایک مرتبہ گردش کرتا ہے۔ اور میں اس سیارہ پر اس طرف ہوں جو سورج کے سامنے ہے تو جب یہ سیارہ اپنے فلک پر دو گردشیں کر چکے گا۔ تو میں زمین کی طرف اس مقام کے عین بالمقابل ہوں گا۔ جہاں سے میں روانہ ہوا تھا۔ اور اگر میں نے آفتاب کی روشنی کے لحاظ سے وقت شماری کی ہوتی تو میرا کچھ بھی وقت ضائع نہ ہوتا اور اگر اس وقت میں پھر اپنی زمین پر نازل ہو جاؤں تو اس وقت بھی میرے نزدیک یکم جنوری ۱۹۲۸ء ہوگا۔ کیوں ہوگا یا نہیں ؟

ق ہاں میرا بھی یہی خیال ہے لیکن اگر ایک سال کا فرق اسی طرح معلوم کیا جا سکتا جس طرح کسی درخت کے تنہ کے اندر ہر سال کی لکیریں یا حلقے دیکھنے سے معلوم کیا جاتا ہے تو واقعۃً آپ ایک سال بڈھے ہو گئے ہوتے

س ۔ قریطو! میں دیکھتا ہوں کہ تم میری بات نہ مانو گے۔ جو خیال تمہارے دل میں جم گیا ہے۔ تم اسی کے غلام بنے رہو گے۔ اور اس مسئلہ پر جو دلائل پیش کئے جا رہے ہیں وہ خالی الذہن ہو کر نہ سنو گے بقول تمہارے اگر کسی شخص کی عمر صحیح طور پر صورت دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے تو اس کا باعث یہ ہوگا۔ کہ اس شخص کی صورت شکل میں کچھ تغیر واقع ہوا۔ اور یہی بات میں نے ابتدا میں کہی تھی۔ دیکھو! یہ تغیرات کیمیاوی تبدیلیوں کا نتیجہ ہوگا۔

جو جسم کے مادی ذرات یا اعضاء جسمانی کے افعال میں ہوتا رہتا ہے اگر یہ تغیرات اس دوسرے سیارہ پر دوگنی رفتار سے ہوتے تو میں ضرور بعول تمہارے بقدر ایک سال بوڑھا ہوتا یعنی اس شخص سے میری عمر ایک سال زیادہ ہوتی جو میری ہی ولادت کے روز پیدا ہوتا۔ مگر رہتا زمین ہی پر۔ اور جس صورت میں کہ میں اس دوسرے سیارہ پر ہر وقت نور آفتاب میں تھا۔ اور وہ سیارہ اپنے فلک پر دو گردشیں پوری کر چکا اور اس وقت میرے جسم کے اندر کسی قسم کے تغیرات واقع نہ ہوئے تو میں اس شخص سے جو میری ہی ولادت کے روز پیدا ہو کر زمین پر رہا تھا۔ بقدر ایک سال چھوٹا ہوتا۔ اگر زمین پر نظام جسمانی کے اندرونی تغیرات دوگنی رفتار سے واقع ہوا کرتے تو طبعی حالات میں ہم لوگ چالیس برس کی ہی عمر میں اس قدر بوڑھے اور ناکارہ ہو جایا کرتے جیسے کہ اب اسی سال کی عمر میں ہوتے ہیں۔

پس ظاہر ہو گیا کہ وقت جسکی پیمائش گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں سے کی جاتی ہے۔ اس کا انحصار بالکل اس میکانکی واقعہ پر ہے۔ کہ زمین اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی ہے اور اگر اس زاویہ نظر سے دیکھا جائے جس میں ہم چیزوں اور آدمیوں کی عمروں کا اندازہ ان کی صورتوں سے کرتے ہیں تو جس چیز کو وقت کہتے ہیں وہ بالکل ذرات مادی کی کیمیاوی حرکت یا سرگرمی پر مبنی ہے اور ہم اس کی پیمائش کسی چیز یا شخص

کے درجۂ انحطاط یا قلب ماہیت کے ذریعہ سے کرتے ہیں اور اس صورت میں ہمارے پیمانہ کی اکائی وہ چیز ہوتی ہے۔ جو جدید ہو۔

پس ثابت ہوا کہ جہاں تک دنیا کی خارجی اور کائنات کا تعلق ہے وقت ایک لاشئے محض چیز ہے۔ ایک ہزار برس ایک دن اور ایک ہزار سال ہو سکتے ہیں اور اگر احساس کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وقت محض ایک اعتباری چیز ہے۔ پس سمجھ لو کہ وقت کوئی چیز نہیں ہے اور ہم ہمیشہ ایک "ابدی اب" یا "سرمدی حال" میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نگار۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

عورت کے ساتھ دُنیا کا سُلوک

نظامِ تمدن میں مسئلہ "نسائیات" نے اب اس قدر اہمیت اختیار کر لی ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ پر اُس وقت تک کوئی مکمل بحث نہیں ہو سکتی جب تک خدا کی اس "نازک" مگر اسی حد تک "اہم" مخلوق کا ذکر نہ کیا جائے۔ کیونکہ عالم اخلاق کا کوئی پہلو عورت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور عمرانیت و مدنیت کا مفہوم اک "وہم" ہو کر رہ جاتا ہے اگر جنسِ نازک کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ایک مرد، عورت کی فطرت حیا پسندی اور عزلت نشینی کو دیکھ کر یہ حکم لگا سکتا ہے کہ وہ کارگاہ عالم میں ایک ساقط الاعتبار چیز ہے اس کے نرم و نازک اعضا اس کے سریع الاثر قلب کا لحاظ کر کے سمجھتا ہے۔ کہ وہ دُنیا

ہیں صرف رونے اور کڑھنے کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم ایک لمحہ کے لئے اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے۔ کہ اس کی یہی فطری خلوت پسندی تھی جس نے کائنات کے ایک ایک راز کو مرد پر ظاہر کر دیا۔ اور اس کی یہی نرمی و نزاکت تھی۔ جس نے سخت ترین منازل حیات طے کرنے میں ہماری مدد کی۔

بلاشبہ ایک مرد اس پر فخر کر سکتا ہے کہ اس نے اپنی کاوش و جستجو سے ارتقاء تمدن میں نمایاں حصہ لیا۔ یقیناً وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ "بخار و کہربا" کو اپنا خادم بنا کر اس نے انسان کو صحیح معنی میں انسان بن جانے کا موقعہ دیا۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ امریکہ اس نے دریافت کیا۔ دنیا کے بلند ترین کوہستانی سلسلہ کے مرتفع ترین نقطہ پر پہنچنے کی کوشش میں اس نے جانیں دیں اور اپنے فساعات و اختراعات و انکشافات و ایجادات سے اسی نے "خلافۃ اللہ فی الارض" کی حقیقت کو وا شگاف کیا۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اخلاقی دنیا جو حقیقی محرک ارتقاء تمدن کی ہے۔ عبارت ہے صرف "عورت" سے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے وہ اس احساس کو محو نہیں کر سکتا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سلطنتوں کی بنیاد مرد ہی نے قائم کی۔ قوانین اسی نے وضع کئے۔ علوم و فنون اسی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور سلسلہ اسباب و علل کو اس نے نمایاں کیا۔ لیکن اس کے ساتھ کیا ہم اس حقیقت کو نظر انداز

کر سکتے ہیں کہ :- للمرأۃ سلطنۃ فی نظراتھا اکثر نفوذاً من القوانین ودموعھا اقوی حجۃ من الشرائع۔ یعنی عورت کی نگاہیں وہ کام کر جاتی ہیں جن سے بادشاہوں کی شوکت وجبروت بھی عاجز نظر آتی ہے۔ اور اس کے آنسو ایسے قوی دلائل ہیں جن کے سامنے دنیا کا ہر قانون اپنی سپر ڈال دیتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے کہ عورت دنیا میں اس قدر اہمیت لیکر آئی تھی۔ باوصف اس کے کہ ہم اس قدر شدت سے اس کے محتاج ہیں فطرت کا یہ کس قدر عجیب و غریب فیصلہ ہے۔ کہ اس قابلِ احترام طبقہ کی سب سے زیادہ توہین کی گئی اور اسی "رحم آموز" جنس پر زیادہ مظالم روا رکھے گئے۔

نسائیات کی قدیم تاریخ دنیا کی ایسی دردناک داستان ہے کہ مشکل سے کوئی شخص اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی صحت کا یقین کر سکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ واقعات محو نہیں ہو سکتے۔ اور اس لئے یہ بد نما داغ انسانیت کی پیشانی سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔ کہ مرد نے اسی آغوش کو زخمی کیا۔ جس آغوش میں اس نے پرورش پائی اور اس نے اسی سینہ کو مجروح کیا جس سے اس کا رشتۂ حیات و آمال وابستہ تھا۔

اگر اس عہد سے قطع نظر کر لیا جائے جسے عہد وحشت و بربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو بھی کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ عہد تہذیب و عمرانیت میں بھی کوئی ایسا وحشیانہ سلوک نہیں تھا۔ جو

جو عورت کیساتھ روا نہ رکھا گیا۔ اور دنیا کی کوئی ذلت ایسی نہ تھی۔ جو اس مظلوم طبقہ کو برداشت کرنا نہ پڑی ہو مشکل سے کوئی مسئلہ ایسا ملیگا جس میں اس قدر کثرت کیساتھ لوگوں نے اتفاق رائے سے کام لیا ہو۔ جتنا عورت کے مسئلہ میں وہ متحد الخیال ہیں۔ مطالعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سوائے شاذ صورتوں کے ہر شخص نے اسی امر پر زور دیا ہے۔ کہ عورت کی فطرت مرد کے مقابلہ میں بہت کمزور اور ادنیٰ ہے۔ حتیٰ کہ زمانہ قدیم میں یہی امر مابہ النزاع تھا۔ کہ عورت کے پاس نفس (mind) ہے یا نہیں۔

ہندو چین، یونان و روما میں بھی جو تہذیب و شائستگی کے گہوارے سمجھے جاتے تھے۔ عورت سے احتراز کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جیسا کہ ان کی روایات علم الاصنام سے ثابت ہوتا ہے، چنانچہ خود جیوپیٹر سے ایک دیوتا نے پوچھا "کہ سلسلہ تناسل کے مسئلہ میں تو ہمیں عورت کی طرف سے کیوں بے نیاز نہیں بنا دیتا" (اور شائد اسی غرور کی سزا ہے کہ اب مکانکی ذریعہ تو الدو تناسل کا طریقہ زیر غور ہے، جس میں مرد کی ضرورت بالکل باقی نہیں رہتی) ایک جگہ اور اسی قسم کی درخواست پیش کی گئی کہ "اس آفتاب کے نیچے مردوں پر عورتوں کی بلا کیوں مسلط کی گئی ہے"۔

بروایت انٹرڈیکی، یونانیوں کا خیال عورت کے متعلق ان کے اس فقرہ سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آگ سے مل جل جانے اور سانپ کے

ڈسنے کا علاج ممکن ہے لیکن عورت کے شر کا مداوا محال ہے۔"

سقراط کہتا ہے کہ "عورت سے زیادہ فتنہ و فساد کی چیز دنیا میں اور کوئی نہیں۔ وہ دفلی (D نلسہند) کا درخت ہے کہ بظاہر بے انتہا خوبصورت و خوشنما نظر آتا ہے لیکن جب کوئی چڑیا اُسے کھاتی ہے تو مر جاتی ہے۔"

افلاطون کا قول ہے کہ "جتنے ذلیل و ظالم مرد ہیں وہ سب دوسرے عالم میں عورت ہو جاتے ہیں۔" پھر عورت کی ذلت کا خیال صرف حکما، و فلاسفری کے دماغ میں مرکوز نہ تھا۔ بلکہ مذہبی دنیا میں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ قدیس برنار کہتا ہے کہ "عورت، شیطان کا آلہ ہے" یوحنا دمشقی کا قول ہے کہ "عورت، مکر کی بیٹی ہے" اور امن و سلامتی کی دشمن" بلکہ روایات انجیل کے مطابق حضرت عیسٰے کا خود اپنی ماں کو جھڑک دینا ظاہر ہے۔

یورپ اور علی الخصوص رومۃ الکبریٰ جو عیسویت کا مرکز تھا۔ اور جہاں مبلغین کی جماعتیں ہر جگہ تعلیمات مسیح کی تبلیغ کرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اس لحاظ سے اس قدر گرا ہوا تھا کہ مشکل سے اس کی کوئی دوسری نظیر مل سکتی ہے۔ یہاں عورتوں کی حالت لونڈیوں سے بدتر تھی۔ ان پر ایک جانور کی طرح حکومت کی جاتی تھی۔ اور یقین کیا جاتا تھا۔ کہ اس طبقہ کو آرام و آسائش کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ذرا ذرا سے قصور میں یہ ذبح کر دی جاتی تھیں اور محض بے بنیاد الزامات پر آگ میں ڈال دی جاتی تھیں۔ سولہویں اور سترہویں

صدی عیسوی میں جب جادو کا اعتقاد نہایت رسوخ کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہو گیا تھا اس وقت اکثر صورتوں میں غریب عورت ہی پر الزام رکھا جاتا تھا اور وہی ظلم کا شکار ہوتی تھی۔

الگزنڈر ششم نے ۱۴۹۴ء میں، لوئی دہم نے ۱۵۲۱ء میں، اڈرین ششم نے ۱۵۲۲ء میں جس بیدردی کے ساتھ عورتوں اور ان کے بچوں کو سحر کے الزام میں ذبح کیا۔ اس سے تاریخ یورپ کے صفحات رنگین ہیں۔ ملکہ الزبتھ اور جیمس اول کے عہد میں ہزاروں عورتوں کا اس جرم میں جلایا جانا اور لانگ پارلیمنٹ کے زمانہ میں سولی دیا جانا تاریخ کے کھلے ہوئے واقعات ہیں۔

اسکاٹ لینڈ کا بادشاہ جیمس ششم جب ڈنمارک سے شادی کر کے واپس آیا۔ تو اس سے کہا گیا کہ چند عورتوں نے راستہ میں جمع ہو کر طوفان برپا کرنے کا سحر کیا ہے۔ چنانچہ یہ عورتیں گرفتار کی گئیں اور اقبال جرم کے لئے انہیں جسمانی سزائیں دی جانے لگیں۔ اور جب اس تکلیف سے عاجز آ کر انہوں نے اقبال کیا تو سب کی سب ذبح کر دی گئیں۔

اسی طرح انگلستان میں عورتوں کو سزا دینے کے لئے ایک خاص مجلس وضع کی گئی۔ جس نے عورتوں پر ظلم کرنے کے لئے جدید قوانین مرتب کیے۔ الغرض سارے یورپ نے اس صنف پر ستم کرنے کا عہد کر لیا تھا جس کا

نتیجہ بقول ڈاکٹر اسپرنگ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے ۹۰ (نوے) لاکھ عورتوں کو زندہ جلادیا۔"

چونکہ زمانہ قدیم میں ایک عورت جنس کاسد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی اخلاقی حیثیت اس وقت کس درجہ زبون رہی ہوگی ایران میں بیوی اور بہن کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ مشرق کے نصاریٰ نہ ماں کو ماں سمجھتے تھے اور نہ بہن کو بہن اور ہندوؤں کے ہاں ایک عورت متعدد بھائیوں کی بیوی بن سکتی تھی۔ پھر لطف یہ ہے۔ کہ نہ شریعت موسوی نے اس طرف توجہ کی نہ حضرت داؤد اسکا کوئی مداوا کر سکے۔ اور جس طرح حضرت یعقوب کی نبوت اس باب میں کامیاب ثابت نہیں ہوئی اسی طرح مسیح کی صلح کل رسالت بھی اسی غریب طبقہ کی فریاد کو نہ پونچ سکی۔ اسی کے ساتھ ہندوستان میں نہ وید مقدس نے عورت کی اخلاقی حالت کو بلند کرنے کی کوشش کی اور نہ بودھ نے اس صنف کیلئے کوئی قانون مقرر کیا۔

سرزمین عرب میں بھی جہاں آخر کار نبی آخر الزمان نے ادیان سابقہ کی اس فروگذاشت کی پوری تلافی کرنے کا عزم استوار کر لیا عورت کا شمار بدترین مخلوقات عالم میں سے تھا۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

اِنَّ النِّسَاءَ شَیَاطِیْنٌ خُلِقْنَ لَنَا   نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ الشَّیَاطِیْنِ

جب رئیس ہیراہ کی لڑکی نے انتقال کیا تو ابوبکر خوارزمی نے ان الفاظ

میں اظہار تعزیت کیا کہ اگر تم اس کے ستر و حجاب اور اس کی صفات حمیدہ کا ذکر کرتے تو تمہارے لئے بہ نسبت تعزیت کے تہنیت زیادہ موزوں تھی کیونکہ ناقابل اظہار چیزوں کا چھپ جانا ہی بہتر ہے۔ اور لڑکیوں کا دفن کرنا ہی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ ہم ایسے زمانہ میں ہیں۔ کہ اگر کسی شخص کی بیوی اس سے پہلے مرگئی۔ تو گویا اس کی نعمتیں مکمل ہوگئیں اور بیٹی کو اس نے قبر میں اُتار دیا تو گویا اپنے داماد سے پورا انتقام لیا۔

ایک شاعر کا قول ہے کہ :۔

تھویٰ حَیَاتِی وَاَھْوِیٰ موتھا شَفَقاً وَالموتُ اَکْرَمُ نُزُلُ عَلَی الحَرَمِ

" وہ میری زندگی چاہتی ہے اور میں از روئے شفقت اس کی موت چاہتا ہوں۔ کیونکہ موت عورت کے حق میں عزیز ترین مہمان ہے "۔

آج یورپ اپنی تہذیب و مدنیت، اپنے اخلاق کی بلندی اور احترام جنسِ لطیف کا بہت بڑا مدعی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ تاریخ کے شواہد اس کے خلاف ہیں۔ اور اسی دور میں جب کہ تعظیم نسائیت کا پرچم اس درجہ اہتمام کے ساتھ بلند کیا جا رہا ہے، مدنیت کا بطون کچھ اور کہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈانٹی اور بیبرڈ ارک نے ایک حد تک عورت کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ اور شیکسپئیر نے بھی اپنے ڈراموں میں عورت کا اخلاقی پہلو بلند دکھایا ہے۔ اسی طرح فرانس کا مشہور شاعر زول بھی اس خیال کا حامی

نظر آتا ہے۔ اور قرون وسطیٰ میں جرمنی کے شاعر ہنریک فون مسن نے بھی عورتوں کی تعریف میں متعدد نظمیں لکھی ہیں لیکن اول تو اس قسم کے واقعات بہت شاذ ہیں اور جو ہیں بھی وہ بالکل بیکار و عبث، کیونکہ حقیقی معنی میں وہ عورت کی کوئی مدد نہیں کر سکے۔ اور اس کی حیثیت نے ایک مزدور آلۂ تفریح سے زیادہ ترقی نہیں کی۔

ایک فرانسیسی مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "عورت پر واجب ہے کہ وہ اپنے شوہر کا احترام کرے کیونکہ وہ اس کا آقا و مالک ہے ہر کام میں اس کی اطاعت کرے اور اس کی طبیعت کے مطابق اپنے کو بنائے۔ اسے چاہیئے کہ شوہر کے پاؤں دھوئے۔ گھر کی حفاظت کرے۔ اور اگر اپنے شوہر سے علیحدہ ہو تو اپنی صورت کسی کو نہ دکھائے"۔

عورتوں پر ظلم کرنے والوں میں وولٹر، روسیو، ڈیڈرو اور مونٹسکو کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ ہر چند یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے یورپ میں حریت آزادی کی بنیاد قائم کی۔ لیکن صنف نازک کے باب میں ان کے اقوال نہایت سخت ہیں۔ مونٹسکو کا قول ہے کہ "فطرت نے مرد کو قوت و عقل دی ہے اور عورت کو صرف زینت و خوشنمائی، اگر عورت سے یہ خارجی پردہ اٹھا لیا جائے تو اس کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ڈیڈرو سمجھتا تھا کہ "عورتیں صرف جسمانی لذات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں" روسیو نے اس خیال کو ذرا مہذب الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ "عورت

مرد کی مسرت کیلئے پیدا کی گئی ہے لیکن کیا مرد کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ عورت کی خوشی کا باعث ہو؟ اس کا جواب دیلیو مے ذرا کمزور رونا لفظوں میں صراحت دیا ہے کہ مرد کے ذمہ یہ فرض اس قدر اہم نہیں ہے۔"

یہی وہ خیال تھا جس کی بنا پر انقلاب فرانس صرف مردوں کے حقوق کا ضامن ہوا۔ اور عورت پر اس نے کوئی احسان نہیں کیا۔ چنانچہ نپولین نے بھی عزیزہ ہلنا میں ایک بار یہ خیال ظاہر کیا کہ "عورت فطرت کی طرف سے مرد کے لئے ایک عطیہ ہے تاکہ بچے پیدا کیا کرے۔ عورت ہماری ملک ہے۔ ہم عورت کی ملک نہیں ہیں" اور فرانس کا ایک مشہور شاعر صاف صاف الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ "میں فطرت سے صرف اس لئے برہم ہوں۔ کہ اس نے اس کمینہ جانور (عورت) کو محاسن مخو کر نے کے لئے کیوں پیدا کیا؟"

اہل جرمنی عورت کے ساتھ دشمنی کرنے میں بہت ممتاز نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس عداوت کی بنیاد علمی و فلسفی اصول پر قائم کی ہے۔ چنانچہ شوپنہاور لکھتا ہے۔ کہ "عورت کے تعقل و ادراک میں کبھی کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ اور وہ تمام عمر بچہ بنی رہتی ہے۔"

نٹشے نے دنیا کو ان مصائب سے ڈرایا ہے جو اس کے خیال میں عورتوں کے آزاد کرنے سے پیدا ہوں گے۔ اور وہ کہا کرتا تھا کہ "ہمارے زمانے کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ عورت کے دل میں مرد کا خوف کم ہوتا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا مقصد حیات صرف یہ ہے کہ وہ مرد کی قید میں رہے۔ اور اسکی

خدمت کرتی ہے؟

عورت کے متعلق وینیجر کا خیال سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ اس نے اس موضوع پر صرف ایک کتاب لکھی اور کتاب لکھنے کے بعد خودکشی کرلی۔ اس کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی لیکن اس کتاب نے اسے غیر فانی بنا دیا۔ اس کتاب میں اس نے وہ تمام لعنتیں اور برائیاں جمع کر دی ہیں۔ جو گذشتہ زمانہ سے اب تک عورت کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ اور ان تمام برائیوں کو علمی و فلسفی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ دنیا سے صرف اس لئے بیزار تھا کہ اس میں عورت جیسی ہستی پیدا کی گئی اور اس بیزاری کا ثبوت اس نے اپنی خودکشی کے ذریعہ سے پیش کیا[1]

---

[1] وینیجر کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت مرد دو متباین جنسوں میں منقسم نہیں ہیں یعنی ایسا کوئی مرد نہیں ہے جس میں صرف مردانہ اوصاف پائے جاتے ہیں اور نہ ایسی کوئی عورت ہے جس میں خالص نسوانی خصوصیات پائی جائیں۔ بلکہ ہر مرد و عورت میں دونوں قسم کے صفات پائے جاتے ہیں اسلئے مرد وہ ہے جس میں مردانہ صفات نسوانی صفات پر غالب ہوں اور عورت وہ ہے کہ جو اس کے برعکس ہو اور جس میں دونوں قسم کے صفات مساوی طریق پر پائے جائیں وہ مخنث ہے۔

اس اصول کی بناء پر چونکہ محبت کی حقیقت صرف فریقین کا تجاذب قرار پائی ہے اس لئے سب سے بہتر محبت وہ ہے۔ جو فریقین کے مردانہ و زنانہ صفات کے توازن پر قائم ہو۔ مثلاً اگر کسی شخص میں ۸۰ فیصدی مردانہ صفات اور ۲۰ فیصدی (بقیہ اگلے پر)

یہ نہایت تعجب خیز امر ہے۔ کہ عورت کی ترقی کو مرد نہایت حیرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ سکندر اعظم۔ نپولین اور گلیلیو کا کمال اس کو حیرت میں نہیں ڈالے گا۔ لیکن اس کے استعجاب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ کلیو پیٹرا۔ جون آف آرک اور کیتھرائن کے کارناموں کا مطالعہ کرتا ہے۔ چونکہ صنف نازک کی طرف سے سوء ظن مرد کی فطرت میں چلا آتا ہے۔ اس لئے وہ نسوانی ترقی کو مافوق العلوۃ بلکہ فطرت کی غلطی خیال کرتا ہے۔ مرد کے نزدیک عورت کی حکومت صرف عالم جذبات و عواطف پر ہو سکتی ہے۔ عقل و ادراک، غور و فکر، اور متانت و تدبر میں اس کا حصہ بہت کم ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ عورت میدان فکر و اختراع میں بھی مرد

زنانہ اوصاف پائے جاتے ہیں تو اسے ایسی عورت تلاش کرنی چاہیئے۔ جس میں ۵۰ فیصدی نسائیت اور ۵۰ فیصدی مردانہ خصائل پائے جاتے ہوں۔ ذینیجر کے نزدیک صنف نازک اور صنف قوی کا تجاذب اس علمی قانون کے ماتحت ہے، جسے ہم قانون استکمال کہہ سکتے ہیں، لیکن اقتدار، کمال اور تفوق اس کے نزدیک مرد ہی کا حصہ ہے اور دنیا میں جتنی صاحب کمال عورتیں گزری ہیں۔ ان کا کمال صرف اس وجہ سے تھا۔ کہ ان میں مردانہ صفات زیادہ پائے جاتے تھے۔ تاہم اس کے نزدیک بڑی سے بڑی عورت متوسط عقل کے مرد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ذینیجر کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ شہوانی خواہشات اور جسمانی لذتیں صرف حیات نسوانی کا کرشمہ ہیں۔ مرد کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ ان سے گذر جائے۔ لیکن ناممکن ہے اور اس سے فطرتاً وہ مرد کی قید میں رہنے کے لئے وضع کی گئی ہے۔

سے پیچھے نہیں رہ سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت مرد علوم و فنون میں عورت سے زیادہ ترقی کر چکا ہے لیکن یہ نتیجہ اس حقیقت کا نہیں ہے کہ مرد و عورت کے نظام عقلی و قوای دماغی میں فطرت نے کوئی فرق رکھا ہے۔ بلکہ یہ اس ظلم و تعدی کا نتیجہ ہے جو ازمنہ قدیم سے صنف نازک پر ہوتی چلی آتی ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جب کبھی کسی عورت کو ترقی کرنے کی فرصت ملی اور اس عہد کے ادبی و اجتماعی حالات نے اس کی مساعدت کی تو وہ کمالات انسانی میں کسی طرح مرد سے پیچھے نہیں رہی۔

پچھلے زمانہ میں اور خاص کر جنگ شروع ہونے کے بعد نسوانی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا ہونے لگا۔ اس نے کارخانوں میں جا کر کام کیا۔ اس نے ڈاکٹری سیکھی، وکالت کی۔ وظائف و مناصب کو حاصل کیا، اور اپنے تمام اعمال و اشغال سے ثابت کر دیا۔ کہ جن باتوں کو مرد صرف اپنے لئے مخصوص سمجھتا تھا انہیں عورت نے بھی اس خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ لیکن ابھی تک اس دور تہذیب و شائستگی اس عہد نہضت و ارتقا میں بھی مرد تجاہل سے کام لیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ عورت کی موجودہ ترقی عارضی ترقی ہے۔ اور وہ بہت جلد رجعت قہقری کر کے اپنے اصلی مرکز پر پہنچ جائے گی۔ لیکن اسے جاننا چاہیئے کہ نوع بشری کی اجتماعی رفتار اور اس کے مضبوط قوانین حقیقت کو مستور نہ رہنے دیں گے۔ اور اسے

اعتراف کرنا پڑے گا۔ کہ عورت تمام کمالات انسانی میں مرد کے دوش بدوش چل سکتی ہے۔ اور وہ صرف خادم و غلام بننے کے لئے دنیا میں نہیں آئی۔

علوم و فنون کے نشو و نما سے متعلق جو مباحث زمانۂ حال میں کئے جاتے ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ عورت میں ایجاد و اختراع کی بھی پوری قابلیت موجود ہے اور وہ تمدن و رفتار کا رُخ بدل سکتی ہے۔

لاسلکی در اصل ایک عورت ہی کی اختراع ہے۔ جس کا نام اودسا تھاسوت کاتنے کی صنعت ملکہ چین ہی کی ایجاد ہے۔ جو ہم صدی قبل مسیح پائی جاتی تھی اور گاڑیوں کو مسلح کرنا ملکہ سمیرامس ہی کے دماغ کا نتیجہ تھا۔ فن مصوری کے متعلق بھی یہی مرجح ہے۔ کہ اسے ایک یونانی عورت نے ایجاد کیا جس کا نام بیرد تھا۔ ہل کی نسبت بھی کیا جاتا ہے۔ کہ وہ عورت ہی کی اختراع ہے۔ علماء انتھروپالوجی (علم الانسان) نے ثابت کیا ہے۔ کہ عہد قدیم میں جب کہ انسان صرف شکار اور لوٹ مار پر زندگی بسر کرتا تھا۔ عورت گھر میں بیٹھ کر آلات ایجاد کیا کرتی تھی۔ جن پر آگے چل کر انسانی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی۔

اب تاریخ کو صرف اس لئے نہ پڑھنا چاہیئے۔ کہ وہ مرد کی تاریخ ہے تمدن کا مطالعہ صرف اس لئے نہ کرنا چاہیئے۔ کہ وہ مرد کے قوائے دماغی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اب تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیئے کہ تمام اعمال انسانی میں عورت بھی پوری حصہ دار ہے۔

زمانۂ قبل تاریخ کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت ہی نے سب سے پہلے زراعت شروع کی اور اُس نے زمین کو صاف کرکے اسے قابل زراعت بنایا۔ یہ انسانیت کے دھندلکے میں جب مرد شکار کرکے چمڑے لاتا تھا تو عورت ہی اس کے ملبوس تیار کیا کرتی تھی۔ اسی نے درختوں کی شاخوں سے مکان بنائے۔ اسی نے اُون کاتا، ملبوس کو بُنا، کمبل تیار کیا اور مٹی کے برتن بنائے۔

عورت ہی نے گاؤں میں بازار قائم کئے۔ اور ان بازاروں میں عورت ہی کو سیادت حاصل ہوئی جن پر بعد کو دنیا کے عظیم الشان تمدن کی بنیاد قائم ہوئی۔

اب میدان علم و اختراع کو دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ عورت نے یہاں بھی کارہائے نمایاں انجام دئیے۔ اور باوجود اس کے کہ خانگی مصائب اور منزلی فرائض کی وجہ سے اسے تحصیل علوم کا کوئی موقعہ نہیں ملا۔ اور نہ مردوں نے اس درجہ اسے آزاد رکھا کہ وہ آسانی سے اکتساب فنون کرسکتی۔ تاہم اس نے جو کچھ کیا وہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کون شخص ہے۔ جو فلسفہ وضعی (Positive Philosophy) کی بانی صوفیا جرمان کو بھلا سکتا ہے۔ جس کی مہارت علوم ریاضیہ میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی۔ اور فلکیات میں عورتوں کے اکتشافات سے کون انکار کرسکتا ہے۔

آغانیس مصریہ کا حرکت افلاک کو دیکھکر صحیح صحیح پیشین گوئی کرنا اور تھلی کی مشہور عورت اگلاونیس کا کسوف و خسوف کے حالات بتا دینا۔ اُس زمانہ میں جب کہ مرد بھی علم الافلاک سے زیادہ واقف نہ تھے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اسکندریہ کی مشہور فلاسفر عورت ہیپاتھیل کے علمی کارناموں سے تاریخ کے صفحات معمور ہیں۔ جس نے اسطرلاب ایجاد کیا۔ اور سب سے پہلے علم جبر میں ایک تصنیف ملک کے سامنے پیش کی۔

جرمنی کی تاریخ ہیری کو بینسا اور مارگریٹ کرش کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ جن کی علمی تصانیف داکتشافات کا ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اس طرح فرانس کی جان ڈومی، میڈم دو شاتلی (جس نے نیوٹن کے فلسفہ طبیعی کا ترجمہ کر کے اس پر نہایت مفید حواشی کا اضافہ کیا) میڈم پوٹ ہیڈم لالونڈ، میڈم دو بیری، میڈم ویلا رسو اور میڈم کلیمانس (جس نے تالیفات ڈاروِن کا ترجمہ کیا) ان خواتین میں سے ہیں جنہیں تاریخ علم و ادب میں ہمیشہ نمایاں جگہ دی جائے گی۔ ترکیب الاجسام الفلکیہ پر سب سے پہلے جس نے کتاب لکھی وہ مسز ڈیم ہجر کی بیوی تھی۔

اختراعات و ایجادات کے سلسلہ میں میڈم کوری کو زمانہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا جس نے ریڈیم دریافت کیا اور اخلاقیات و سیاسیات میں بھی زمانہ قدیم سے لیکر عہد حاضر تک کوئی قرن ایسا نہیں گزرا کہ عورتوں نے ان میں کافی حصّہ نہ لیا ہو۔ ملکہ تھیوڈورا، ملکہ ذی نیا (اسپین کی ملکہ) اسابلہ (روس کی ملکہ) میڈم رولینڈ (جس نے آزادی فرانس میں بڑا حصّہ لیا) اور لیوسی اسٹون (جو غلاموں اور عورتوں کی آزادی کی زبردست حامی تھی) وغیرہ کثرت سے ایسی عورتیں ہوئی ہیں

ہیں۔ جن کے احسان سے دُنیا سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

خاص سرزمین عرب میں بھی جسقدر ادیب و فاضل عورتیں ہوئی اور فراست و شجاعت، ذہانت و فیاست کی جسقدر نسوانی مثالیں ریگستان عرب سے رونما ہوئیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔

پھر دیکھنا یہ ہے کہ وہ عورت جو باوجود اس قدر ضروری عنصر انسانیت ہونے کے ہمیشہ ٹھکرائی گئی۔ اور جو عہد جدید میں بھی ـــــ باوجود اپنے ان تمام کارناموں کے ناقابل التفات چیز خیال کی گئی۔ اسلام نے کس حد تک اس کے احترام کا حکم نافذ کیا اور اس کو انسانیت کی کس سطح پر لاکر روشناس کیا۔

جو کچھ صفحات ما سبق میں بیان کیا گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ تہذیب جدید نے عورت کو علمی و عملی میدان میں بھی مرد کے دوش بدوش کام کرنے کا اہل ثابت کر دیا ہے اور آجکل یورپ کی معاشرت اس کی شہادت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ آپ یہ بھی دیکھیں گے۔ کہ اخلاقی نقطہ نظر سے عورت کی حالت گر گئی ہے۔ اور اسی بناء پر بعض کا خیال ہے کہ عورت کے لئے تعلیم جدید یا اس کی آزادی مفید نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسا خیال کرنا حقیقتاً واقعات سے غلط نتیجہ اخذ کرنا ہے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ عورت کی تربیت کی طرف کبھی صحیح اعتنا نہیں کیا گیا۔ اور اس کا وہ اخلاقی زوال جو ازمنہ قدیم سے شروع ہوا تھا۔ اب بھی بدستور جاری ہے۔

البتہ اسلام اور صاحب۔ اسلام نے جو اسوہ اس طبقہ کیلئے پیش کیا اور تعلیم و تربیت کے جس اصول کو پیش نظر رکھا وہ یقیناً ضامن تھا۔ عورت کی تکمیل ترقی کا اور ہمارے پاس ایسی مثالیں موجود ہیں کہ سرزمین عرب نے جہاں عورت کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اس کی تعلیم کی بدولت چند دنوں میں نسائیت کے وہ وہ نمونے پیش کرے کہ اب مشکل سے ان کی نظیر مل سکتی ہے۔

اگر اسلام نے ایک طرف عورت کیلئے بھی تعلیم و ترقی کا دروازہ مردوں کے دوش بدوش کھول دیا تو دوسری طرف ان کو اخلاقی تعلیم دے کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس لحاظ سے ان کی حالت "آبگینوں" کی طرح ہے جو ذرا سی ٹھیس سے چور چور ہو جاتے ہیں۔

یوں تو کائنات کا ہر ہر ذرّہ انوار الٰہی کا مظہر ہے لیکن روحانیت قبول کرنے کے لئے عورت جس قدر موزوں پیدا کی گئی ہے ویسی کوئی دوسری مخلوق نہیں ہے چنانچہ اسلام نے سب سے پہلے عورت کو جس طرف متوجہ کیا وہ اس کی روحانیت تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرون اولیٰ میں آپ تقویٰ و عبادت کا ایک خاص رنگ محسوس کریں گے۔ اور دیکھیں گے۔ کہ انہوں نے اسلام کے لئے کیسے کیسے شدائد برداشت کئے۔ اور مذہب کی خاطر انہوں نے اپنے عزیز ترین تعلقات دنیاوی کو بھی منقطع کر دیا۔

حضرت سمیہ نے جب اسلام قبول کیا تو کفار نے انہیں سخت اذیتیں

دینا شروع کیں۔ یہاں تک کہ گرم ریت پر دھوپ میں کھڑا کر دیتے تھے اور وہ تلملایا کرتی تھیں ایک دن وہ اسی حال میں زمین پر تڑپ رہی تھیں کہ رسول اللہ کا گذر ہوا آپ نے یہ حال دیکھ کر فرمایا کہ سمیہ گھبراؤ نہیں صبر کرو۔ جنت تمہارا ٹھکانہ ہے۔" یہ وہ اذیت تھی۔ کہ اگر مرد بھی کوئی ان کی جگہ ہوتا تو اسلام کو ترک کر دیتا۔ لیکن وہ آخر وقت تک ثابت قدم رہیں اور کوئی اذیت انہیں اسلام سے منحرف نہ کر سکی۔ یہ تھی عزم و استقلال کی وہ روح جو اسلام نے اپنی ماؤں کے اندر پیدا کی۔ تاکہ ان کی اولاد بھی اسی ارادہ و ثبات کو لے کر پیدا ہو جس سے ایک قوم کا مستقبل تیار ہو۔

پھر حضرت عمرؓ نے قبل اسلام لانے کے اپنی بہن کو جس قدر تکلیفیں پہنچائیں وہ بھی کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ اور صلح حدیبیہ کے بعد بہت سی صحابیات کا اپنے کافر شوہروں کو چھوڑ دینا بھی تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔

عبادات کے سلسلہ میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد مخصوص چیزیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی پابندی کما حقہ ادا کرنا بہت مشکل ہے لیکن آپ دیکھیں گے۔ کہ اس باب میں اسلام نے اپنی عورتوں کے اندر بھی وہ شمع پیدا کر دی تھی۔ جو دوسرے مذاہب کے مردوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ اس کے ساتھ جذبۂ ایثار و فدویت کا جو رنگ تھا وہ اور سونے پر سہاگہ تھا۔

جب غزوہ احد میں حضرت صفیہ اپنے بھائی سید الشہداء حضرت حمزہ

کے کفن کیلئے دو کپڑے لائیں تو آپ نے دیکھا کہ ان کی لاش کے پاس ایک اور انصاری کی بھی برہنہ لاش پڑی ہوئی ہے۔ آپ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنے بھائی کو وہ دو کفن دیں اور اسی انصاری کو نظر انداز کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ایک کفن اس انصاری کے لئے قرعہ کے ذریعہ سے علیحدہ کر دیا۔

ایک بار رسول اللہ نے خطبۂ عید میں صدقہ خیرات کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔ اس مجمع میں صحابیات بھی موجود تھیں۔ انہوں نے اپنے کانوں کی بالیاں اور انگلیوں کے چھلے تک دیدئے۔ حضرت اسماء کے پاس صرف ایک لونڈی تھی۔ انہوں نے اس کو بیچ ڈالا۔ اور سارا روپیہ صدقہ میں دے دیا۔ یہ تھا وہ جذبۂ ایثار و فدویت جس میں تمام صحابیات ڈوبی ہوئی نظر آتی تھیں۔

عبادات کے بعد نہایت اہم چیز معاملات ہیں جن کا تعلق عام اخلاقی انسانی سے ہے۔ سو اس میں بھی آپ صحابیات کو مردوں سے کسی طرح کم نہ پائیں گے۔ فضائل اخلاق میں ایثار کا مرتبہ ہے۔ سو اس کا یہ حال تھا۔ کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ روزہ سے تھیں۔ اور گھر میں صرف ایک روٹی موجود تھی۔ ایک مسکین عورت آئی تو آپ نے لونڈی کو حکم دیا۔ کہ روٹی اسے دیدے۔ لونڈی بولی کہ "افطار کس چیز سے کیجئے گا" آپ نے فرمایا۔ کہ تم تو دیدو پھر دیکھا جائیگا۔ حضرت اسماؓ کی فیاضی ضرب المثل تھی۔ کہ وہ کل کے لئے ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہ رکھتی تھیں اور روزانہ سب کا سب صدقہ و زکوٰۃ میں دے دیا کرتی تھیں۔

ازواج مطہرات میں حضرت زینب بنت جحش کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے چمڑے کی دباغت کیا کرتی تھیں۔ اور اس کی آمدنی ساری کی ساری غربا کو دے دیا کرتی تھیں۔

کینہ پروری اور انتقام جوئی عورت کی فطرت ہے خصوصاً اس وقت جب کہ معاملہ رقابت کا ہو۔ لیکن یہ اسلام ہی کی تعلیم کا اثر تھا کہ جب حضرت عائشہ سے حضرت زینب کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "مجھے ان کی نسبت جو کچھ معلوم ہے وہ اچھا ہی اچھا ہے اور اس میں برائی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔"

انصاف پسندی کا یہ عالم تھا۔ کہ معاویہ بن خدیج حضرت عائشہؓ کے بھائی محمد ابن ابی بکرؒ کو قتل کر چکے ہیں۔ لیکن جب حضرت عائشہؓ سے معاویہ کی بابت دریافت کیا جاتا ہے۔ تو وہ ان کی تعریف کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کا سلوک لوگوں کے ساتھ اچھا تھا۔

صلۂ رحم و ہمدردی کا خیال اس قدر بڑھا ہوا تھا۔ کہ خادموں کے ساتھ بھی کسی قسم کی سختی کو روا نہ دیکھا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ رات کو عبدالملک نے اپنے خادم کو آواز دی۔ آنے میں دیر ہوئی تو اس نے خادم پر لعنت بھیجی حضرت ام الدرداءؓ بھی اس کے محل میں تھیں۔ صبح کو انہوں نے عبدالملک سے کہا کہ "رات کو تم نے خادم پر لعنت بھیجی حالانکہ رسول اللہ نے اس کی سخت ممانعت کی ہے۔

علمی خدمات کے سلسلہ میں بھی مسلم عورتوں کے کارنامے کم نہیں ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ فیضانِ اسلام نے اس وقت کی عورتوں میں حد درجہ صلاحیت و اہلیت پیدا کردی تھی۔ اس باب میں حضرت عائشہؓ کی خدمات بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور آپ کے متعدد واقعات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کس درجہ صحیح الرائے اور مستقیم الفکر واقع ہوئی تھیں۔ اور آپ کا طرز استدلال کتنا مسکت اور برمحل ہوا کرتا تھا۔ کلام مجید میں کوہ صفا و مروہ کا طواف کرنے کے متعلق یہ حکم آیا ہے کہ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۔ (صفا و مروہ خدا کے شعائر ہیں۔ اس لیے جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر وہ ان پہاڑیوں کا بھی طواف کرے)

عروہ نے حضرت عائشہؓ سے اس کے متعلق سوال کیا کہ کلام مجید کے طرز عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صفا و مروہ کے طواف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یعنی اگر اس کو ترک کردیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اگر آیت کا وہ مطلب ہوتا جو تم سمجھے ہو تو یوں ارشاد ہوتا کہ فَلَا جُنَاحَ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا (یعنی اگر ان کا طواف نہ کرو تو کوئی حرج نہیں ہے) اور چونکہ یہ آیت قبائل اوس و خزرج کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ جو اسلام سے قبل منات کے جے پکارتے تھے۔ اور بعد اسلام صفا و مروہ کے طواف کو اس لیے برا

سمجھتے تھے۔ کہ وہاں مناۃ نصب تھا۔ اس لئے خدا نے ارشاد فرمایا کہ وہاں کے طوائف میں کوئی حرج نہیں۔

حضرت عائشہؓ کے علمِ قرآنی کا دوسرا واقعہ قرآن مجید کی اس آیت سے متعلق ہے۔ حتیٰ اذا استایئس الرسل الخ علاوہ اس کے اور بھی متعدد واقعے ایسے ہیں جن سے حضرت عائشہؓ کی ذہانت اور ان کا تفقہ فی الدین ظاہر ہوتا ہے۔

فن حدیث میں روائیت کا بڑا مرتبہ ہے لیکن حضرت عائشہؓ کو حقیقتاً اس کا موجد سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ سب سے پہلے آپ ہی نے اس اصول کو استعمال کیا۔ چنانچہ مردے پر اس کے اہل و عیال کے رونے کی وجہ سے عذاب نازل ہونے کی حدیث آپ کے سامنے پڑھی گئی تو آپ نے اس کی صحت سے انکار کر دیا۔ کیونکہ درایتاً وہ ناقابلِ قبول ہے اور ثبوت میں کلام مجید کی اس آیت کو پڑھا۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کوئی شخص دوسرے کی معصیت کے بوجھ کو نہیں اٹھائے گا۔

اسی طرح جب آپ کے سامنے یہ روائیت بیان کی گئی ہے کہ شب معراج میں رسول اللہ نے خدا کو دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ جو شخص یہ روائیت کرتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ خدا خود فرماتا ہے کہ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ

خدا کو کوئی نگاہ نہیں پا سکتی۔ معاملات میں صلۂ رحم اس قدر دشوار امر ہے کہ بڑے بڑے دیندار و محتاط لوگ ڈگمگا جاتے ہیں۔ لیکن صحابیات اس باب میں اپنے غیر مسلم قرابت داروں کا بھی پورا خیال رکھتی تھیں اور باہمی تعاون کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کے ذرا سی پھانس بھی چبھ جاتی تھی تو محلہ کی عورتیں حد درجہ خلوص و محبت کے ساتھ اس کی مدد کو حاضر ہو جاتی تھیں۔

الغرض اسلام نے عورتوں کے اخلاق بلند کر کے ان احترام کو مردوں پر واجب کر دیا۔ اور یہی وہ کمی تھی۔ کہ جس کو امم سابقہ کے ہادیین نہ سمجھ سکتے تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک عورت ترقی کر کے میدان عمل میں مردوں سے زیادہ محنت و جفاکشی کر سکے۔ یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ علوم و فنون میں اپنی اختراعات و ایجادات سے غیر معمولی اضافہ کا باعث ہو لیکن اگر اس کے اخلاق بلند نہیں ہیں۔ اگر وہ اپنی حقیقی نسائیت کھو چکی ہے تو پھر اس کی تمام ترقیاں بیکار ہیں۔ اور وہ ایک ایسا عذاب ہو کر رہ جاتی ہے کہ مرد کے لئے بھی دنیا دوزخ بن جاتی ہے۔

آج ہم مغرب کی تہذیب و معاشرت، وہاں کے طبقۂ لطیف کی پاکیزگی و ترقی کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں یقیناً یہ باتیں قابلِ رشک ہیں اگر اس کے ساتھ وہاں کی عورت کی اخلاقی حالت بھی ایسی ہی پاکیزہ ہو جیسی ان کی صورتیں ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہماری

کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ان کے شوق علم و ترقی کے ساتھ ہی اپنی عورتوں میں اُس اخلاق کو بھی پیدا کریں جسکی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

(اکتوبر ۲۰ء)



فرانس کی اعاظم پرستی

ملّی حمیّت و خودداری کا اک عجیب و غریب کارنامہ

(۱)

نپولین اعظم کے آخری ایام حیات جس عالم بیکسی میں بسر ہوئے وہ تاریخ فرانس کا نہایت دردمند واقعہ ہے۔ لیکن جس وقت اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ اس واقعہ سے قبل، سرزمین فرانس کے لئے نپولین نے کیا کیا قربانیاں کیں، کن کن اداؤں سے اس نے اپنے وطن پرستی کا ثبوت دیا اور ملک و قوم کی محبت میں اس نے کس طرح اپنے آپ کو فنا کر دیا تو اس واقعہ کی دردمندی اک نشانِ ہدائیت ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس کے عوض میں ایک شخص کے لئے جان دے دینا بھی حد درجہ آسان ہو جاتا ہے۔ اور اس تکلیف کے تبادلہ میں ایک قوم کے لئے اپنی بہترین ناحتمل سے دست بردار

ہو جانا بھی نہایت ارزاں سودا قرار پاتا ہے۔

نپولین نے فرانس کیلئے کیا کیا۔ فرانس کی ترقیاں کس حد تک اس کی ممنون ہیں۔ یہ تاریخ عالم کے وہ غیر فانی نقوش ہیں جنہیں زمانہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور جو ہمیشہ مجالسِ رزم و بزم میں دہرائے جائیں گے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے نپولین کو صرف ایک فاتح قائد اعظم کی حیثیت سے دیکھا ہے انہیں یہ صداقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔ کہ نپولین کو جو تعلق فرانس سے تھا اس کی بنیاد ملوکانہ عزائم پر قائم نہ ہوئی تھی۔ بلکہ اس شدید جذبۂ محبت پر استوار ہوئی تھی جسے اب فدویت و فداکاری سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر جس طرح نپولین کو اپنے ملک کیساتھ عشق تھا اسی طرح اہل فرانس میں بھی اس کے لئے حد درجہ عقیدتمندانہ شغف پایا جاتا تھا۔ اور یہی وہ رابطہ باہمی ہے جس سے ایک قوم کا مستقبل روشن ہوتا ہے۔ اور یہی وہ اخلاص پرستی ہے جس سے ایک ملک کی زندگی وابستہ ہے۔

جب ۱۸۲۱ء میں نپولین ایک دور افتادہ جزیرہ ہیلینا کے اندر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ تو صرف یہ خیال اس کے لئے تکلیف دہ تھا۔ کہ وہ فرانس سے باہر دم توڑ رہا ہے۔ اور اس کی نگاہ واپسیں اس فضا میں تحلیل ہو رہی ہے۔ جو اس کے وطن و ارباب وطن سے بہت دور ہے۔

لوگوں کو خیال تھا۔ کہ جس وقت نپولین کا وصیت نامہ پڑھا جائے گا۔ تو

اس میں خدا جانے کیا کیا خواہشیں، کیا کیا ہدایات نظر آئیں گی لیکن وہ بھی کیا دلگداز منظر تھا جب اس کی آخری تمنا کے بابت سوال کیا گیا۔ اور اس نے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا کہ :-

"میری ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے منتقل کر کے دریائے سین کے ساحل پر دفن کی جائیں۔ تاکہ میں اپنی قوم والوں کے ساتھ پرسکون گہری نیند سوتا رہوں"۔

افسوس ہے کہ اس عہد کے مسائل سیاسیہ نے اس وصیت کی تکمیل کو تعویق میں ڈالدیا اور کامل انیس سال تک نپولین کی لاش اسی غیر آباد جزیرہ میں مدفون رہی۔ ہر چند وفات نپولین کے تین ماہ بعد ہی حکومت فرانس سے درخواست کی گئی۔ کہ اس وصیت کو پورا کیا جائے اور اس کے بعد ہی ۱۸۲۲ء ۱۸۲۴ء اور ۱۸۲۶ء میں مسلسل طور پر کوشش کی گئی کہ نپولین کی ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے منتقل کر دی جائیں لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اس طویل عرصہ میں نپولین کی شہرت بڑھتی جاتی تھی۔ جھونپڑی میں رہنے والے سے لیکر محلات میں آرام کرنے والے تک اس کے غیر فانی کارناموں سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور اس کی عظمت و جلالت ہمت و استقلال کے واقعات سارے ملک میں مشہور ہو چلے تھے۔ چنانچہ فرانس کے مشہور شاعر وکٹر کے قلم سے بھی یہ الفاظ نکل گئے کہ :-

"تیرے مزار عزت سے عنقریب بدلیاں دور ہونے والی ہیں اور وہ

وقت دور نہیں جب تیری صاف اور روشن شعاعیں ہم تک آزادی سے آسکیں گی۔"

لیکن ابھی تک وہ وقت نہیں آیا تھا۔ اور تکمیل وصیت کی ساعت کسی اور موقعہ کی منتظر تھی۔

نپولین کے بعد عالم سیاست میں فرانس کی وہ عزت و وقعت باقی نہیں رہی تھی جو اس کی زندگی میں پائی جاتی تھی۔ لیکن یہ بھی فطرت کا کس قدر عجیب و غریب طریقہ کار ہے۔ کہ یہی وہ انحطاط تھا۔ جس نے پھر ایک بار اہل فرانس میں نئی روح پھونکدی اور پھر نپولین کی محبت اُن کے قلوب میں موجزن کر کے دکھا دی۔ نپولین کے بعد جس قدر زمانہ گذرتا جاتا تھا۔ فرزندان فرانس کے جوش دلی میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ جب اس کی ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے ساحل فرانس پر منتقل کی گئیں تو فرانس کے حسیات قومی کا تموج بکمال اضطراب بڑھ گیا۔ اور یورپ کے طول و عرض میں یہ صدا گونج اٹھی کہ:۔

"نپولین مرنے کے بعد اپنی قوم کو زندہ کرنے آرہا ہے"!

اور جرمنی کا مشہور شاعر ہنری ہیلنی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ" نپولین کی لاش جزیرہ ہیلینا سے ہماری طرف نہایت باقاعدہ قدم اٹھاتی ہوئی بڑھ رہی ہے۔ گویا وہ اپنی تہدید آمیز رفتار سے ہمارے مستقبل کو دھمکی دے رہی ہے

(۲)

جس زمانہ میں نپولین کی وصیت پوری ہوگئی وہ ایسا زمانہ تھا۔ جب حکومت اور قوم کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے تھے۔ اور فرانس کی اک بڑی جماعت "نپولین پرست" ہوگئی تھی۔ چونکہ قوم کے جذبات بڑی حد تک ناقابل ضبط ہو گئے تھے۔ اور سلطنت کے ارباب حل و عقد نے فرانس کی داخلی و خارجی سیاست سنبھالنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں دیکھا کہ رعایا کی متفقہ استدعا کو قبول کیا جائے اس لئے نپولین کی وہ وصیت جو زمانہ دراز سے التوا میں پڑی ہوئی تھی۔ اور جسکی تکمیل کے لئے اہل فرانس اصرار کر رہے تھے۔ پوری کی گئی۔ اور ملک کے جذبات بڑی حد تک ٹھنڈے ہو گئے۔

جب پہلی مئی ۱۸۴۰ء کی صبح کو جو شاہ فرانس کی "عید جلوس" کی صبح تھی۔ تمام وزراء و اراکین شاہی محل میں رسم تہنیت ادا کرنے حاضر ہوئے تو لوئی فلپ (شاہ فرانس) نے صدرِ اعظم تیرس کو مخاطب کر کے کہا کہ:-

"میں اس عید کی خوشی میں آپ لوگوں کے لئے ایک ہدیہ پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہدیہ یہ ہے کہ نپولین کی لاش اس کے محبوب وطن میں لاکر دفن کی جائے میں پرنس جوانفیل کو اس غرض کے لئے جزیرہ ہیلینا بھیجنا چاہتا ہوں اور تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اس باب میں وزارت برطانیہ سے مراسلت شروع کر دیا جائے۔ اس زمانہ میں موسیو گیزو فرانس کی طرف سے لندن میں

عہدۂ سفارت پر مامور تھا۔ چنانچہ اس نے برطانیہ کے وزیر اعظم سے اس مسئلہ کو طے کر کے فرانس کو اطلاع دی اور ۱۲ مئی ۱۸۴۰ء کو فرانس کی مجلسِ وزارت نے اس خبر کا اعلان کر دیا۔ کہ نپولین کی لاش جزیرۂ ہیلینا سے فرانس میں منتقل کی جائے گی۔"

ظاہر ہے کہ اس خبر سے اہل فرانس کو کس قدر مسرت ہوئی ہوگی۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا۔ جہاں اس اعلان نے شگفتگی اور تازگی نہ پیدا کر دی ہو اور کوئی قلب ایسا نہ تھا۔ جو حماست و شجاعت، اور فرانس کی گذشتہ سطوت و جبروت کے خیال سے معمور نہ ہو۔ مجالس تہنیت قائم کی گئیں۔ محافل طرب برپا ہوئیں۔ اور زندگی کی ایک نئی لہر ذرہ ذرہ میں دوڑ گئی۔

جب تمام مبادیات طے ہو گئے تو وزارتِ فرانس نے مصارف کا تخمینہ کیا اور ایک ملین فرانک کی منظوری دی۔ لیکن جمعیتِ انتظامی نے جو اس مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اس رقم کو ناکافی قرار دے کر ایک ملین فرانک کا اور مطالبہ کیا۔ چونکہ حکومت اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے چندے کے لئے اشتہار دیے گئے۔ اور لوگوں نے نہایت خوشی سے اس میں حصہ لیا۔ متبعین نپولین نے تو اپنا اثاث البیت تک فروخت کر دیا۔ اور اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ نپولین کی یادگار کہاں قائم کی جائے۔ بعض

نے کفنسہ ماڈلین تجویز کیا بعض نے نبھیون کی رائے دی۔ ایک جماعت نے منارہ فنڈم کو مناسب سمجھا۔ اور دوسری نے میدان کونکورڈ کو۔ ۳ فرکار سب اس پر متفق ہو گئے کہ نپولین کی لاش قصرِ انفالیڈ میں دفن کی جائے۔ جہاں فرانس کے بہت سے مفاخر حربی (Trophies) پائے جاتے ہیں۔

اس غرض کے لئے جو جماعت مرتب کی گئی تھی۔ اس میں نپولین کے وہ رفقا بھی شامل تھے۔ جو اس وقت تک زندہ موجود تھے۔ اور ان کا صدر پرنس جوانفیل کو قرار دیا گیا۔

۷ جولائی ۱۹۴۰ء کو شام کے سات بجے یہ جماعت بل پول جہاز پر جو فرانس کا بہترین جنگی جہاز تھا۔ بندرگاہ .... تولن سے ہیلینا کی طرف روانہ ہوئی۔

اس سفر کو مسلسل تین ماہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔ کہ ۷ اکتوبر کو دور سے خشکی کا حصہ نظر آیا اور ۹ اکتوبر کو بجے پرنس جوانفیل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خشکی پر اترا یہ جماعت سب سے پہلے حاکم جزیرہ کے مکان پر گئی۔ یہاں انہیں وہ کپڑے دکھائے گئے۔ جو نپولین کے زمانہ چلے آ رہے تھے۔ اس کے بعد نپولین کی قبر کی زیارت کی اور پھر اس مکان کو دیکھا۔ جہاں وہ محبوس تھا۔ اس مکان کی دیواروں پر سینکڑوں عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ جن سے ناظرین کے جذبات ظاہر ہوتے تھے ذیل کی ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نپولین کے ساتھ لوگوں کو کس قدر محبت تھی۔ اور اس کی یاد میں لوگ کس درجہ مضطرب تھے۔

"میتل دوپرو نے جو پہلے پولیس کا سپاہی تھا۔ صرف اس لئے جہاز امالیا کی ملازمت اختیار کی کہ وہ اپنے کاپورل صغیر[1] (Petit Caporal) کے مکان کی زیارت کر سکے۔" الوداع ۱۴ اکتوبر تک یہ جماعت تیاری میں مصروف رہی اور اس تاریخ کی رات کو اپنے محبوب بادشاہ کی لاش نکالنے روانہ ہوئی۔ آدھی رات کو یہ لوگ اس باغ میں داخل ہوئے۔ جہاں نپولین مدفون تھا۔ اور صبح کے وقت پچاس آدمیوں نے اُس پتھر کو ہٹایا جو قبر پر رکھا ہوا تھا۔ ۹ بجے صبح کو سب لوگ تابوت دیکھنے آئے۔ جس کے چار حصے تھے۔ پہلا لکڑی کا، دوسرا شیشے کا، تیسرا پھر لکڑی کا اور چوتھا جست کا۔ جب تابوت کھولا گیا۔ تو سب نے دیکھا کہ جسم کے اُوپر بڑی مقدار میں روئی رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے جو جمعیت کے ساتھ تھا۔ پاؤں کی طرف سے روئی ہٹانی شروع کی اور تھوڑی دیر بعد حاضرین پر یکایک خوف کے آثار نمودار ہوگئے۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ جسم حرکت کر رہا ہے۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا۔ کہ یہ حرکت جسم کی نہیں ہے۔ بلکہ اُن بیش قیمت کپڑوں کی ہے۔ جن میں نپولین کا جسم ملفوف ہے۔

جب پورا جسم ظاہر ہوا۔ تو لوگوں نے دیکھا کہ اس طویل مدت نے اس کے جسم میں کوئی غیر معمولی تغیر پیدا نہیں کیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نپولین سو رہا ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

---

[1] فوجی لوگ نپولین کو اسی نام سے پکارتے تھے۔

نپولین کے نقوش میں کوئی قابلِ ذکر تغیر واقع نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے ناک کے نیچے کا حصہ کچھ بگڑ گیا تھا۔ اور رخساروں میں کچھ فرق پیدا ہو گیا تھا۔ جس سے اس کے گندمی رنگ میں زیادہ سیاہی نمودار ہو گئی تھی۔ سر منڈا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹوں پر کیفیتِ تبسم طاری تھی۔ سینہ پر بہت سے تمغے تھے اور دونوں پاؤں کے درمیان دو ظرف رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک میں اس کا دل رکھا ہوا تھا۔ اور دوسرے میں اس کا معدہ۔"

جب سب لوگ اس موثر منظر کو دیکھ چکے تو تابوت بند کیا گیا اور ۴۳ آدمیوں کی مدد سے اُسے گاڑی پر رکھ کر جہاز کی طرف لے گئے۔ جب لاش جہاز پر پونچی تو تین سو ضرب توپ سلامی میں سر کی گئیں۔

۱۸ اکتوبر کو جہاز بل پول نے لنگر اٹھایا۔ دو فرانسیسی جہاز اس کے جلو میں تھے۔ راستہ میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ مسافر یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے کہ فرانس کی سیاسی حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور وہ بھی دیگر دولِ یورپ کے ساتھ مسئلۂ شرقیہ کے سلسلہ میں شریکِ جنگ ہونے پر مجبور ہے۔

۲۹ نومبر کو جہاز بندرگاہ چربرگ میں لنگر زن ہوا۔ اور کامل آٹھ دن اُسے انتظار کرنا پڑا کیونکہ جلوس کی تیاریاں اس وقت تک مکمل نہ ہوئی تھیں۔ آٹھ دن کے بعد لاش بل پول سے اتار کر جہاز نارمنڈی میں رکھی گئی جو اُسے

سے لیکر ہاورکی جانب روانہ ہوا (جو نہر سین کے دہانہ پر واقع ہے) ہاور پہنچنے پر لاش ایک چھوٹی کشتی پر رکھ کر نہر سین کے پیرس کی طرف روانہ کی گئی۔

جب ۱۴ دسمبر کو یہ لاش پیرس پونچی۔ تو اس وقت سردی کا یہ عالم تھا کہ تھرمامیٹر صفر سے ۱۴ درجے نیچے اتر آیا لیکن اہل فرانس کے ذوق و شوق کی یہ کیفیت تھی۔ کہ آدھی رات سے انہوں نے اس مہمان عزیز کی پذیرائی کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ اور طلوع آفتاب سے قبل سب لوگ قصر انفالیڈ پر پونچ گئے تھے۔

باجے بج رہے تھے۔ ترانے گائے جا رہے تھے۔ توپیں سر ہو رہی تھیں۔ کنائس کے گھنٹے شور کر رہے تھے۔ راستے ہجوم کے لئے تنگ ہو گئے تھے۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر سیاہ پردے لٹک رہے تھے۔ اور سب لوگ نعرہ لگا رہے تھے۔ "نپولین پائندہ باد شہنشاہ زندہ باش" لاش ایک گاڑی پر رکھی ہوئی تھی۔ جسے سولہ گھوڑے کھینچ رہے تھے اور تابوت کو "معبودہ نصرت" کے چودہ طلائی مجسمے اٹھائے ہوئے تھے۔

پروگرام میں لکھا ہوا تھا کہ وزراء ممبران بلدیہ کے بعد جلوس میں ان فوجی لوگوں کی جماعت ہوگی جو نپولین کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا۔ کہ انہوں نے پروگرام کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ اور سب سے پہلے وہی لاش کے گرد ہوگئے۔

قصر الفا لیڈ کے میدان میں تماشائیوں کا اس قدر ہجوم تھا، کہ شام کو بیشمار ٹوپیاں، رومال، کمبل وغیرہ وہاں سے اُٹھائے گئے۔

(۳)

یہ ہیں وہ لمحاتِ تاریخی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ انسانی کیونکر خاصیتِ دوام حاصل کر لیتی ہے اور قلب و دماغ کا وہ کونسا تاثر ہے۔ جو اس کے فکر و ادراک کو غیر فانی بنا جاتا ہے۔

یقیناً نپولین کی لاش ساحل سین پر منتقل نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کی ملکی غیرت و خودداری۔ اس ملی سطوت و جبروت کو محفوظ کر دیا ہے جسے حیاتِ قومی کی تپش نبض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فرانس میں مشکل سے تمہیں کوئی ایسا آدمی ملیگا۔ جو قبر نپولین کے پاس سے گذرتا ہو اور قومی جوش سے اُس کے خون میں حرارت نہ پیدا ہو جاتی ہو۔ ہندوستان میں لاکھوں ایسے نشانات ہیں۔ جو ہماری غیرت و خودداری کو حرکت میں لانے کے لئے اپنی موثر ترین مسماریاں پیش نظر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن انہیں دیکھ کر ہمارا دل اور بجھ جاتا ہے۔

فرانس کا باشندہ نپولین کی قبر کا ذکر جس پندار کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اُسی غرور کیساتھ ہم بھی تاج (آگرہ) کا نام لے سکتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ فخر اک صداقت ہے برملا اور یہ پندار اک کذب ہے الغو و دراز کار۔ نگار۔ اپریل ۱۹۲۲ء

مغرب کا نظامِ تعلیم

جرمنی کا نظامِ تعلیم | اس وقت جمہوریت جرمنی مختلف ولایتوں یا صوبوں میں منقسم ہے۔ اور ہر چند ہر ولائیت میں تعلیم کا ایک مخصوص نظام ہے۔ لیکن تمام ولایات کا تعلق ایک دوسرے سے اسی طرح پایا جاتا ہے۔ جیسے وہ سب ایک ہی چیز ہوں۔ پروشیا، جرمنی کی سب سے بڑی ولائیت ہے، اس لئے ہم وہاں کا نظامِ تعلیم پیش کرتے ہیں جس پر دیگر ولائیتوں کی تعلیمی حالت کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

پروشیا، وزِ تعلیم کا مستقر ہے۔ اس کے زیرِ اثر تمام ولائیوں کا نظامِ تعلیم قائم ہے اور پروشیا کی مجلسِ اعلیٰ کا رکن ہونے کی حیثیت سے تمام مدارس کا

انتظام مالی بھی اسی کے سپرد ہے۔ پروشیا پھر تیرہ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر صوبہ میں ایک مجلس تعلیم مرتب ہے جس کا صدر حاکم ولایت ہوتا ہے۔ اس مجلس کے اراکین مشاہیر عہد سے منتخب ہوئے ہیں اور اپنی اخلاق و اکتسابات ذہنی کے لحاظ سے خاص امتیاز کے مالک ہوتے ہیں یہ مجلس صوبہ کے تمام مدارس کا انتظام کرتی ہے اور نصاب کا تعین اسی مجلس کا کام ہے۔

ہر صوبہ متعدد اضلاع میں منقسم ہوتا ہے اور ہر ضلع چھوٹے چھوٹے پرگنوں میں اور صوبہ سے لے کر پرگنہ تک ہر جگہ مجلس تعلیمی موجود ہوتی ہے اور پرگنوں کی مجلس کا اہم ترین رکن ناظر مدارس ہوتا ہے جس کا اثر بہت عام و وسیع ہوتا ہے ناظر کے دیگر فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ فن تعلیم کے متعلق وقتاً فوقتاً اپنے خطبات سے معلمین کو آگاہ کرتا رہے۔ اور وہی شخص اس عہدہ پر ممتاز ہو سکتا ہے جو اپنے حسن نظر، دقت فکر، اکتسابات علمی اور اخلاق و آداب کے لحاظ سے خاص شہرت حاصل کر چکا ہو۔

جبریہ تعلیم ــ جرمنی میں ابتدائی تعلیم جبری ہے اور ہر صحیح و توانا بچہ چھ اور چودہ سال کے اندر قانوناً مجبور ہے کہ مدرسہ میں حاضر ہو۔ اور سوائے حالت مرض کے کسی دیگر عذر کی بنا پر غیر حاضر نہ ہو، والدین اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ وہ اپنی اولاد کو مدرسہ روانہ کریں اور قید و جرمانہ کے ڈر سے وہ ایسا کرنے پر مجبور رہتے ہیں۔ جو خود سر بچے والدین کے دباؤ سے نہیں رہ سکتے وہ مدارس

اصلاح (ہیں بھیجے جاتے ہیں اس قانون
کی پابندی اس قدر انضباط کے ساتھ ہوتی ہے کہ کوئی شخص مستثنیٰ نہیں سمجھا جاتا
اور ہر طبقہ میں اس کا نفاذ ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہل جرمنی سے مفقود ہو گیا
ہے ۱۸۸۱ء میں فوج کے ایک ہزار میں ۲۴ جاہل تھے۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں فی
دو ہزار ایک رہ گیا ہے۔

والدین شروع سے اپنے بچوں کے دلوں میں مدرسہ کی اہمیت اور تعلیم کے فوائد کا خیال قائم کرتے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں کے بچے نہایت شوق سے مدرسوں میں جاتے ہیں۔ اور بالکل جی نہیں چراتے اس کا ایک سبب اور بھی ہے اور وہ یہ کہ وہاں قانوناً ہر دن درس و تدریس کا دن ہے سوائے اتوار کے کوئی اور تعطیل نہیں ہوتی۔ اگر تعطیلیں ہوں اور لڑکے لہو و لعب میں مشغول ہوں تو مدرسہ سے گریز کرنے کا خیال اُن کے دل میں پیدا ہو۔ لیکن وہاں تعطیل ان کے لئے مفقود ہے اور وہ لہو و لعب کی لذت سے آشنا ہی نہیں کہ تعلیم ان پر بار ہو جائے۔

جرمنی کے مدارس اور ان کی قسمیں

ابتدائی مدارس وہاں ہر ہر قریہ میں قائم ہیں (خواہ وہ قریہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو) جہاں ہر بچہ حاضر ہونے پر مجبور ہے اور مفت تعلیم کا انتظام ہے۔ دیہات میں لڑکیاں بھی لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی ہیں لیکن شہروں میں ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ مدارس قائم ہیں۔

اوقات تعلیم وہاں صبح آٹھ سے گیارہ بجے تک اور بعد ظہر دو سے چار بجے تک ہے لیکن سنیچر، اتوار اور بدھ کو ظہر کے بعد کی حاضری معاف ہوتی ہے سال میں ۴۲ ہفتے تعلیم ہونا لازمی ہے اور ہر مدرس کا فرض ہے کہ ہفتہ میں ۲۸ گھنٹے ضرور تعلیم دے۔ ان مدارس کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ وہاں تعلیم عام ہو جائے لیکن چونکہ عامۃ الناس کی اقتصادی حالت بلند درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کی منافی ہوتی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی۔ کہ وہاں اس کا بھی انتظام ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے اور اعلیٰ تعلیم مفت نہیں ہوتی۔

وہاں کے مدارس ثانوی کی تین قسمیں ہیں۔ جہاں ایک طالب علم جامعہ (یونیورسٹی) میں داخل ہونے کی تیاری کرتا ہے، پھر جس طرح کی تعلیم وہ ان مدارس میں حاصل کرتا ہے، اس طرح یونیورسٹی میں اسے داخل ہونا پڑتا ہے۔ مدارس ابتدائی اور مدارس ثانوی کی تعلیم میں بڑا فرق ہے اور اس لئے اس طالب علم کے لئے جو اپنے تئیں کسی خاص کام کے لئے تیار کرنا چاہتا ہے ضروری ہے کہ ۹ سال کی عمر میں مدرسہ ابتدائی سے فارغ ہو کر مدرسہ ثانوی میں داخل ہو۔ اور یہاں ۹ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی جامعہ میں منتقل ہو جائے وہاں کے لئے اور بھی مدارس ایسے ہیں۔ جہاں ہندسہ، طب، اصول تجارت، معدنیات وغیرہ کے مختلف فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور نہایت کثرت سے طلبہ ان میں داخل ہوتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں وہاں مدارس ابتدائی و طلبہ کی تعداد حسب ذیل تھی۔

	تعداد مدارس	معلم	معلمات	لڑکے	لڑکیاں
پروشیا	۳۸۶۸۴	۹۱۶۴۳	۲۴۶۵۰	۳۲۹۲۸۷۷	۳۲۷۹۲۶۳
تمام جرمنی میں	۶۱۵۵۷	۱۴۹۲۱۷	۳۹۲۶۸	۵۱۵۷۴۲۶	۵۱۵۲۵۰۳

علاوہ ان کے وہاں ۴۸۰ مخصوص مدارس بھی تھے جن میں ۲۶۰۰۰ طلبہ تعلیم پاتے تھے۔

مدارس ثانوی

	تعداد مدارس	تعداد معلمین	تعداد طلبہ
لڑکوں کیلئے	۱۴۰۶	۲۱۷۸۷	۴۰۵۹۲۱
لڑکیوں کیلئے	۸۲۸	۱۲۲۹۸	۲۳۴۴۶۱

فنون کے مدارس کی تعداد ۹۲۰ تھی جن میں مختلف صنعتوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں سے دس ایسے مدرسے تھے۔ جہاں سے سند ملتی تھی ۱۹۱۲ء میں یہاں کے طلبہ کی تعداد ۱۶۴۰۸ تھی جن میں ۱۱۰۰۳ لڑکے اور ۲۳۱۲ لڑکیاں تھیں۔

جرمنی میں ۲۳ یونیورسٹیاں ہیں اور ہر یونیورسٹی کے ساتھ فلسفہ، طب، علوم ریاضی، علوم طبیعی وغیرہ کے کالج متعلق ہیں۔ ان میں سے آٹھ کالجوں کے اندر زرعی تعلیم کا بھی انتظام ہے، علاوہ ان کالجوں کے آٹھ مدرسے مذہبی تعلیم

کے لئے بھی مخصوص ہیں ۱۹۲۱ئہ میں ان کالجوں کے اندر اسی ہزار طلبہ تعلیم پائے تھے

مدارس کے مصارف اور مدرسین کا انتخاب | مدارس کے نصف مصارف حکومت

ادا کرتی ہے۔ ایک ثلث بذریعہ ٹیکس پورے کئے جاتے ہیں اور باقی امرار کے چندے، مذہبی اوقاف، اور طلبہ کی فیس سے پورے ہوتے ہیں۔ ابتدائی مدارس میں بھی جن مدرسین کا تقرر ہوتا ہے۔ وہ ان مدارس کے سندیافتہ ہوتے ہیں، جہاں فن مدرسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس کا ناظر مدارس ابتدائی سے خاص خاص ذہین اور قابل طلبہ کا انتخاب کر کے اونچے مدارس میں علوم و معارف کی تکمیل کی غرض سے روانہ کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ دار المعلمین میں تین سال تک روکے جاتے ہیں۔ جہاں فن تربیت و تعلیم ان کو سکھایا جاتا ہے جب وہ ان مدارج کو طے کر لیتے ہیں تو تین سال کے لئے امتحاناً مدرس مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور جب اس زمانہ میں ان کی اہلیت ثابت ہو جاتی ہے تو پھر انہیں ایک انتہائی امتحان فن تعلیم کا دینا پڑتا ہے اور اس کے بعد وہ مستقل کئے جاتے ہیں۔ بعض مدارس میں معلّمین کے لئے مکان اور روشنی وغیرہ کا مفت انتظام کیا جاتا ہے اور ان کو سالانہ ترقی دی جاتی ہے۔

الغرض جرمنی میں نظام انتظام تین باتوں پر منحصر ہے (۱) ابتدائی تعلیم لازمی و مفت ہے (۲) وہاں مدرس نہایت قابل داخل ہوتے ہیں (۳) فنون کے مدارس کثرت سے ہیں جن کی وجہ سے زراعت وصناعت کو وہاں بہت

ترقی حاصل ہے جو ارتقاء اقتصادی اور قوت سیاسی کا اصل راز ہے۔

جب ۱۷۸۹ء میں بغاوت فرانس رونما ہوئی | فرانس کی ابتدائی تعلیمی حالت

اس وقت وہاں کی آبادی کا ۳/۴ حصہ جاہل تھا ہرچند اس وقت کے ارباب حکومت اس حقیقت سے آگاہ تھے اور جمعیات وطن کو اپنی تقریروں سے اس طرف متوجہ کر رہے تھے۔ اور ان جمعیات نے توسیع تعلیم کے لئے قوانین بھی مرتب کئے لیکن یہ تمام آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں اور ان قوانین پر مطلقاً عمل نہیں ہوا۔

۱۷۹۵ء میں خدا خدا کر کے ایک دار المعلمین اور چند مدارس ثانوی قائم کئے گئے۔ لیکن اس وقت وہاں اس قدر سیاسی اضطراب اور اختلال نظم رونما ہو رہا تھا، اور حکومت کی صورتیں اس قدر جلد جلد تبدیل ہو رہی تھیں کہ مشکل سے کسی کو تعلیم کی طرف توجہ ہو سکتی ہے۔ جب نپولین برسر اقتدار ہوا تو اس نے بھی ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور نہ اس کے بعد کی حکومتوں نے کچھ اعتنا کیا۔ آخر کار ۱۸۳۲ء میں ایک عظیم ہستی گیزو کی رونما ہوئی یہ اپنے وقت کا بڑا مورخ و سیاست داں تھا۔ اس نے حد درجہ کاوش اور اک جہاد عظیم کے بعد ملک و قوم کو اس تعلیمی انحطاط کی طرف متوجہ کیا اور حکومت مجبور ہو گئی کہ وہ ہر مجلس بلدیہ (میونسپلٹی) پر ایک ابتدائی مدرسہ کا اجراء لازم کر دے۔ چنانچہ اس طرح متعدد مدارس جاری ہو گئے۔ جن میں نادار طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی

تھی۔ ۱۸۸۱ء میں جول فری صدر حکومت نے ابتدائی تعلیم کو عام طور پر مفت کر دیا اور ۱۸۸۲ء میں اجباری۔

تعلیم اور ارباب کلیسہ اس سے قبل فرانس میں جو مدارس پائے جاتے ہیں۔ وہ دینی جماعتوں سے متعلق تھے۔ اور ارباب کلیسہ ان کے مصارف کے بار برداشت کئے ہوئے تھے۔ جب انقلاب فرانس کا دور ختم ہوا اور یہ فیصلہ کر لیا گیا۔ کہ حکومت کو مذہبی اثرات سے جدا کرنا ضروری ہے تو ارباب کلیسہ کا اقتدار بھی ان کے مدارس سے محو کر دیا گیا۔ اور ۱۸۸۶ء میں ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے مدارس حکومت مناسب تعلیم" اساتذہ علمانیین" کے سپرد ہوئے اور تعلیم دینی اخلاقی سے تبدیل کر دی گئی۔

فرانس کا موجودہ نظام تعلیم جرمنی کی طرح فرانس میں بھی ایک وزیر تعلیم مقرر ہے۔ اور مجلس تعلیم ۵۲ ارکان پر مشتمل ہے۔ جو تعلیم سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے اکتسابات علمیہ کے لحاظ سے ممتاز ہوتے ہیں۔ انہیں ارکان میں سے پندرہ آدمیوں کی جماعت انتظامیہ قرار دی گئی ہے۔ جن میں سے نو آدمیوں کا انتخاب جمہوریت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور باقی کا انتخاب وزیر تعلیم کرتا ہے۔ اس مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہر ہفتہ منعقد ہوتا ہے۔ جس میں تمام معاملات طے کئے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک بورڈ اور ہے۔ جو فنون کے مدارس کا انتظام کرتا ہے

وہاں سات مفتش (انسپکٹر) بھی محکمہ تعلیم کے ہاتھ پاؤں سمجھے جاتے جاتے ہیں۔ ان کا فرض ہے۔ کہ ملک کے تمام مدارس کا معائنہ اور تعلیم ابتدائی کے متعلق تمام جزئی معلومات حاصل کر کے محکمہ کو اطلاع دیں۔ تعلیمی نقطہ نظر سے فرانس سات حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصّہ اکاڈیمی کے نام سے موسوم ہے۔ ہر اکاڈیمی میں ایک مجلسِ تعلیم ہوتی ہے جس کا صدر رئیس جمہوریہ کیطرف سے متعین ہوتا ہے اور اس لیے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنا ضروری ہے اِس مجلس کا صدر اس جگہ کی یونیورسٹی کا بھی صدر ہوتا ہے اور تمام ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ مدارس کا اہتمام بھی اس کے سپرد ہوتا ہے۔

تیام اکادیمیات | یہ اکادیمیات بھی نو حصوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک حصّہ مختصر سی مجلسِ تعلیم کے متعلق ہوتا ہے۔ جو مدارس ابتدائی کا انتظام کرتی ہے یہ مجلس انسپکٹر کے ماتحتی میں کام کرتی ہے۔ انسپکٹر اوقات تعلیم میں آکر معائنہ کرتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ کیا کیا نقائص اصلاح طلب ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی چھوٹی چھوٹی تقسیمیں ہیں ہر تقسیم کا تعلق ایک مجلس تعلیم سے ہے چونکہ فرانس کے نظام تعلیم کے ذمہ دار وہی لوگ ہیں۔ جو خود نہایت بلند درجہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس لئے وہاں کی مجالس تعلیم کے ارکان، وہاں کے مدرس اور وہاں کے انسپکٹر سب ویسے ہی لوگ منتخب کئے جاتے ہیں جو خصوصیات تعلیم کے لحاظ سے اک خاص امتیاز رکھتے ہوں اور اپنے فرائض کو پوری طرح

محسوس کرتے ہیں۔

جبریہ تعلیم | فرانس میں تعلیم اجباری ہے اور ہر بچہ ۶ اور ۱۳ سال کی عمر کے درمیان مدرسہ جانے پر مجبور ہے۔ لیکن یہ مجبوری خاص مدارس حکومت سے متعلق نہیں ہے یعنی اُن کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف حکومت کے ہی مدارس میں داخل ہُوں بلکہ وہ آزاد ہیں کہ جس مدرسہ میں چاہیں تعلیم حاصل کریں۔ حکومت فرانس کا اعتقاد ہے کہ بچہ کے حقوق طبیعہ میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ میدان جات میں اپنی زندگی بسر کرنے کیلئے کافی تعلیم حاصل کرے اور اس حق کو حکومت ادا کرتی ہے۔ والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچہ کی جس قسم کی اور جہاں چاہیں تعلیم دلائیں لیکن بہر حال مدرسہ بھیجنا ضروری ہے۔ جبریہ تعلیم وہاں ۱۸۸۲ء سے جاری ہے اور ۱۸۹۵ء میں قابل تعلیم طلبہ میں سے ۹۱ فیصدی مدارس میں داخل تھے۔

بالکل ابتدائی مدرسے | فرانس میں سب سے پہلا مدرسہ جس سے ایک بچہ کو واسطہ پڑتا ہے مدرستہ الامم (ماؤں کا مدرسہ) ہے اس میں دو سال سے ۶ سال تک کے بچے داخل ہوتے ہیں۔ جہاں طریقہ "بستان الاطفال" (کنڈرگارٹن) کے ذریعہ سے عورتیں انہیں تعلیم دیتی ہیں اور محسوسات و اشیاء مرئیہ کے ذریعہ سے ان کے ذہنوں کو وسیع بناتی ہیں۔ اس کے بعد مدارس اطفال (Ecoles infantines) ہیں۔ جہاں

چار سال سے سات سال تک کے بچے داخل ہوتے ہیں اور یہاں انکو وہ تعلیم دیجاتی ہے جو مدارس ابتدائی میں داخل ہونے کیلئے ضروری ہے ان دونوں قسم کے مدارس حکومت کی طرف سے قائم ہیں اور یہاں کی حاضری یا داخلہ اختیاری ہے۔

مدارس ابتدائی کی قسمیں | وہاں مدارس ابتدائی دو قسم کے ہیں (۱) پہلی قسم تو بالکل مکتبوں کی طرح ہیں اور یہیں سے جبریہ تعلیم کا آغاز ہوتا ہے یہ مدارس تمام دیہات میں قائم ہیں اور لڑکوں کیلئے علیحدہ قائم ہیں لیکن اگر کسی گاؤں کی آبادی ۵۰۰ نفوس سے کم ہوتی ہے تو وہاں لڑکیوں کیلئے علیحدہ مدرسہ نہیں ہوتا۔ ان میں بچے ایک طرح کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ اور ہفتہ میں ۵ دن تعلیم ہوتی ہے جمعرات اور اتوار کو مدارس بند رہتے ہیں۔ ہر مدرسہ میں ایک رجسٹر ہوتا ہے جسکے اندر ہر لڑکے یا لڑکی کا تعلیمی حال ہفتہ وار درج کیا جاتا ہے جس کو والدین اور انسپکٹر وقتاً فوقتاً دیکھا کرتے ہیں (۲) دوسری قسم عالی مدارس ابتدائیہ (Ecoles primaires Supericures) کی ہے اس میں دو طرح کی تعلیم ہوتی ہے ایک تو جو حصول معاش کیلئے مناسب ہو اور دوسری وہ تعلیم جو یونیورسٹی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے قسم اول کے لئے ان مدارس میں مدت تعلیم مقرر نہیں ہے۔ بلکہ وہ طالب علم کی محنت پر منحصر ہے۔ دوسری قسم کے لئے ۵ سال مقرر ہیں۔

مدارس ثانوی | یہ مدارس بھی دو قسم کے ہیں (۱) پہلی قسم وہ ہے جیسے "کلیب لاداب"

(Seminary Colleges) سمجھنا چاہیئے۔ اور انہیں مدارسِ حکومت (Lycee) کہتے ہیں۔ دوسری قسم کا نام "مدارس احرار" (Ecoles secondaires) ہے ان مدارس میں سات سال مدت تعلیم مقرر ہے اور طلبہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ حسب ذیل چار نصاب میں سے جس نصاب کو چاہیں پسند کریں (۱) لاطینی اور یونانی زبان (۲) لاطینی زبان اور دیگر علوم (۳) لاطینی اور دیگر السنہ رائجہ۔ (۴) السنہ رائجہ و دیگر علوم۔

مدارس فنون | تجارت، زراعت، طب، ہندسہ، معدنیات، فنون حرب وغیرہ کے متعدد مدارس فرانس میں موجود ہیں۔ جن میں سے ابتدائی مدارس کی تعداد ۵۰۰ اور اعلیٰ مدارس کی تعداد ۸۰ ہے۔

جامعات | فرانس میں سولہ جامعات (یونیورسٹی) ہیں۔ ان میں ۱۵ کالج تعلیم قانون کے لئے ۹ طب کے لئے، ا دیگر علوم کیلئے مختص ہیں۔ ان میں ۸ مدرسے تعلیم دواسازی کے بھی ہیں۔ ان جامعات کے اساتذہ کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اور وہی تنخواہ ادا کرتی ہے۔ دیگر مصارف، اوقاف، امراء کے چندوں اور مختلف رفاہی انجمنوں کی مدد سے چلتے ہیں ۱۹۲۱ء میں ان کالجوں کے اندر ۵۰ ہزار طلبہ تعلیم پاتے تھے۔ ان کالجوں کے علاوہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اور بھی کالج موجود ہیں جن میں سے کلیہ فرانس (جسے فرانسس اول نے ۱۵۳۰ء میں قائم کیا تھا) "متحف التاریخ الطبیعی"، "مدرسہ

"لغات شرقیہ" اور مدرسہ علم الآثار مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اساتذہ فن تعلیم سکھانے کے لئے وہاں دو قسم کے مدرسے ہیں پہلی قسم وہ ہے جہاں مدارس ابتدائی کے اساتذہ کو تعلیم دیجاتی ہے ان میں سے ۸۴ مردوں کیلئے اور ۸۲ عورتوں کیلئے ہیں یعنی فرانس کے ہر صوبہ میں ایک مدرسہ معلّموں کے لئے ایک معلمات کیلئے قائم ہے (۲) دوسری قسم مدارس عالیہ کے مدرسین کیلئے ہے ان کی تعداد ۳ ہے ایک مردوں کیلئے دوسرا عورتوں کیلئے اور تیسرا الکسن اساتذہ کی تربیت کیلئے وہاں کوئی شخص منصب تعلیمی حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اسے ان مدرسوں میں سے کسی مدرسہ کی سند نہ حاصل کی ہو ان مدارس میں ۱۶ سال سے کم عمر لڑکا داخل نہیں ہو سکتا اور داخلے کے وقت ایک تحریر دینی پڑتی ہے کہ کم از کم دس سال تک وہ محکمہ تعلیم میں کام کرے گا۔ دار المعلمین سے نکلنے کے بعد اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جاتا ہے اور وہ تحقیقات علمی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو ایک انتہائی امتحان دینا پڑتا ہے جس کے بعد وہ مستقلاً استاد مقرر کیا جاتا ہے۔

اس نوع کے بعض اعلیٰ مدارس بھی ہیں جہاں انسپکٹری وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو لوگ ابتدائی مدارس معلمین سے نکلتے ہیں ان کو ان مدارس میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ ۳۵ سال ملازمت کرنے کے بعد تنخواہ کا $\frac{3}{4}$ حصہ پنشن ہو جاتی ہے۔

مدارس کے مصارف | مدارس حکومت میں تعلیم مفت ہوتی ہے، اور مصارف حسب ذیل طریقوں سے پورے کئے جاتے ہیں۔

(۱) اساتذہ و مدرسین کی تمام تنخواہیں، انتظامِ مدارس، مدارس معلمین کے مصارف حکومت ادا کرتی ہے۔

(۲) صوبہ کی حکومت مدارسِ معلمین کی تعمیر اور فرنیچر وغیرہ کا بندوبست کرتی ہے

(۳) حکومت بلدیہ (میونسپلٹی) عمارات کی مرمت کراتی ہے اور ادنےٰ ملازموں کی تنخواہ ادا کرتی ہے۔

مدارس کا شمار | مدارس کا شمار فرانس میں حسب ذیل نقشے سے معلوم ہوسکتا ہے

مدرسہ کی قسم	تعداد مدارس	طلبہ کی تعداد	سنہ
مدارس اطفال	۲۸۴۹	۲۲۷۱۵۶	۱۹۲۰ء
مدارس ابتدائی	۶۸۰۱۵	۳۸۳۵۸۱۶	۱۹۲۰ء
مدارس ثانوی (لڑکوں کیلئے)	۵۱۵	۱۰۰۲۲۰	۱۹۱۹ء
مدرسہ کی قسم	تعداد مدارس	طلبہ کی تعداد	سنہ
مدارس ثانوی (لڑکیوں کیلئے)	۱۰۹	۲۵۱۶۸	۱۹۱۹ء
جامعات (یونیورسٹی)	۱۶	۴۹۹۳۱	۱۹۲۱ء

امریکہ کا قانون اساسی | ولایات متحدہ امریکہ کے دستور یا قانون اساسی میں تعلیم کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور نہ اعلانِ استقلال کے وقت اس کا ذکر کیا گیا جبر

سے ثابت ہوتا ہے کہ واضعین دستوریت کا اعتقاد تھا کہ تعلیم کا انتظام حکومت مرکزی کے دائرہ عمل میں داخل نہ ہونا چاہیئے بلکہ مقامی حکومت اور مجلس بلدیہ (میونسپلٹی) کے سپرد ہونا چاہیئے۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ حکومت مرکزی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے اعلانات کے ذریعہ سے اس کی اہمیت کو ثابت کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کو ضروریات زندگی میں داخل کر دیا ہے اور ۱۸۶۷ء میں ایک اعلیٰ مجلس تعلیم قائم کر کے اسے وزارت داخلی سے وابستہ کر کے ایک منشور کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے کہ وہ تمام ولایات متحدہ امریکہ میں ترقی تعلیم کے متعلق اعداد و شمار اور دیگر معلومات حاصل کرتی رہے، اور تعلیم کے فوائد سے لوگوں کو آگاہ کر کے اسلوب تعلیم اور انتظام مدارس کو اعلیٰ پیمانہ پر قائم کرے۔

حکومت کی طرف سے فیاضی | اس اعلان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتظام تعلیم سے براہ راست اس مجلس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مرکزی حکومت وہاں کی تعلیمی حالت سے ہر وقت باخبر رہنا چاہتی ہے اور اس غرض کے لئے وہ ہر قسم کے مصارف برداشت کر سکتی ہے چنانچہ حکومت مرکزی نے مختلف ولایتوں کی مقامی حکومتوں کو قیام مدارس کے لیئے مفت زمینیں دیں۔ جن کا مجموعی رقبہ ۱۲۴۵۹۱ مربع میل ہوتا ہے۔ (یعنی پرشیا

برطانیہ - اور ہالینڈ کے مجموعی رقبہ سے بھی کچھ زیادہ) اور اعلان کیا کہ جو شخص ترقی زراعت کے متعلق کسی نئے تجربہ کو پیش کرے گا۔ اُسے ۱۵۰۰۰ ڈالر انعام دیا جائے گا۔ وہاں ہر صوبہ میں حکومت کی طرف سے زراعت کے کالج قائم ہیں اور ہر کالج کو حکومت کی طرف سے ۲۵۰۰۰ ڈالر سالانہ ملتا ہے۔

کثرتِ مدارس وہاں امرار، انجمنوں اور عام لوگوں کے عطیات اور چندے سے اس قدر مدارس اور کالج قائم ہیں کہ حکومت کے سر سے بڑا بار اُٹھ گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں وہاں تین لاکھ مدرسے قائم تھے۔ کنڈر گارٹن اور بلند تعلیم کے مدارس ان کے علاوہ ہیں۔ امریکہ کے ہر صوبہ میں قائم مقامی حالات کے لحاظ سے نظام علیحدہ مقرر کیا گیا ہے لیکن چونکہ سارے ملک میں حریت و مساوات کا جذبہ عام ہے اس لئے اصول اساسی ہر جگہ کے ایک ہی ہیں۔

مدتِ تعلیم وہاں سات اور سولہ سال کے درمیان ہر بچے کے لئے تعلیم لازم ہے اور مفت ہے اور تمام مدارس ابتدائی و ثانوی میں یکساں تعلیم دی جاتی ہے۔ مدارس ابتدائی کا زمانۂ تعلیم آٹھ سال، مدارس ثانوی کا چار سال مقرر ہے اس کے بعد کالج کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور اکثر کالجوں میں مدتِ تعلیم چار سال مقرر ہے۔

نظام مدارس ہر صوبہ میں محکمۂ تعلیم کا ایک اعلیٰ منتظم ہوتا ہے۔ جو کسی جگہ ذریعہ انتخاب مقرر ہوتا ہے۔ اور کہیں مجلس تعلیم یا مجلس صوبہ اس کا تقرر کرتی ہے

اس کا تقرر دو سال سے ۵ سال تک کیلئے ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ صوبہ کی تعلیمی حالت پر کامل غور کرے، مدرسین کی حالت کو دیکھتا رہے اور تمام ان تدابیر کو پیش کرے جن سے صوبہ کی تعلیمی ترقی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ الغرض تمام جزئیات تعلیم پر (خواہ وہ اس کے کسی شعبہ سے متعلق ہوں) حاوی ہونا اس کا فرض ہے اور وہ تمام باتوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

ہر صوبہ انتظام تعلیم کے لحاظ سے مختلف پرگنوں میں منقسم ہوتا ہے۔ اور ہر پرگنہ میں ایک انسپکٹر یا معائنہ کرنے والا مجلس تعلیم کی طرف سے یا ذریعہ انتخاب مقرر کیا جاتا ہے۔ جو تین سال تک اپنے خدمات انجام دیتا ہے۔ اس کے فرائض و اختیارات اپنے پرگنہ کے اندر وہی ہیں جو مدیر معارف (یا اعلیٰ منتظم) کے اپنے صوبے کے اندر مقرر ہیں۔ لیکن چونکہ ہر پرگنہ میں مدارس کثرت سے ہیں اور انسپکٹر قلت معاوضہ کی وجہ سے اپنا سارا وقت اس طرف صرف نہیں کر سکتا۔ اس لئے معائنہ اور جانچ کے لحاظ سے وہاں کا انتظام ضرور اصلاح طلب ہے۔ اسی طرح ہر پرگنہ کے مختلف اضلاع میں نظام مقرر ہے جس کی ذمہ دار مجلس بلدیہ ہوتی ہے۔ جرمنی کی طرح یہاں تعطیل کا فقدان نہیں ہے اس لئے بعض بچے لہو و لعب کی طرف بھی مائل نظر آتے ہیں۔

مدارس ابتدائی | مدارس ابتدائی میں مدت تعلیم آٹھ سال ہے۔ اس زمانہ میں انگریزی لکھنا پڑھنا حساب، جبر و مقابلہ، جغرافیہ امریکہ کی تاریخ

علم الصحت، ہندسہ، عملی طبیعیات اور فزیالوجی (علم الابدان) کے مبادیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہفتہ میں سنیچر اور اتوار کو تعطیل ہوتی ہے۔ مدرسہ کے قوانین اُستادوں کا اخلاق اور حسن سلوک طلبہ میں پابندی وقت، احترام مواعید، قوت انتظام اور تحقیق وتدقیق کی عادت پیدا کر دیتا ہے جس سے اُن کا اور قوم کا مستقبل وابستہ ہے ان مدارس میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ تعلیم پاتی ہیں۔ اور یہ اصول وہاں اس قدر عام ہے کہ ۳۲۰ مدارس عالیہ میں سے ۲۰۳ مدارس میں دونوں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مدارس ثانوی | مدارس ثانوی میں مدت تعلیم چار سال مقرر ہے اس میں لاطینی یونانی، فرانسیسی، اور جرمنی زبان سکھائی جاتی ہے۔ اور علاوہ اس کے ہندسہ، طبیعیات، کیمیا، جغرافیہ طبعی، فزیالوجی، بیان تاریخ کی بھی انتہائی تعلیم دی جاتی ہے چونکہ وہاں مختلف علوم وفنون کیلئے علیحدہ علیحدہ کالج قائم ہیں اس لئے مدارس ثانوی میں تمام ان ضروری علوم کی تعلیم دی جاتی ہے جن کی تکمیل کالجوں میں ہوتی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ ہر وہ طالب علم جو کسی ثانوی مدرسہ سے فارغ ہو کر نکلتا ہے، ہر کالج میں داخل ہو سکتا ہے۔ اور اسے کوئی دقت نہیں ہوتی۔

کالج | کالجوں میں مدت تعلیم چار سال مقرر ہے اور ہر طالب علم اپنے ذوق کے لحاظ سے فن کا انتخاب کر سکتا ہے، وہ لوگ جو تجارت پیشہ ہیں اُن کے لڑکے تعلیم تجارت کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ لوگ جو انجینیری اور علم آلات کے شائق ہیں

وہ اپنے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دلاتے ہیں۔ اور جو شخص علمی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔ وہ کسی خاص فن کی تحقیق و تفتیش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یونیورسٹیاں | یہاں کی یونیورسٹی عبارت ہے متعدد مختلف کالجوں کے مجموعہ سے۔ جن میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ وہاں کی یونیورسٹی میں فنون و آداب، طب، دواسازی، دندان سازی، الٰہیات ہندسہ۔ تجارت وغیرہ سکھانے کے علیحدہ علیحدہ کالج مقرر ہیں۔ نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں ایک کالج علم صحافت سکھانے کا بھی ہے۔

کسی طالب علم کو یونیورسٹی کے کسی کالج میں داخل ہونے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب تک وہ فنون و آداب (آرٹ و لٹریچر) کے کالج میں دو سال تعلیم نہ حاصل کرے۔ وہاں ہر صوبہ میں ایک کالج قائم ہے جس کے مصارف حکومت کی طرف سے ادا کئے جاتے ہیں اور اہل امریکہ وہاں مفت تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اجنبی ممالک کے لوگوں کیلئے تھوڑی فیس مقرر ہے۔

معلمین | ۱۹۲۱ء میں وہاں معلمین و مدرسین کی تعداد ۵۹۳۳۰۰ تھی جن میں سے ۵۱۶،۷۷ امرد اور ۱۴۱،۷،۶۲۰ عورتیں ہیں۔ عورتوں کی کثرت کا سبب یہ ہے کہ وہاں تعلیم ابتدائی بالکل عورتوں کے ذریعہ سے دی جاتی ہے۔

فن تعلیم سکھانے کے مدارس بھی یہاں موجود ہیں لیکن ضرورت کے لحاظ

سے ناکافی ہیں۔ کیونکہ وہاں معلمی کا منصب مستقل نہ ہونے کی وجہ سے ہر سال تقریباً ایک لاکھ جدید مدرسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لئے ضرورت ہے۔ کہ کثرت سے مدارس معلّمین جاری کئے جائیں۔ ہر چند ملک اس ضرورت کو محسوس کر رہا ہے۔ لیکن جب تک حکومت اس طرف توجہ نہ کرے کامیابی متعذر ہے

ہندوستان کا تعلیمی انحطاط

یہاں تک تو مغرب کے بعض ممالک کی تعلیمی حالت کا مختصر بیان ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی مہذب ملک ایسا نہیں ہے جس نے اپنے ہاں تعلیم کو رواج دینے میں پوری کاوش سے کام نہ لیا ہو۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی تعلیمی حالت اس حد تک گری ہوئی نظر آتی ہے کہ مشکل سے کوئی مدعی تہذیب حکومت اس کو گوارا کر سکتی ہے ہم ہندوستان کے نظام تعلیم کے متعلق کوئی مفصّل بیان پیش کرنا نہیں چاہتے کہ اس سے تقریباً یہاں کا ہر شخص واقف ہے۔ لیکن دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کی تعلیمی حالت کے متعلق صرف بعض اعداد و شمار پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

امریکہ میں سالانہ تنخواہ ایک معلم کی کم سے کم ۲۰۰ سے لیکر ۱۵۰۰ ڈالر تک (ڈالر تین روپیہ کے برابر ہے) اس سے اونچے درجہ کے مدرس ۱۰۵۰ سے ۲۲۶۰ ڈالر تک پاتے ہیں۔ ہائی اسکول (مدارس عالیہ) میں ۹۰۰ سے لے کر ۳۱۵۰ ڈالر تک مشاہرہ مقرر ہے۔ اور ٹریننگ سکول (مدارس المعلمین) ۱۰۰۰ سے

۲۲۵۰ ڈالر تک۔ ہائی اسکول اور ٹریننگ اسکول کے پرنسپل ۵۰۰۰ ڈالر پاتے ہیں۔ نیویارک کے کمشنر تعلیمات کو ۵۰۰۰ ڈالر ملتے ہیں۔

جاپان میں وزیر تعلیمات، چار ہزار ڈالر پاتا ہے۔ اور کم سے کم تنخواہ ۵ سے ۹ ڈالر ماہانہ تک ہے۔ ہندوستان میں مدرسین کو جس قدر تنخواہیں ملتی ہیں وہ مقابلتہً نقشہ ذیل سے ظاہر ہوتی ہیں۔

نام ملک	سالانہ تنخواہ ابتدائی مدارس میں	
امریکہ	۴۶۸۰	روپیہ
انگلستان	۱۵۰۰	〃
جاپان	۵۲۰	〃
پرتگال	۳۰۰	〃
ہندوستان	۱۵۰	〃

بیان ماسبق سے معلوم ہو چکا ہے کہ مغرب کی حکومتیں قوم کی تعلیم پر نہایت بیدریغ روپیہ صرف کرتی ہیں کیونکہ ان کے ہاں اساس ترقی یہی چیز ہے لیکن ہندوستان میں حکومت جس قدر فیاضی سے کام لیتی ہے اس کا حال ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

مصارف تعلیم فی کس (ابتدائی مدارس میں)

نام ملک	شلنگ	پنس
(۱) امریکہ	۱۶	۰
(۲) سوئیٹزرلینڈ	۱۳	۸
(۳) آسٹریا	۱۱	۳
(۴) انگلستان	۱۰	۰
(۵) کناڈا	۹	۹
(۶) اسکاٹلینڈ	۹	۶½
(۷) جرمنی	۶	۱۰
(۸) نیوزیلینڈ	۶	۴½
(۹) سویڈن	۵	۷
(۱۰) بلجیم	۵	۴
(۱۱) فرانس	۴	۱۰
(۱۲) آسٹریلیا	۳	۱½
(۱۳) اسپین	۱	۱۰
(۱۴) اٹلی	۱	۲½
(۱۵) جاپان	۱	۲

(۱۶) روس (قبل جنگ)	۰ ———	۷ ½
(۱۷) ہندوستان	۰ ———	۲

(شلنگ ۱۲ کے برابر ہے اور پنس ایک آنے کے برابر)

مدارس عالیہ

نام ملک		پنس
(۱)	امریکہ	۱۱
(۲)	سوئیزرلینڈ	۱۱
(۳)	ڈنمارک	۸
(۴)	سویڈن	۶ ½
(۵)	فرانس	۶
(۶)	بلجیم	۶
(۷)	آسٹریا	۶
(۸)	ناروے	۵
(۹)	روس	۲ ½
(۱۰)	برطانیہ	۱۱
(۱۱)	ہندوستان	½

سنہ ۱۹۲۰ء میں ۱۴ کروڑ ۸۹ لاکھ روپیہ ہندوستان کی تعلیم میں صرف ہوا۔

جس میں سے نصف سے کم یعنی ۶ کروڑ ۳۲ لاکھ خزانہ شاہی سے دیا گیا۔ ۳ کروڑ ۶۹ لاکھ فیس سے وصول ہوا۔ ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ پبلک فنڈ سے ملا۔ لوکل فنڈ سے ایک کروڑ ۴۵ لاکھ کی امداد ملی اور میونسپلٹیوں سے ۵۹ لاکھ کی۔

چونکہ ہندوستان میں تعلیم مفت و لازمی نہیں ہے اور حکومت یہاں اشاعت تعلیم کو ضروری خیال نہیں کرتی اس لئے یہاں کا تعلیمی اوسط تمام دنیا سے کم ہے اور باوجود اس کے کہ تقریباً ڈیڑھ صدی برطانیہ کو حکومت کرتے ہوئے یہاں ہو گیا ہے۔ تعلیم کے لحاظ سے یہاں کی حالت اب بھی نہایت پست ہے درآنحالیکہ اسی حکومت نے خود اپنے ملک کو چالیس سال سے کم زمانہ میں تعلیم سے پوری طرح آشنا کر دیا۔ ذیل کے نقشے سے تعلیمی اوسط معلوم ہو سکتی ہے۔

سوئیٹزرلینڈ	۱۰۰ فیصدی	سویڈن ناروے	۱۰۰ فیصدی
انگلستان	۹۵ ؍	امریکہ	۹۵ ؍
جاپان (۵۰ سال قبل)	۲۸ ؍	ہندوستان	۲۰ ؍
؍ (اب)	۹۶ ؍		

اگر آبادی پر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی انگلستان، امریکہ، فرانس، جرمنی اور اٹلی کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے لیکن اگر اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ مقابلتہً یہاں تعلیم کتنی ہے اور تعلیم کے لئے کتنی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ تو نتیجہ نہایت افسوس ناک نکلتا ہے۔ ذیل کے

نقشے سے اس کی وضاحت ہو سکتی ہے،

ملک	آبادی	یونیورسٹیوں کی تعداد
(۱) امریکہ	۸۵۱۰۰۰۰۰	۱۳۴
(۲) انگلستان	۴۱۰۰۰۰۰۰	۱۸
(۳) جرمنی	۶۴۵۰۰۰۰۰	۲۲
(۴) فرانس	۳۹۰۰۰۰۰۰	۱۵
(۵) اٹلی	۳۲۰۰۰۰۰۰	۲۱
(۶) ہندوستان	۳۲۰۰۰۰۰۰۰	۱۵

ہندوستان میں تعلیم کا اس قدر انحطاط موجودہ نظامِ حکومت کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ اسی وقت جب کہ امریکہ میں آمدنی کا ۳۰ فیصدی تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے حصہ میں بمشکل ۴ ½ فیصدی آتا ہے۔

دسمبر سنہ ۲۳ء

دیوجانس کلبی

دیوجانس کلبی یونان کا مشہور فلسفی حضرت مسیح سے چار سو تیرہ سال قبل صوبہ پنطس کے شہر سینوب میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسکیوس صرافی کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کھوٹے روپے بھی چلاتا تھا۔ اس لئے گرفتار کر لیا گیا اور قید ہونے کے بعد حالت قید میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد دیوجانس وہاں سے بھاگ کر ایتھنز چلا آیا اور یہیں رہنے لگا۔ یہاں اس کی حالت نہایت حقیر و ذلیل فقیروں کی طرح تھی۔ ہاتھ میں لکڑی لے کر ننگے پاؤں پھرتا اور پیٹھ پر ایک گٹھری رکھ کر سارے شہر کا گشت لگاتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ جس پر لوگ ہنستے اور مذاق اڑاتے تھے۔ خاص کر اس کی ڈاڑھی

تو لوگوں کیلئے کشت زعفران کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اُن کی ساری تضحیک اس پر صرف ہوا کرتی تھی۔

ان باتوں سے دیو جانس کو تمام باشندگانِ شہر کے لئے مسخرہ بن گیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ اس نے فلسفہ ادبیہ کی اشاعت بھی شروع کر دی، اور اس مسئلہ میں وہ بالکل انٹستھینز کی تقلید کرنے لگا۔ یہ حالت اس کی دن بدن بڑھتی ہی اور نہایت استقلال کے ساتھ وہ نشر فضائل اور اشاعت علم میں مصروف ہو گیا۔ اور اس قدر مصروف ہوا کہ اس کی اس علمی زندگی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا۔ وہ فلسفی خیالات جو اس کے دماغ میں پیدا ہوتے تھے۔ اور جن کی یہ تبلیغ و اشاعت کر رہا تھا۔ انٹستھینز کی تعلیمات کا نتیجہ تھیں۔ اور اسی لئے وہ اس کا اسقدر دلدادہ ہو گیا تھا۔ کہ تمام افعال و اعمال میں اسی کا رنگِ تقلید جھلکنے لگا تھا۔ اور ہر شخص سمجھ سکتا تھا۔ کہ دیو جانس کے جسم میں انٹستھینز کی روح حلول کر گئی ہے۔

عام لوگوں کے نزدیک اگرچہ دیو جانس مسخرہ سمجھا جاتا تھا لیکن پھر بھی جب وہ گھر سے باہر نکلتا۔ تو ایک ہجوم اس کے ساتھ ہوتا۔ لوگ سوال کرتے جاتے وہ جواب دیتا رہتا۔ اور لوگ اس کے جوابوں کو یاد رکھتے کیونکہ اس کے جواب میں اک حقیقت مستور رہتی تھی۔ جو دوسروں کو ضرورت کے وقت فائدہ پہنچاتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ شہر کے امراء و اکابر بھی اسکی جانب

متوجہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی تھی۔ جہاں ڈیو جانس کلبی خاص طور سے شرکت کیلئے مدعو نہ کیا جاتا۔ وہ اپنے اس حال کو نہایت ہوشمندی و احتیاط کے ساتھ قائم کئے ہوئے اپنی تبلیغی خدمات برابر ادا کرتا رہا۔ کیونکہ جو تجربات اس کو ماضی میں ہوتے جاتے تھے وہ مستقبل کیلئے ہر آئینہ مفید ثابت ہوتے تھے۔ اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ آئندہ کیونکر اپنی مساعی کو مشکور کر سکتا ہے اور اب اُسے کس احتیاط سے کام کرنا چاہیئے۔ اسی لئے وہ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ شریک ہونے لگا۔ اور اُن کا ہم خیال ہو کر ان کا ہم آہنگ بن کر ان کی تربیت و تہذیب میں اصلاح کرنے لگا۔ حتیٰ کہ شہر کے ایک ایک متنفس کے نزدیک وہ مقبول اور ہر دلعزیز بن گیا۔ اور اس بنا پر لوگوں نے اُسے "کلبی" کا لقب دے دیا۔ جو اس زمانہ میں (اس خیال کے زیر اثر کہ اُن کی طبیعتیں، کتّوں سے مشابہ ہوا کرتی ہیں) فلاسفہ کے لئے مخصوص تھا۔

ڈیو جانس نے ابتدا میں اپنے اوپر کیفیت تمسخر کو جس طریقہ سے طاری کیا تھا ہر چند اس کا اقتضا یہی تھا۔ کہ لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہی دیوانگی اس قدر ہوشیاری تھی۔ کہ تمام قلوب اس کی طرف منجذب ہو گئے۔ اور چند ہی روز میں وہ نہایت قابل قدر فلسفی تسلیم کر لیا گیا۔

اشاعت فلسفہ کے لئے اس نے جو عجیب عجیب طریقے اختیار کئے تھے۔ اُن کا درس اُس نے جانوروں سے لیا تھا۔ چنانچہ چوہوں سے یہ

سبق لیا کہ انسان کو کسی خاص مقام و مکان کی ضرورت نہیں جہاں اتفاق لے جائے وہیں قیام بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیئے اس نے اپنے رہنے کے لیئے کوئی مکان نہیں بنایا۔ بلکہ اپنے ساتھ ایک صندوق رکھنے لگا جسے آگے آگے ڈھکاتا ہوا چلتا اور جب رات ہو جاتی تو اسی میں گھس جاتا۔

وحشی جانوروں سے اس نے یہ سیکھا کہ کھانا پکانے اور برتن وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کچا گوشت ناخنوں سے نوچ کر کھایا جاسکتا ہے چنانچہ اس کا طرز عمل یہی تھا۔ اور سوائے ان صورتوں کے جبکہ وہ کسی دعوت میں شریک ہوتا۔ یا خاص مجمع میں مدعو کیا جاتا اسی طرح ناخنوں سے نوچ نوچ کر کھاتا۔

کتوں سے اس نے یہ حقیقت حاصل کی کہ سنجیدگی و متانت یا پابندی رسوم کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمام مطالب و مقاصد پورا کرنے کے لیئے صرف آزادی و بیباکی درکار ہے اگرچہ لوگ دیو جانس کی ان حرکتوں کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے تھے۔ لیکن خود دیو جانس دوسروں پر افسوس کرتا تھا کہ وہ کیوں اس کے اصول پر عمل نہیں کرتے۔

کلبی کی عادت تھی کہ وہ دن کو بھی ایک قندیل اپنے ساتھ لے کر نکلتا اس پر اگر لوگ پوچھتے۔ کہ یہ کس ضرورت سے ہے تو جواب دیتا۔ کہ مجھے اپنے ایک ہم مشرب کی تلاش ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں کو آواز دیتا اور اپنے پاس جمع کرتا

جب سب آجاتے تو ڈنڈا لیکر ان کو منتشر کر دیتا اور کہتا مجھے انسان کی تلاش ہے۔ اور تم میں سے کوئی انسان نہیں ہے اس کے جواب میں اگر کوئی کہتا کہ پھر آدمی کسے کہتے ہیں۔ تم نے کبھی کسی آدمی کو دیکھا ہے؟ تو کہتا کہ "ہاں میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا البتہ اسپارٹا میں چند بچے دیکھے ہیں"۔

دیو جانس کا یہ جواب ٹھیک ہوتا اگر وہ انسانی حقیقت سے بھی واقفیت رکھتا۔ لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اقوال صرف ادہام تھے۔ اور وہ لوگوں کے معائب پر ان کے محاسن سے زیادہ غور و خوض کیا کرتا تھا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ لوگوں نے اس کو دیکھا بتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ مانگ رہا ہے اور ایک کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا تو دوسرے کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ دوسرا بھی کچھ نہیں بولتا۔ تو تیسرے کو مخاطب کرتا ہے وہ بھی خاموش رہتا ہے۔ تو چوتھے کو دیکھنے لگتا ہے، لوگوں نے پوچھا۔ "تم اس سے کیا چاہتے ہو؟ کہنے لگا۔ میں لوگوں کے پاس اپنی کوئی خواہش لے کر جاتا ہوں تو وہ بھی ان ہی بتوں کی طرح بےحس و حرکت رہتے ہیں۔ اس لئے میں ان بتوں سے التجائیں کر کے لوگوں سے مانگنے اور نہ پانے کا خوگر ہو رہا ہوں"۔

اس کی یہ عادت بھی تھی۔ کہ موسم گرما میں جب سخت گرمی پڑنے لگتی

تو دوپہر کے وقت خوب گرم ریت پر اور جب شدید جاڑے ہوتے۔ تو برف کی چٹانوں پر لوٹتا۔ لوگ پوچھتے یہ کیوں؟ تو کہتا اس سے مجھے سردی و گرمی برداشت کرنے کی عادت پڑ جائیگی۔

وہ ذی ثروت اور دولتمند اصحاب کی بے انتہا تحقیر کرتا خطیبوں اور مقررین کو سمجھتا کہ یہ رعایا کے غلام ہیں۔ فلاطون اور اس کے تلانذہ کے لئے اس کی رائے یہ تھی۔ کہ وہ سب کے سب فضول خرچ تھے۔ اس کا قول تھا۔ کہ بادشاہوں کے تاج ایسے ہیں جیسے شیشے کے برتن اور شہرت پسندی صرف دیوانوں کا شیوہ ہے وہ کہا کرتا کہ جب میں دنیا کے حکام، فلاسفہ و حکماء وغیرہ کو دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ واقعی انسان اپنے عقل و ادراک کے لحاظ سے جانوروں سے بالاتر ہے لیکن جب میں اُن لوگوں کو دیکھتا ہوں جو وحی، الہام، تعبیر رویا کے مدعی ہیں یا ان لوگوں پہ نظر پڑتی ہے جو مال وجاہ حاصل کرنے کے بعد متکبر و مغرور بن جاتے ہیں تو خیال کرتا ہوں کہ انسان سخت مجنون ہے اور اس لحاظ سے حیوانوں سے بھی زیادہ پست و ذلیل۔

ایک روز اُس نے دیکھا کہ ایک لڑکا چلّو سے پانی پی رہا ہے اُس نے اپنا چوبی پیالہ پھینک دیا اور کہا یہ بچہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور صاحب بصیرت ہے۔

وہ اس شخص کی بہت زیادہ تعریف کرتا جو شادی کے لئے تیار تو ہوتے

مگر شادی نہ کرتے کیونکہ اس کے نزدیک جو جوانی میں شادی کر لیتا تھا۔ وہ عجلت
کرتا تھا۔ اور جو انحطاط کے بعد آمادہ ہوتا تھا وہ تاخیر کرتا تھا اور اس لئے دونوں میں
سے کوئی ایک اُسے پسند نہ تھا۔

ایک روز بازار میں کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا تھا۔ دیکھا تو پاس ایک متنفس بھی
نہیں۔ گانا بجانا شروع کر دیا پھر تو کیا تھا۔ لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد
جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک یہ حالت دیکھتا رہا۔ اور اس کے بعد سب کو لعنت
ملامت کرنے لگا۔ کہ افسوس ہے تم ایک لغویات کیلئے تو میرے گرد جمع ہو گئے
لیکن میرے زریں نصائح کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔

دیوجانس ان لوگوں کا سخت مخالف تھا جو موسیقی میں کوئی مہارت رکھتے
تھے۔ وہ کہتا تھا۔ کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ لوگوں کے خصائل میں اصلاح،
عادات میں استقلال تہذیب میں استقامت پیدا کریں۔ ان کو خوش
اور لطف اندوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند
دن میں وہ بیکار ہو جاتے ہیں علمائے فلکیات اور اہل رصد کا بھی بڑا مخالف
تھا۔ اور کہا کرتا تھا۔ کہ ان لوگوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کا تو حال معلوم نہیں اور
آسمان واجرام سماوی کے حالات جاننے کے مدعی ہیں۔

خطیب اور واعظ حضرات سے بھی بیزار تھا۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتے
ہیں اس پر عمل نہیں کرتے بخیلوں کا بھی دشمن تھا۔ ان کی نسبت اس کی ::

دالے بھی کہ ظاہر میں تو ان پر زہد و قناعت کے آثار ہوتے ہیں لیکن دل میں صرف مال جمع کرنے اور دنیا کی حرص ہوتی ہے۔ جو لوگ معابد و ہیاکل میں جا کر طاعت و عبادت کرتے ہیں اور باہر نکل کر ملاہی و ملاعب میں شریک ہو جاتے ہیں اُن سے بھی اُسے سخت نفرت تھی وہ کہتا تھا ایسے تو بہت لوگ میں نے دیکھے ہیں۔ جو مذاق اور فضولیات میں اپنا وقت ضائع کر دیتے ہیں مگر انسانی فضائل اور اخلاقی کمالات حاصل کرنے میں ایک منٹ بھی صرف نہیں کرتے۔

ایک روز دیو جانس ایک شخص کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے نکلا۔ اور ایک عظیم الشان محل کی جانب جا نکلا یہ محل نہایت آراستہ اور شاندار سنگِ مرمر کا بنا ہوا تھا اور اُس پر سونے کا کام بھی تھا۔ جب اس نے تمام محل کی سیر کر لی۔ اور اُسے نہایت صاف و ستھرا پایا تو اپنے رفیق کے منہ پر تھوک دیا اور کہا۔ "معاف فرمایئے مجھے تھوکنے کی ضرورت تھی۔ اور آپ کے منہ سے زیادہ اس کام کے لئے کوئی میلی جگہ مجھے نظر نہ آئی جہاں تھوک سکتا"۔

ایک روز دیو جانس ایسی جگہ پہنچا جہاں لڑکے کھیل رہے تھے خود بھی وہیں کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں نے اُسے گالیاں دے کر نکال دیا تو چلا تو آیا لیکن ان سب کے نام بھی لکھ لایا تاکہ شہر میں گشت کر کے اُن کا اعلان کرے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس کے فقر و فاقہ پر ملامت کرنی اور شرم دلانی شروع

کہ اُس نے کہا فقیر ملامت کا مستحق نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جو مال دار ہیں اور رات دن قبائح اور رذائل میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اچھی چیز وہ ہے جو سستی ہو میں نے بسا اوقات سنگ مرمر کی تصویریں دیکھی ہیں۔ جو ہزاروں روپیہ میں فروخت ہوتی ہیں۔ لیکن ایک من گیہوں کے مقابلہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا جو ایک روپیہ میں آ جاتا ہے۔

ایک روز وہ حمام میں گیا۔ اور دیکھا کہ پانی بہت میلا ہے حمام والے سے پوچھا جو شخص یہاں نہاتا ہے۔ وہ اپنا بدن کہاں جا کر پاک کرتا ہے۔

ایک روز لوگ اُسے فیلپس مقدونی کے پاس پکڑ لائے فیلپس نے پوچھا "تم کون ہے؟" جواب دیا "تمہاری طرح ایک جاسوس" اُس نے اس فقرہ کو بہت پسند کیا اور اُسے چھوڑ دیا۔

اس کا قول تھا کہ حکمار کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے تمام چیزیں اُن کے قبضہ میں ہیں۔ وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ ہر چیز خدا کی ہے اور یہ لوگ خدا کے محبوب ہیں۔

ایک مرتبہ سکندر اُس کی ملاقات کو گیا۔ اور دیکھا کہ وہ دھوپ میں بیٹھا ہے اور اُس کا صندوق بھی سامنے پڑا ہے۔ سکندر نے اس کے پاس جا کر کہا "میں سکندر ہوں" وہ بولا "میں دیو جانس کلبی ہوں" سکندر نے کہا "تم مجھ سے ڈرتے نہیں ہو؟" اس نے کہا "تم نیک ہو یا بد" اس نے جواب دیا "نیک" کہنے لگا "تو پھر نیک آدمی

سے کیوں خوف کروں؟ سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا پھر اس سے کہا کہ تم اپنی کوئی حاجت میرے سامنے پیش کر دیں پوری کروں گا۔ کہا میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تم نے دھوپ روک لی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم دونوں میں کون زیادہ بے پرواہ ہے ایک کمبل اور ایک گٹھری والا یا وہ شخص جو اپنی وسیع سلطنت اور عظیم الشان حکومت پر قانع نہیں ہے۔ بلکہ بقیہ دنیا کو قبضہ میں لانے کے درپے ہے۔ اور مفت میں اپنی جان کو خطرات میں ڈال رہا ہے۔ سکندر کے رفقاء بہت متعجب ہوئے۔ خاص کر جب انہوں نے دیکھا کہ باوجود اس شخص کی بیباکی اور جراءت کے سکندر کے دل میں کچھ اور عزت بڑھتی جا رہی ہے۔ سکندر نے اسی کو محسوس کیا اور اپنے رفقاء کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"اگر آج میں سکندر نہ ہوتا تو دیو جانس ہوتا۔"

دیو جانس ایک مرتبہ جہاز کا سفر کر رہا تھا۔ دریائی ڈاکو آئے اور اسے پکڑ لے گئے اور جزیرہ کریٹ میں ایک غلام کی صورت سے بیچنے لگے اس نے ایک موٹے شخص کو دیکھا جو اچھے وضع و لباس میں تھا۔ کہنے لگا مجھے اس کے ہاتھ بیچ دو۔ اس کو ایک معلم و مؤدب کی ضرورت ہے اس شخص کا نام زینا ڈیس تھا۔ دیو جانس اس شخص کی طرف بڑھا اور کہا بیٹے مجھے خرید لو۔ میں تمہیں تعلیم دوں گا۔ اور ادب سکھاؤں گا۔ زینا ڈیس نے پوچھا تم کیا جانتے ہو؟ بتایا میں تہذیب و ترتیب کے اصول سے واقف ہوں۔ آخر کار زینا ڈیس

نے خرید لیا۔ جب اسے لیکر چلا تو دیو جانس نے کہا۔ میں تمہارا غلام تو ہو گیا ہوں مگر شرط یہ ہے۔ کہ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا۔ زیناڈس نے اُسے اپنے لڑکوں کا معلم مقرر کیا۔ دیو جانس نے بڑی کوشش سے انکی تعلیم اور تربیت کی اور انہیں شعر گوئی، حکمت، پہلوانی، شکار اور تیر اندازی وغیرہ سکھائی، اور قناعت کرنے اور موٹا کپڑا پہننے کی انہیں ترغیب دی۔

ایک روز ایک شخص اس کے پاس آیا۔ جو اُسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ دیو جانس نے اُس سے کہا "تمہیں نہیں معلوم کہ وہ شخص جو شیر کو کھلاتا، پلاتا ہے خود شیر کا قیدی ہے۔ شیر اُس کا قیدی نہیں ہوتا"

ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ کھانے کے لئے کونسا وقت مناسب ہے۔ اُس نے کہا کہ اگر تم مالدار ہو تو جب چاہو کھاؤ۔ اور اگر فقیر ہو تو جب ملجائے وہی وقت مناسب ہے

اس کی عجیب عادت یہ تھی بجائے سر کے پاؤں میں خوشبو لگاتا تھا۔ لوگوں نے دیکھ کر پوچھا یہ کیا حرکت ہے، تو جواب دیا کہ سر میں خوشبو لگانا فضول ہے۔ کیونکہ وہ ہوا کے ساتھ پھیل کر ضائع ہو جاتی ہے۔ اور آدمی اس سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، اور اگر پاؤں میں لگائی جائے تو اس سے ہر وقت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ایک شخص نے اس سے کہا کہ اگر تم میری ملاقات کو نہ آؤ گے تو میں تمہیں

قتل کر دوں گا۔ اُس نے کہا یہ تو کوئی کمال کی بات نہیں ایک چھوٹا سا زہریلا کیڑا بھی یہ کام کر سکتا ہے۔

ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ حکام ایک چور کو سزا دے رہے ہیں جس نے سرکاری خزانے سے ایک برتن چرایا ہے دیو جانس نے کہا۔ بڑے چور چھوٹے چور کو سزا دے رہے ہیں۔ جب اُسے کوئی ضرورت ہوتی اور کسی کے پاس مانگنے جاتا تو اس سے کہتا تھا۔ کہ تم نے مجھ سے پہلے کسی اور کو بھی دیا ہے یا نہیں۔ اگر دیا ہے تو اسی طرح مجھے دو اور نہیں دیا تو مجھی کو وہ پہلا شخص قرار دیجیے تم اپنی عمر میں سب سے پہلے کچھ دینے والے ہو۔"

وہ کہا کرتا تھا۔ کہ شہوت مصائب کی جڑ ہے۔ علماء معبود کے مظاہر ہیں پیٹ زندگی کا وبال ہے عشق بیکاری کا مشغلہ ہے۔ بڑھاپا اور افلاس دونوں بلا ہیں اور دُنیا میں سب سے بہتر چیز آزادی ہے۔

لوگوں نے اُس سے پوچھا۔ کہ لوگ اندھوں اور لنگڑوں کو دیتے ہیں۔ اور فلاسفہ کو نہیں دیتے۔ اس کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ وہ ڈرتے ہیں کبھی وہ اندھے یا لنگڑے نہ ہو جائیں مگر فلسفی ہونے کا انہیں ذرا بھی خوف نہیں۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم ہی تو کھوٹے روپے بنایا کرتے تھے۔ کہا کہ جب میں تمہاری طرح تھا۔ لیکن اب میں اس مرتبہ پر پہنچ گیا ہوں۔

جیسے تم عمر بھر حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ ایک شخص تیر چلا رہا ہے اور کبھی اس کا تیر نشانہ پر نہیں لگتا۔ دیو جانس نے جا کر اپنا سر نشانہ کی جگہ لگا دیا اور کہا کہ اور کہیں تو مجھے خوف ہے کہ تیر نہ لگ جائے لیکن یہاں تو میں اطمینان سے رہ سکتا ہوں۔

لوگوں نے اس سے کہا کہ تم بازاروں میں کیوں کھاتے پھرتے ہو کہا کہ جس طرح گھر میں بھوک لگتی ہے اسی طرح بازار میں بھی لگتی ہے۔ لوگوں نے کہا یہ عادت تو تمہاری کتوں کی طرح ہے اس نے کہا کہ کتے تم ہو جو کھانے والے کے پاس جمع ہو گئے ہو۔

وہ کہتا تھا کہ جو لوگ وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور خود اس پر عمل نہیں کرتے وہ آلات موسیقی کی طرح ہیں۔ جن سے نہایت دلخراش کن نغمات نکلتے ہیں اور خود وہ بے شعور اور بے حس ہیں۔

لوگوں نے اس سے کہا کہ جب تم مرو تو تمہیں کہاں دفن کریں، کہا جنگل میں ڈال دینا۔ لوگوں نے کہا درندے کھا جائیں گے۔ کہا میرے پاس ایک لکڑی رکھ دینا۔ اگر کوئی کھانے آئیگا۔ تو بھگا دوں گا۔ لوگوں نے کہا کیا مرنے کے بعد بھی تم ایسا کر سکو گے۔ جواب دیا کہ میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ تو مجھے کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی پھر اس کی فکر کیا کہ میں کہاں دفن ہوں گا۔

دیو جانس کے اس قسم کے نوادر نہایت کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔

۹۰ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ مشہور یہ ہے کہ جس روز سکندر کا انتقال ہوا تھا اسی روز اس نے بھی وفات پائی تھی۔ موت کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ گائے کا ایک پیر کچا کھا گیا۔ اور اسے ہضم نہ کر سکا اور مر گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ خود اس نے اپنی سانس روک لی تھی۔ یونانیوں نے اس کی قبر پر ایک مجسمہ کتے کا بنا دیا تھا اور اس کی مختصر سیرت بھی قبر پر لکھ دی تھی۔

"نگار" ستمبر ۱۹۲۲ء

علمِ کیمیا کی ہمہ گیری

تم اپنے روز کے مشاغلِ حیات میں، زندگی کے روزانہ معمولات میں صبح سے شام تک ہزاروں چیزیں دیکھتے ہو۔ انہیں کام میں لاتے ہو۔ اور تم یہاں تک اُن کے پابند ہو کہ اگر آج تمہاری معاشرت ان سے محروم کر دی جائے تو شاید تم اپنی زندگی کو بے معنی محسوس کرنے لگو اور چیخ اُٹھو کہ "اب ہم کیونکر زندہ رہ سکتے ہیں" لیکن شاید کبھی اس پر غور نہ کیا ہوگا کہ یہ چیزیں کیونکر عالم وجود میں آئیں اور عہد حاضر کے ماہرین علم الکیمیا نے کس حد تک اپنی کوششوں کو ان پر صرف کیا ہے۔

صابون جس سے تم روز ہاتھ منہ دھوتے ہو، ٹب جس میں تم نہاتے ہو،

تولیہ جس سے تم اپنا بدن خشک کرتے ہو، تمہارا برش، کنگھا، قلنچی، استرہ بٹن، چمڑا اور تمام وہ چیزیں جن سے تمہاری معاشرت کی ترکیب ہوئی ہے۔ کیمیائیین کے ہاتھوں سے ہو کر نکلی ہیں۔ جو اب بھی ہر وقت اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ کیونکر ان اشیاء کو تمہارے سامنے زیادہ اچھی صورت میں پیش کر سکیں۔

وہ رات دن سوچ رہے ہیں کہ تمہارے کالروں کو کیونکر بغیر پانی کی مدد کے سفید تر بنا سکتے ہیں۔ میز کی چھریوں کو کیونکر زنگ کے خطرہ سے محفوظ کر سکتے ہیں اور تمہارے کانٹے اور چمچ کس طرح زیادہ مستحکم صیقل کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں تو نہیں لیکن مغرب میں غذا بھی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک کسی ماہر علم الکیمیا کی ذہانت اس پر صرف نہ ہوئی ہو کیونکہ کھیتوں کو زرخیز بنانے کے لئے وہاں کے تمام کاشتکار کیمیادی اجزاء کے استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ علاوہ اس کے وہ باریک کاغذ جو غسلخانہ میں استعمال کیا جاتا ہے، رنگ جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں، مٹی کے برتن جس سے پانی پیا جاتا ہے، تیل، چربی، گیس، برقی روشنی اور پیٹرول وغیرہ سب علم الکیمیا کے نتائج ہیں۔

بعض کیمیادی اعمال کا تعلق زندگی کے نہایت اہم شعبہ سے ہے مثلاً ہوا کے سمندر سے نائیٹروجن حاصل کرنا جو پودوں کی پرورش کیلئے (جن سے

انسانی غذا کا شدید تعلق ہے۔ اذیں ضروری ہے اسی طرح نفس غذا ر
کے متعلق یہ تحقیق کہ وہ کیوں ہمارے لئے ضروری ہے، کیونکہ ہم اس کو بہترین
طریقہ سے استعمال کر سکتے ہیں اور کس طرح پر مصنوعی غذائیں تیار کر کے فطری
پیداوار سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ اس آخری تدبیر
میں انسانی علم الکیمیا کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس خدمت کو خود
فطرت نے اپنے سر لے لیا ہے۔ اور وہی اچھی طرح سمجھ سکتی ہے کہ آفتاب
کی قوتِ حرارت سے کس طرح ہوا۔ اور پانی کا کاربن اور آکسیجن نکالا جا سکتا
ہے اور ان کے ذریعہ سے کیونکہ ایک درخت نیشکر بن جاتا ہے۔ اور
دوسر امنطل۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ علم الکیمیا کی دسترس سے بالکل باہر ہے
اور اگر کوئی کیمیا داں ایسا کر سکے تو اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ عمل دنیائے
علم و سائنس میں بے نظیر معجزہ سمجھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اسے اگر
کوئی کامیابی ہو سکتی ہے تو صرف اس قدر کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ پودے کیونکر
آفتاب کی قوتِ حرارت کو جذب کرتے ہیں اور پھر وہ اپنے تجربہ گاہ میں
مختلف درختوں پر اس فطری عمل کا مطالعہ کرے۔ لیکن اگر اس حد تک کامیابی
ہو جائے تو بھی بڑا کمال ہے کیونکہ اس کے بعد کوئلہ، ایندھن، بلکہ خود غذا کی
فراہمی کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے اور یہ خیال کہ زمین نے اپنی پیداوار

کم کرنا شروع کر دیا ہے باعثِ تکلیف نہیں رہ جاتا۔

اس خیال کے ماتحت عہدِ حاضر کے کیمیاداں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کیا طریق ہے جس کے ذریعہ سے درخت کی پتیاں بغیر کیمیاوی اجزا کی مدد کے صرف کرو فائل اور پروٹوپلازم سے حرارتِ آفتاب اور قوتِ نمو حاصل کر لیتی ہے اس کے ساتھ وہاں دقائق (PARTI GLES) مادہ پر بھی غور کر رہے ہیں جو باہم مل کر مختلف اجسام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

ان ماہرین علم الکیمیا میں اس وقت جیکوتس ہوف (جو ہالینڈ کا باشندہ ہے) سب سے بڑا ماہر فن ہے جس نے دقائق کی ایک صورت اپنے ذہن سے پیدا کی ہے۔ اس کے رقیبوں نے ہر چند اس کا بہت مضحکہ اڑایا اور اسے گھوڑوں کا ڈاکٹر کہہ کر پکارنا شروع کیا کیونکہ وہ ایک ڈرتری کالج میں لکچر دیا کرتا تھا لیکن چند دن بعد لوگوں کو سخت حیرت ہوئی جب ایک قسم کے دقائق کو اس نے جدا جدا دکھا دیا۔ یہاں تک کہ اب تمام ماہرین کیمیا نے اس کے اصول کو اختیار کر لیا اور رنگ، عطر وغیرہ بنانے والوں کو اس سے اتنا بڑا فائدہ پہنچا کہ اگر جیکوتس یہ انکشاف نہ کرتا تو وہ ابھی برسوں اس منزل تک نہ پہنچ سکتے۔ کیمیا داں جس قدر عجیب و غریب طریقہ سے اپنے انکشافات پیش کرتے ہیں وہ دنیائے سائنس کا نہایت

عجیب و غریب افسانہ ہے

بہت عرصہ ہوا ایک کیمیاداں نے دریافت کیا تھا کہ شکر کے وقائق الکمل اور کلدلونک ایسڈ کے وقائق میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اول اول تو اس انکشاف سے کوئی نتیجہ نہ برآمد ہوا۔ لیکن بعد کو لندن کے ایک کیمیاداں نے معلوم کیا کہ اس طرح ان وقائق سے گلیسرین کی بھی ایک مقدار حاصل ہو سکتی ہے۔ اور ایک مخصوص طریقہ اختیار کرنے پر یہ مقدار زیادہ بڑھ سکتی ہے۔ جب جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ نے گلیسرین (جو تمام پھٹ جانیوالے آلات حرب کے لئے ازلبس ضروری ہے) کی روانگی جرمنی کے لئے بند کردی تو وہاں کے ایک کیمیاداں نے فوراً شکر سے اسے حاصل کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ جرمنی گلیسرین کی درآمد سے بالکل بے نیاز ہوگیا۔

اسی طرح نائٹروجن کے مسئلہ کا فیصلہ ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں سر ولیم کروکس نے ظاہر کیا کہ گیہوں کی پیداوار کم ہو رہی ہے۔ اور اگر انحطاط کا یہی عالم رہا تو وہ وقت دور نہیں جب ساری دنیا بھوکی مر جائے گی ضروری ہے کہ زمین کو زرخیز بنایا جائے۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ بجائے معمولی کھاد کے نائٹریٹ کا استعمال کیا جائے۔ جو صرف ہوا سے حاصل کیا جا سکتا ہے اس سے قبل ناروے میں دو کیمیاداں بجلی کے ذریعہ سے اسے حاصل کرتے تھے۔ لیکن اس کے مصارف زیادہ آتے تھے۔ بہر حال مختلف طریقے اس کے لئے نکالے گئے

لیکن اُن میں سے جو بہترین طریق ہے وہی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

علم الکیمیا کے متعلق بعض چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر ضروری نہیں معلوم ہوتیں۔ لیکن حقیقتاً اُن کی اہمیت کا اعتراف ناگزیر ہے انہیں میں سے ایک سلفورک ایسڈ (گندہک کا تیزاب) ہے اِس کے ذریعہ سے صابون بنتے ہیں۔ یہی برتن کی وارنش کو سخت کرتا ہے۔ اسی کی مدد سے تولیہ کے تاگے تیار ہوتے ہیں برش بنتے ہیں، یہی اُسترے کیلئے لوہار تیار کرتا ہے۔ یہی کپڑے کو کو سفید بناتا ہے اور اسی سے رنگ بنتے ہیں۔ الغرض کاغذ ساز، روشنائی بنانے والے، برقی روشنی مہیا کرنیوالے اور گیس کے تمام کارخانے بیکار ہو جائیں اگر ایک منٹ کے لئے سلفورک ایسڈ نہ رہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ یہ کثیر مقدار میں اور زیادہ ارزاں فراہم کیا جائے

ایک کیمیا داں کا کام سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ ایک چیز کے اجزاء الگ الگ کر کے اس سے کوئی دوسری چیز تیار کرے یا یہ دیکھے کہ فطرت کیونکہ اس پر اپنی صناعی صرف کرتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ بتیاں صرف آکسیجن، نائٹروجن، ہائیڈروجن اور کاربن کی ترکیب سے مختلف اشیاء کے اجزاء پیدا کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ کیمیا داں نے بھی فطرت کے اس عمل کو دیکھ کر اسی کی تقلید کی کوشش کی اور آخر کار اس نے مصنوعی نیل بنا کر ثابت کر دیا کہ اس سے بہتر فطرت کا راز دار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمیشہ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ ارزاں طریق کون سا ہے۔ اور اس میں وہ فطرت کا مقابلہ پوری طرح اس وقت تک نہیں کر سکا۔

فطرت کی تجربہ گاہیں تو نہایت عام ہیں۔ مثلاً ہمارے جسم کے اندر بھی اس کے معامل قائم ہیں جس وقت غذا منہ میں جاتی ہے۔ تو ہمارا فطری عمل چبانے کا اس کے بہت سے اجزا کر دیتا ہے اور پھر قدرت اس کو مختلف چیزوں میں تبدیل کر دیتی ہے جو ہمارے عروق و غدود وغیرہ کے لئے مفید ہیں اب کیمیا داں اس امر کے درپے ہیں کہ فطرت کے اس عمل کا حال معلوم کرلیں کیونکہ دنیا کی تمام آبادی کی حیات کا انحصار اسی پر ہے کہ اس راز کا وقوف حاصل کر لیا جائے اور خود مصنوعی غذائیں بنا کے فطرت کے احسان کو ضعیف کر دیا جائے

کہا جاتا ہے کہ ارزانی ہیں فطرت، علم الکیمیا کو شکست دے رہی ہے درآنحالیکہ ارزانی ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر کامیابی کا سارا انحصار ہے جب جنگ کے دوران میں انگلستان کے ماہرین علم الکیمیا نے سلفورک ایسڈ بنانے کے کارخانے قائم کئے تو اسی سلسلہ میں یہ بھی دریافت ہوا کہ تارکول کے اجزا جدا جدا کر کے اس سے ہزاروں قسم کے رنگ تیار ہو سکتے ہیں۔ بظاہر تو یہ نہایت معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن مصارف کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف نیل بنانے کی کوشش میں نصف ملین پونڈ صرف ہو گئے۔ اور ایک پیسہ بھی اس قدر صرف کے بعد حاصل

نہ ہوا۔ اگر اتنی ہی رقم تیل کی کاشت میں صرف کر دی جاتی تو فطرت جو کچھ اس کے عوض میں دیتی کسی سے مخفی نہیں ہے۔

اس وقت ایندھن کا مسئلہ بھی نہایت اہم ہے یہاں تک کہ جرمنی کے نہایت مشہور اور بیسویں صدی کے بہترین کیمیاداں ایمل فشر نے ظاہر کیا ہے کہ اگر جرمنی تاوان جنگ کو کسی طرح ادا کر سکتا ہے۔ تو اس کی صورت صرف یہی ہے کہ ایک نئے قسم کا ایندھن تیار کیا جائے جس کی ضرورت ساری دنیا کو ہے چنانچہ کوئلے کی خاک پیٹرول کے ساتھ ملا کر، وزنی تیلوں سے ہلکے تیل جدا کر کے اور اس کے علاوہ مختلف طریقوں سے ایندھن کے مسئلہ پر غور کیا جا رہا ہے اور ممکن ہے کہ جرمنی اس باب میں سبقت لے جائے۔

اسی طرح گیس کا مسئلہ ہے۔ جس پر بہت عرق ریزی کرنے کے بعد پہلے صرف اتنی کامیابی ہوئی تھی۔ کہ گیس کو سرد کر کے رقیق یا منجمد شئے میں تبدیل کر لیتے تھے۔ لیکن اس کا مصرف سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اب وقت تمام کے بعد یہ معلوم ہوا ہے۔ کہ رقیق آکسیجن کے ذریعے سے بھٹیوں کا ٹمپریچر بڑھایا جا سکے گا۔ اور پسے ہوئے کوئلے کے ساتھ ملا کر اس سے پھٹ جانے والی چیزیں بن سکیں گی۔ اسی طرح رقیق ہیڈروجن کا استعمال بھی زیر غور ہے۔

شیشہ کے متعلق بھی ماہرین کیمیا رات دن مختلف تدابیر میں لگے ہوئے ہیں۔ اس وقت تین قسم کے شیشے ہیں جو اپنی ساخت کے لحاظ

سے مختلف چیزوں (دوربین، خوردبین، عینک، کیمرہ وغیرہ) میں لگائے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض بعض پر نہایت باریک دقیق عمل کیمیا صرف کیا جاتا ہے تاہم ہنوز درجہ تکمیل تک یہ مسئلہ نہیں پونچا اور ان شیشوں کو زیادہ قوی، مفید اور شفاف بنانے کی کوشش جاری ہے۔

الغرض اسی طرح لوہا، ایلومینیم، پوٹاش وغیرہ سینکڑوں معدنی اشیاء کی نسبت تجربے جاری ہیں بعض میں کامیابی ہوگئی ہے بعض کی کامیابی خوشگوار مستقبل سے وابستہ ہے اور دُنیا میں علم الکیمیا نے عجیب و غریب ہنگامہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اس تمام کارگاہ علم و سائنس میں دو منظر کبھی فراموش نہیں ہو سکتے ایک تو اُن ارباب سائنس کی حیرت کہ انسان باوجود اس کے کہ اس میں ۱۲ پونڈ نمک اور ۸ گھڑے پانی سے زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ سوائے فطرت کے اور کسی دُوسرے ذریعہ سے نہیں بن سکتا۔ اور دوسری طرف ہماری یہ غفلت کہ باوجود علم الکیمیا کی اس ہمہ گیری کے ہمیں یہ بھی خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کرۂ ارض کا دوسرا نصف حصہ کس حد تک اپنے علم کو وسیع بنا تا جا رہا ہے

"نگار" اگست ۱۹۲۲ء

فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں

رود نیل کی آغوش میں

"اے ازلی و ابدی اہرام۔ اے ماضی کے اسرار عظیم۔ اے حال کی چیستان اور آئندہ آنیوالی نسلوں کے مایۂ حیرت و استعجاب!"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ایک ادیب سیاح نے اہرام مصری کے متعلق لکھے ہیں۔

اہرام کا پہلا نظارہ

جب کوئی سیاح عروس البلاد قاہرہ سے رود نیل کے مشرقی کنارہ پر اہرام کا پہلا نظارہ کرتا ہے تو فاصلہ کی وجہ سے وہ زیادہ دلچسپ تو نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کے دل میں کچھ اور تاثرات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ چار پانچ میل کے فاصلہ سے وہ ایسے نظر آتے ہیں گویا قریب ہی ہیں۔

اور جوں جوں سیاح آگے بڑھتا جاتا ہے وہ دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور دیکھنے والے کو ان عجیب عمارتوں کی عظمت و شان پر غور کرنے کا کافی موقعہ ملتا ہے۔ یہ خاص اثر کچھ تو اہرام کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کچھ ان کی وضع قطع کی سبب ہے۔ چونکہ اہرام بہت عظیم الشان اور چار برابر قاعدوں کے بڑے بڑے تودے ہیں اس لئے ان میں ایسے چھوٹے چھوٹے حصے نہیں ہیں جن پر سیاح کی نظر جم سکے۔

صبح صادق کی دھندلی روشنی میں جب ان اہرام پر پہلی نظر ڈالی جاتی ہے۔ تو وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا عجیب ہیئت کے پہاڑ ہیں۔ اور ہرم اعظم ایک ایسا پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ جس کے نیچے کی زمین ایک طرف سے دب گئی ہے۔ اور وہ ایک طرف کو زیادہ جھک گیا ہے۔ جب سیاح ان تین بڑے اور ایک چھوٹے ہرم کے قریب پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا یہ حصہ بے اختیارانہ اوپر کی طرف ابھرا چلا جارہا ہے اور جب وہ تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر رہ جاتے ہیں تو اس قدر قریب معلوم ہوتے ہیں گویا آگے بڑھ کر ان کو چھولیا جاسکتا ہے لیکن جب سیاح اور زیادہ قریب پہنچتا ہے تو ان کی عظمت کا نہایت گہرا اثر اس پر پڑنے لگتا ہے اور جب وہ ان کے ڈھلواں پہلوؤں پر نظر دوڑا کر ان کی چوٹیوں پر نظر ڈالتا ہے۔ تو ٹوپی سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے۔

بعض مرتبہ ان اہرام کو دیکھنے والوں کے جذبات اس قدر ہیجان میں آ گئے

ہیں ۔ اور اس قدر وحشت وہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ کہ لطف کی بجائے تکلیف پیدا ہو جاتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے ان کے متعلق لوگ یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ ان مکروہ صورت اور بدہیئت تودوں کی تعمیر میں نہ کوئی ذوقِ سلیم نظر آتا ہے۔ نہ خوبصورتی . . . . .

ہرم اعظم کی پائیں میں کھڑا ہو کر اگر کوئی شخص اس پر نگاہ ڈالے تو اس سر بفلک جلیل القدر یادگار کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ عرب رہنما جب اس پر چڑھ کر ادھر اُدھر پھرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیڑے رینگ رہے ہیں ۔ جب کوئی شخص ہرم پر چڑھنا شروع کرتا ہے۔ اور دم لینے کے لئے کھڑا ہو کر نیچے کی طرف دیکھتا ہے ۔ تو اُسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو لوگ نیچے کھڑے ہوئے ہیں وہ حشرات الارض سے زیادہ بڑے نہیں اور پھر جب وہ ہرم کی چوٹی کی طرف نظر اُٹھاتا ہے۔ تو اس کی عظمت وشان کی حقیقت کھلتی ہے ۔ عرب رہنماؤں کی مدد سے ہرم اعظم پر چڑھنے میں نصف گھنٹہ کے قریب وقت صرف ہوتا ہے۔

ہرم اعظم ہرم اعظم اہرام سے ایک ہے جو شہر قاہرہ سے جانب جنوب تھوڑے سے فاصلہ پر دریائے نیل کے کنارے واقع ہیں ۔ تمام اہرام میں یہی ہرم سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ یہ بلحاظ حجم سب سے بڑا بھی ہے۔ اور اس کے متعلق بہت سی دلچسپ روایات بھی بیان کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس کے

اندر بہت سے پوشیدہ راستے سُرنگیں اور کمرے بھی ہیں۔ ہرم اعظم کے اندر بڑے بڑے بڑے وسیع ایوانات شاہی بنے ہوئے ہیں جن میں طویل راستوں اور غلام گردشوں کے ذریعہ سے پہنچتے ہیں۔ ان راستوں کا داخلہ نہایت ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے اندر صدیوں تک کوئی شخص داخل نہ ہو سکا مگر اتفاق سے ان راستوں کا راز فاش ہو گیا تب لوگوں کو اندرونی زمین دوز کمروں کا حال معلوم ہوا۔ ان کمروں میں داخل ہونے کے لئے سطح زمین سے اس قدر بلند و طویل راستے کیوں بنائے گئے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہرم اعظم کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً بڑی گیلری کا راستہ زمین سے تقریباً ۲۸ فٹ بلند ہے اور ڈھلوان ہوتا ہوا ایوان شاہی کی طرف چلا گیا ہے۔ اگر اس راستہ کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ بادشاہ کا تابوت ایوان شاہی میں پونچا دیا جائے تو آٹھ فٹ اونچا راستہ بھی کام دے سکتا تھا۔ دروازہ کو اس قدر بلند بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو منجملہ دیگر اسرار ہرم اعظم کے ہنوز حل طلب ہے ان اسرار پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ سب سے پہلے ہم اس کے مختصر تاریخی حالات درج کرتے ہیں۔

تاریخی حالات | ہرم اعظم ملک خوفو فرعون مصر نے تعمیر کیا تھا جسے انگریزی زبان میں کیوپس (Cheops) کہتے ہیں۔ اس فرعون کے عہد کی تاریخ کے بارہ میں اگرچہ ابھی تک کسی قدر شبہ باقی ہے لیکن اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کم از کم ۲۹۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا۔ اور بعض کے نزدیک اس

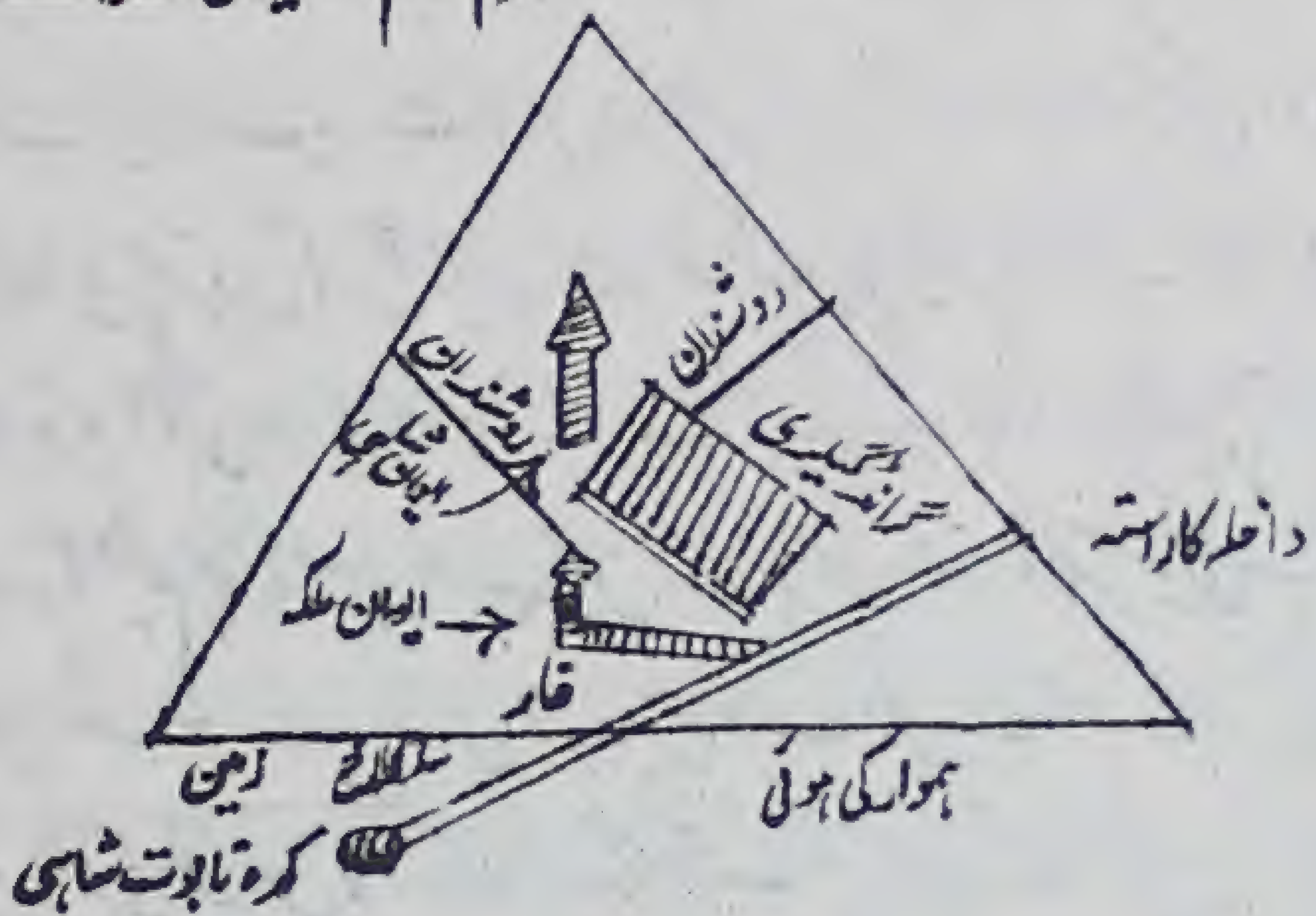
کا زمانہ اس سے بھی ایک ہزار سال قبل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خوفو فرعون مصر نے یہ ہرم اپنے مقبرہ کے لئے تعمیر کیا تھا۔ اور اس امر کی بھی کافی شہادتیں موجود ہیں۔ کہ فرعون مذکور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ایوان شاہی میں مدفون کیا گیا تھا۔ اس ہرم کی تعمیر میں لکھو کھا غلام لگائے گئے تھے۔ اور سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تمام کاریگروں اور مزدوروں کو ایک ایک لاکھ کی تین جماعتوں میں تقسیم کیا گیا تھا ہر جماعت کو تین ماہ تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اور بقیہ دونوں جماعتیں اس جماعت کو سامانِ رسد پونچانے کے علاوہ اپنا اپنا کام کرتی تھیں۔ اس مقبرہ کی تعمیر میں سنگ سرخ اور سنگ آہک رچونے کے پتھر) سے کام لیا گیا تھا۔ سنگ سرخ مصر سے سات سو میل کے فاصلہ پر بمقام سائینہ کھودا گیا تھا اور حیرت ہوتی ہے کہ تعمیر ہرم کے لئے اس قدر بعید فاصلہ سے اتنے بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑوں کو کیونکر لایا گیا تھا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے۔ کہ اس زمانہ میں جب کہ آلات جر ثقیل موجود نہ تھے ان بھاری پتھروں کو سطح زمین سے اٹھاکر ان کی جگہ پر نصب کیونکر کیا گیا۔ جب کہ ہرم اعظم کی بلندی ۴۸۱ فٹ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہرم اعظم کے اندر ۲۳ لاکھ عظیم پتھر کی سلیں نصب ہیں۔ اور ہر سل اندازاً ستر من کی ہے۔

تعمیر کے متعلق مختلف نظرئے

اس بارہ میں مختلف نظرئیے قائم کئے گئے ہیں کہ ہرم اعظم کی تعمیر میں جو اتنے بڑے بڑے پتھر کام آئے۔ انہیں زمین

سے اٹھا کر ان کے مقام تک کیونکر پہنچایا گیا تھا بعض کا خیال ہے کہ ان پتھروں کو بلند کرنے کیلئے عظیم الشان منجنیقوں سے کام لیا گیا تھا بعض کہتے ہیں کہ موٹے موٹے رسّوں سے باندھ کر مزدوروں نے اُٹھایا تھا لیکن صحیح قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے نیل کے کنارے سے ہرم اعظم کی بنیاد تک ایک ڈھلوان راستہ بنایا گیا تھا۔ اور ہزارہا مزدور ایک ساتھ زور لگا کر ان پتھروں کو کشتیوں سے اُٹھا کر راستہ پر لڑھکاتے یا کھینچتے ہوئے موقعہ پر پہنچا دیتے تھے۔ اور جب ہرم کی زیریں منزل مکمل ہو جاتی تھی۔ تو اس سڑک کی سلامی اور زیادہ کر دی جاتی تھی۔ جب ہرم اعظم مکمل ہو گیا تو یہ سڑک توڑ دی گئی اور اس کا ملبہ کسی دوسرے مقام پر پہنچا دیا گیا۔ اس سڑک کے آثار اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

ہرم اعظم کے ایوان اور راستے



ہرم اعظم کے جغرافی وقوع کے متعلق | ہرم اعظم کے متعلق دلچسپ معلومات
بعض بہت سی دلچسپ باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً

یہ کہ ہرم اعظم سے جو خط طول البلاد عرض البلاد گزرتا ہے اس پر دنیا بھر میں سب سے زیادہ خشکی کا حصّہ پایا جاتا ہے۔ یا یہ کہ مصر زیریں کے جس علاقہ میں ہرم اعظم واقع ہے وہ تمام دنیا کی آباد زمین کا مرکزی حصہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرم اعظم کے مشرق و مغرب کی طرف جس قدر خشکی کا حصّہ ہے اگر اس کا حساب مربع میلوں میں لگایا جائے اور بالائی اور زیریں گوشوں کے مابین خط کھینچے جائیں تو یہ دونوں خط عین اس مقام پر قطع ہوں گے۔ جہاں ہرم اعظم واقع ہے۔

جس مقام پر ہرم اعظم واقع ہے وہاں سے تقریباً ۳۰ درجہ عرض البلاد شمالی کا خط گزرتا ہے گویا وہ خط استوار اور قطب شمالی کے درمیان ایک ثلث فاصلہ پر واقع ہے۔ ہرم اعظم کے اطراف یا چاروں پہلو بالکل صحیح شمال جنوب، مشرق و مغرب کی طرف واقع ہیں۔ اور انہیں اس قدر صحت کیساتھ تعمیر کیا گیا ہے۔ کہ حیرت ہوتی ہے لہٰذا کرۂ ارض کا خط محور براہ راست اس جگہ کے نیچے سے گذرتا ہے۔ جہاں بادشاہ کا کمرہ ہے ہرم اعظم ایک صاف اور ہموار شدہ سنگلاخ زمین کی سطح پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جو غالباً ایک صحرا دور کرنے سے نکالی گئی ہوگی۔ ہرم اعظم کے اطراف اس کی چوٹی سے ۱۵ درجہ

کا زاویہ بناتے ہیں۔ اس کی بلندی ۱۸۴ فٹ ہے اور ٹھوس پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ جس کے اندر بہت سے پوشیدہ کمرے ہیں اور ان کمروں تک ڈھلوان راستے جاتے ہیں۔ ہرم اعظم کے جانب شمال اندر داخل ہونیکا صرف ایک راستہ ہے جو چار فٹ کے قریب اونچا اور تین فٹ پانچ انچ سے کسی قدر زائد چوڑا ہے۔ یہ دروازہ سطح زمین سے پتھروں کی ساتھویں تہ یا منزل پر واقع ہے راستہ نیچے کی طرف کچھ دور تک ڈھلوان چلا گیا ہے۔ بعد ازاں اس کے دو حصے ہوجاتے ہیں ایک راستہ اوپر کی طرف چلا جاتا ہے اور دوسرا مسلسل طور پر زمین دوز ایوان میں پونچتا ہے جو سطح زمین سے بہت نیچا اور بالکل صحیح طور پر ہرم کی چوٹی کے نیچے واقع ہے۔ اوپر جانیوالا راستہ کچھ دور تک کے بعد ایک عظیم الشان چھتہ" یا گرانڈ گیلری" میں پونچتا ہے۔ جو اٹھائیس فٹ بلند اور ۱۵۷ فٹ طویل ہے۔ چھتہ کے سرے پر ایک چھوٹا سا راستہ اور ہے جو گیلری میں سے گذر کر ایک تنگ دروازہ تک پونچتا ہے۔ یہ دروازہ ایوان شاہی کا ہے جس میں بادشاہ کا تابوت رکھا گیا تھا۔ اسی ایوان کے قریب سے دو سوراخ بطور روشندان ہرم کی بیرونی سطح تک گئے ہیں۔ ایوان شاہی کے اوپر بعض خالی مقامات ہیں۔ اور ان میں جو سب سے اونچا مقام ہے اس پر دو بڑے بڑے پتھر رکھے ہیں۔ جن کا مقصد غالباً یہ ہے کہ ایوان شاہی کے اوپر

جو پتھروں کا زبردست بوجھ ہے۔ اس کو سہارا دیں گرانڈ گیلری کے عین نیچے شمالاً جنوباً ایک افقی سیدھا راستہ اور ہے جو اس کمرہ میں داخل ہوتا ہے جو ملکہ کا ایوان کہلاتا ہے (نقشہ دیکھنے سے یہ تفصیلات بخوبی سمجھ میں آجائیں گی) اس سیدھے راستہ کے شروع میں ایک اور ناہموار سرنگ ہے۔ جو اس مقام پر پونچتی ہے جسے زمین دوز غار کہتے ہیں۔ اس غار سے ایک سرنگ سب سے نیچے والے ایوان میں اترتی ہے۔ اور اسی ایوان میں راستہ کے دہانہ سے ایک سیدھا سلامی دار راستہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس وقت تک ہرم اعظم کے اندر جو کمرے معلوم ہوئے ہیں وہ یہی ہیں۔ آگے چل کر ہم ان کمروں اور خود ہرم اعظم کے متعلق جو پیمائشیں اور معلومات درج کریں گے وہ بہت دلچسپ ہوں گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خفیہ راستے اور ایوان کیونکر معلوم ہوئے اور کس نے معلوم کئے؟ ہم جانتے ہیں کہ ہرم اعظم جب مکمل ہو گیا تھا تو اس کو بند کر کے تمام راستے چھپا دئے گئے تھے۔ یہ گویا ولادت عیسیٰ سے صدیوں بلکہ ہزاروں برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ اور یہ ہرم ہزاروں برس اسی طرح سربمہر رہا۔ اس کا اندرونی راز قدما کو بھی معلوم نہ تھا۔ ابتدا میں ہرم اعظم کے اطراف پر ایک قسم سے سمینٹ کی گچ کاری تھی۔ اور اس کے سب پہلو بالکل صاف اور چکنے تھے۔ مگر بعد میں یہ پلاسٹر دور کر دیا گیا اور اسے دیگر تعمیری کاموں میں

لگادیا گیا۔ اسی طرح ہرم کی چوٹی کے پتھر بھی اکھاڑ کر دوسری تعمیروں میں لگا دیئے گئے۔ کیونکہ پہلے ہرم کی چوٹی نوکدار تھی۔ مگر اب اس کی سطح ۳۳ فٹ مربع کی ہے جو میز کی طرح معلوم ہوتی ہے۔

خلیفہ المامون عباسی اور ہرم اعظم

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ ہرم اعظم کے خفیہ راستے اور کمرے کیونکر معلوم ہوئے۔ خلیفہ المامون بن ہارون الرشید پہلا شخص تھا۔ جو ۸۲۰ئہ کے اوائل میں راستہ توڑ کر داخل ہوا اس نے اپنے مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ شمالی پہلو کے وسط میں توڑ کر راستہ بنائیں مگر چونکہ اس کا راستہ عین وسط میں نہیں بلکہ ۲۴ فٹ بلند جانب مشرق ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس لئے مامون کے کاریگروں کو انتہا سے زیادہ محنت کرنا پڑی اور بالآخر وہ چلا اُٹھے۔ کہ اس عجیب وغریب ہرم کا کھودنا ان کے قابو سے باہر ہے۔ مگر چونکہ مامون عزم راسخ کر چکا تھا۔ اس لئے مجبوراً کام جاری رہا۔ لیکن اس قدر سست رفتاری کے ساتھ کہ چھ مہینے میں صرف ۱۰۰ فٹ کی سرنگ کھودی جا سکی۔ اور راستہ کا پتہ پھر بھی نہ ملا۔ بعض کاریگروں کو ہرم اعظم کے متعلق یہ پرانی روایات یاد آئیں کہ مصر کے کسی پرانے بادشاہ نے یہ کہا تھا۔ کہ اگر وہ مصر کی تمام دولت بھی اس کام میں لگا دے گا۔ تب بھی وہ کسی ہرم کو توڑ نہیں سکے گا۔ لیکن اسی اثنا میں ان سے چند فٹ ایک طرف کسی خالی جگہ میں کوئی بڑا پتھر گرا۔ بس آواز کا سننا تھا۔ کہ ان کی ہمتیں بندھ گئیں۔ اور

انہوں نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنی سرنگ اسی طرف کو دوڑانا شروع کردی جس طرف سے پتھر گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور آخر کار ایک خلائی مقام تک اپنی سرنگ پونچا ہی دی۔ یہ مقام حد درجہ تاریک اور دشوار گزار تھا۔ یہ ایک سلامی دار راستہ تھا۔ جو انہوں نے معلوم کیا تھا۔ اور اسی کے اندر چھت سے اکھڑ کر پتھر گرا تھا۔

اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ چھت میں جہاں سے وہ پتھر گرا تھا ایک دوسرا راستہ شروع ہو کر ہرم اعظم کے اندر گیا تھا۔

چونکہ ان لوگوں کو یقین تھا۔ کہ ہرم کے اندر بے شمار خزانہ بھرا پڑا ہے اس لئے وہ لوگ بے صبری کے ساتھ آگے بڑھے۔ یہ راستہ صرف ۴۷ انچ اونچا اور ۴۱ انچ چوڑا تھا۔ اسی کے اندر رینگتے ہوئے وہ لوگ چلتے رہے اور بالآخر ایک طویل اور بلند چھتہ کے اندر ہو گئے۔ جہاں شب دیجور کی سی تاریکی اور قبر کا سا سکوت طاری تھا۔ یہ راستہ یا چھتہ ان لوگوں کو اس سنگین قید خانہ کے اور اندر لے گیا۔ جب وہ لوگ اس گرانڈ گیلری کے اندر داخل ہو گئے تو انہوں نے اپنے داہنی طرف ایک نہایت عمیق کنویں کا منہ دیکھا۔ جو ۱۴۰ فٹ گہرا تھا۔ مگر اس سے آگے اسی چھتہ کا سلسلہ برابر چلا گیا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ اس لالچ میں اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ کہ شاہان قدیم کے بے شمار خزانہ ان کے ہاتھ آجائے گا یہ راستہ تنگ ضرور تھا کیونکہ صرف چھ فٹ چوڑا تھا اور زمین پر صرف تین ہی فٹ چوڑا

تھا مگر اس کی بلندی ۲۰ فٹ تھی۔ اور اسکی دیواروں کی سطح سنگ مرمر کی طرح صاف چکنی اور چمکدار تھی۔

ان لوگوں نے یقین کر لیا۔ کہ واقعی دفینہ کا راستہ یہی ہے الغرض وہ اس راستہ پر جو ۲۶ درجہ کا زاویہ بناتا ہے آگے بڑھتے رہے۔ اور ڈیڑھ سو فٹ اور آگے پہنچ گئے۔ اس کے بعد سامنے ایک تین فٹ بلند سیڑھی راہ میں حائل ہوئی اس کے بعد ایک تنگ دروازہ ملا جس کے اندر انہیں گردنیں جھکا کر گھسنا پڑا پھر ایک اور تنگ راستہ ملا۔ بعد ازاں سنگِ سرخ کا ایک اور تنگ دروازہ ملا لیکن اس کے بعد وہ ایوانِ شاہی کے اندر داخل ہو گئے اور یہی وہ منزل تھی جس کے لئے یہ تمام سر بفلک اور عجیب و غریب عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

ایوان شاہی میں ان لوگوں نے کیا دیکھا؟ صرف ایک شاندار کمرہ ۳۴۔۴ فٹ طویل اور ۱۷ فٹ عریض اور ۱۹ فٹ بلند۔ جو صاف اور چمکدار سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کے تمام پتھر بالکل چوکور اور پالش شدہ تھے۔ جو حد درجہ خوبصورتی کے ساتھ نصب کئے گئے تھے۔ مگر اس کے اندر خزانہ کا کہیں وجود نہ تھا۔

جب یہ خبر خلیفہ مامون الرشید کو ملی تو وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ بھی اپنے کاریگروں اور مزدوروں کی مدد سے ایوان شاہی تک پہنچ گیا تھا۔ مگر وہاں اُس کو ایک تابوت کے سوائے کچھ بھی نہ نظر آیا۔ فی الحقیقت یہ دنیا کے محیر العقول اسرار میں سے ہے۔ کہ آخر اس فرعون مصر کی لاش کہاں گئی جس کے لئے یہ تابوت

بنایا گیا تھا۔ اور جو اس سنگین مقبرہ میں اس قدر حفاظت کے ساتھ رکھی گئی تھی یہ باور کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ فرعون کی منوط شدہ لاش ضرور اس تابوت کے اندر رکھی گئی تھی۔ اور بعد ازاں تمام اندرونی و بیرونی راستے پوری طرح احتیاط کیسا تھ بند کر دیے گئے تھے۔ کیونکہ اگر فرعون کی منوط شدہ لاش تابوت میں نہ رکھی گئی ہوتی۔ تو پھر راستوں کے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر جب مامون کے لوگ کمرہ میں داخل ہوئے۔ تو انہوں نے فرعون کی لاش کو غائب پایا اور اس کے ساتھ تابوت کا ڈھکنا بھی۔ یہ چیزیں کیا ہوئیں یا انکو کون لیگیا؟ یہ راز آجتک حل نہیں ہوا

مغربی مستشرقین جب ۸۲۰ء میں خلیفہ المامون الرشید عباسی کے کاریگروں نے ہرم اعظم کا پہلو توڑ کر راستہ بنایا اس وقت سے گذشتہ صدی کے آغاز تک ہرم اعظم کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ لیکن ۱۶۳۷ء میں آکسفورڈ کے مشہور ماہر فلکیات پروفیسر جان گریوس نے اس کی سیر کی اور اندرونی و بیرونی حصوں کے بہت سے مقامات کی پیمائشیں لیں۔ اس کے بعد مسٹر جان ٹیلر (ولادت ۱۸۱۰ء وفات ۱۸۸۴ء) نے آکر دیکھا اور پیمائشیں لیکر بہت سے نظریے قائم کئے جن کی بعد میں پروفیسر پیازی اسمائتھ نے بہت سی تفصیلات بیان کیں ۱۸۳۷ء میں کرنل ہاورڈ وائس نے بھی اس کی بہت کچھ دیکھ بھال کی۔ اور یہی پہلا شخص تھا جس نے وہ دونوں سوراخ دریافت کئے جنہیں روشندان کہتے ہیں۔ اور جو ایوان شاہی کے اطراف سے نکل کر ہرم کے باہر تک گئے ہیں اور

اسی شخص نے وہ خالی کرے معلوم کئے جو ایوان شاہی کی چھت تلے ہوئے چلے گئے ہیں۔ اور جن کی تعمیر کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اوپر کے حصّہ کا بوجھ سہار سکیں۔

یقیناً دنیا پروفیسر پیازی اسمائیتھ کی ممنون ہے۔ جن کی بدولت ہرم اعظم سے عوام کو اس قدر دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے نہایت محنت اور احتیاط سے اس تعمیر کے ہر حصّہ کی تفصیل وار پیمائش کی۔ مگر افسوس ہے کہ پروفیسر مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے بیانات میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ہرم اعظم ایک الہامی تعمیر ہے۔ اور یہ عظیم الشان عمارت خداوند تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کی ایک ابدی آیت ہے جو بذریعۂ الہام انسان پر نازل ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اپنا یہ قول ہرم کی پیمائشوں پر بنی کیا۔ جن سے ان کے نزدیک یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ بانیانِ ہرم اعظم نے اپنے علم سے زیادہ عمارت بنائی۔ پروفیسر صاحب نے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ ہرم اعظم فرانسیسی پیمانہ عشری پر نہیں۔ بلکہ انگریزی پیمانہ فٹ اور انچ کے حساب سے تعمیر کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی پیمائشیں واقعی حیرت انگیز ہیں۔

بعض دلچسپ اعداد و شمار دنیا جانتی ہے کہ دائرہ کے قطر اور اس کے محیط میں جو نسبت ہے۔ اسے یونانی حرف پائی π سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی صحیح عدد نہیں ہے بلکہ اعشاریہ کی پانچ حد تک جو عموماً تمام کاموں کیلئے

ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قیمت اعدادی ۲/۱۴۱۵۹ ہے۔ لیکن اس کی قیمت لاانتہا مقامات اعشاریہ تک نکالی جا سکتی ہے۔ ۱۸۷۳ء میں مسٹر شینکس نے اس کی قیمت اعدادی سات سو مقامات اعشاریہ تک نکالی تھی۔ یہی باعث ہے یعنی چونکہ ہم کو "پائی π" کی صحیح عددی قیمت معلوم نہیں اس لئے دائرہ کو مربع نہیں بنایا جا سکتا۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ہرم اعظم کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کی اصلی اونچائی کو اس کے قاعدہ کے دوگنے سے یہی نسبت تھی۔ جو دائرہ اور قطر کے درمیان ہوتی ہے یعنی پائی π" کی بالکل صحیح عددی قیمت۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا۔ کہ ہرم اعظم کی تعمیر کرنیوالے علم المساحت کے اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ اور گویا انہوں نے "پائی π" کی قیمت عملاً حل کر دی تھی۔

دوسری بات یہ ہے۔ کہ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ ایک سال ۳۶۵ دن سے کسی قدر زیادہ کا ہوتا ہے۔ وقت کو پورا کرنے کے لئے ہر چوتھے سال ایک دن بڑھا دیا جاتا ہے اور وہ سال سال کبیسہ کہلاتا ہے۔ پس ہر سال ۳۶۵/۲۴۲۲ دن اور اعشاریہ کے لاانتہا مقامات ہوتے ہیں اور ہر سال کبیسہ میں ۳۶۶ دن ہوتے ہیں اب خیال فرمائیے کہ ہرم اعظم کا جو مربع قاعدہ ہے اس کی ہر طرف کی پیمائش یا لمبائی کو اگر ۳۶۶ حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ تو ہر حصہ لمبائی میں کرۂ ارض کے نصف محور کا $\frac{1}{\text{ایک لاکھ}}$ واں حصہ کے قریب یا ۲۵/۱ انچ انگریزی کے قریب ہو گا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہرمِ اعظم کا جو انجنیر تھا اس نے اس کے قاعدہ کی بنیاد رکھتے ہوئے ایک ایسا پیمانہ استعمال کیا ہوگا جو طول میں ۲۵ انچ لمبا تھا۔ اور اس وقت اس کے ذہن میں سال کے دن اور اس کی کسر ہوگی۔ اس طرح گویا اس نے اس پیمانہ کے ذریعہ سے ہرمِ اعظم کے قاعدہ کی ہر سمت سال کے دنوں پر شمار کی تھی اور یہ پیمانہ (یعنی ۲۵ انچ انگریزی) کرۂ ارض کے نصف محور کا $\frac{1}{\text{ایک لاکھ}}$ حصہ ہے۔ اس لئے اگر اسے ۳۶۵/۲۴۲۲ (سال شمسی کے دنوں کی تعداد) سے ضرب دیا جائے تو ہرمِ اعظم کے ربع قاعدہ کی ہر طرف کی صحیح پیمائش نکل آئے گی۔ اسی قسم کے واقعات سے میسرز ٹیلر اور اسمائیتھ نے یہ نتیجہ نکالا کہ تعمیر ہرمِ اعظم میں فٹ اور انچ کے پیمانہ سے کام کیا گیا تھا۔ پرانے مصری "ہاتھ" کے پیمانہ سے کام نہیں لیا گیا تھا جو اندازاً ۲۰٫۷ انچ انگریزی کا ہوتا ہے درحقیقت ہرمِ اعظم کی تعمیر کا پیمانہ وہ تھا جسے ہرمی انچ کہتے ہیں۔ جو انگریزی انچ سے خفیف سا مختلف ہے۔ مگر عملی کاموں کے لئے قریب قریب دونوں برابر ہیں۔ لہذا انگریزی انچوں کے تمام مضروب ہرمی انچوں کے مضروب ہیں یہ امر مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ چونکہ ہرم کے قاعدہ میں چار ضلع ہیں۔ اس لئے ان سب کی مجموعی لمبائی ۳۶۵۲۴ ہرمی انچ ہوتی ہے یعنی تقریباً سو انچ فی یوم۔

مسٹر پیٹری (Petrie) نے یہ بھی دکھایا ہے کہ اگر ۵۸۱۳ ہرمی

انچوں کو انگریزی انچوں کی صورت میں منتقل کیا جائے اور انہیں ۰،۹ ایں ضرب دیکر ان انچوں کے میل بنائے جائیں تو ہمیں کرۂ ارض اور آفتاب کے درمیان کا صحیح فاصلہ معلوم ہو جاتا ہے یعنی تخمیناً نو کروڑ ۲۰ لاکھ میل اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا گیا۔ کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والوں کو یہ بھی علم تھا۔ کہ کرۂ ارض اور ہمارے مرکزی منبع نور کے درمیان صحیح طور پر کتنا فاصلہ ہے۔

اسی قسم کے دیگر واقعات سے جو ہرم اعظم کے بیرونی حصص کی پیمائش پر مبنی ہیں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہرم اعظم کی تعمیر الہامی طور پر ہوئی تھی۔ اور پھر ہرم کے اندرونی راستوں اور خفیہ ایوانوں کی مختلف پیمائشیں کر کے اس خیال کی مزید توثیق کی گئی۔

مسٹر جوزف اے سیس (Joseph A. Seiss) نے اپنی کتاب "معجزہ سنگین" میں بعض اہم پیمائشیں درج کی ہیں مثلاً

اگر ہم ایوان شاہی کی لمبائی ۴۱۲۱۳۲ انچ لیں اور اسے ایک دائرہ کا قطر سمجھیں اور پھر اس دائرہ کا رقبہ نکال کر اس رقبہ کو مربع کی صورت میں منتقل کریں۔ تو اس طرح ہرم اعظم کا صحیح قاعدہ نکل آئے گا۔ اور قاعدہ کے ہر ضلع میں اتنے ہی "ہرمی ہاتھ" ہوں گے جتنے سال بھر میں دن ہوتے ہیں۔

پھر اسی عدد کو کسی مربع کا ایک ضلع فرض کیجیے اور اس مربع کا رقبہ نکالیے بعد ازاں اسی رقبہ کو دائرہ کی صورت میں منتقل کیجیے تو اس دائرہ کا نیم قطر ہو گا۔

اس کی لمبائی اتنے ہی نری ہاتھ" ہوگی جتنی ہرم کی اونچائی ہے علاوہ ازیں اگر ایوان شاہی میں اس کی شمالی یا جنوبی دیوار کے پتھروں کا پورا دور لیا جائے اور اسے ایوان کی لمبائی سے تقسیم کر دیا جائے تو "پائی π" یعنی ۲۲/۷ حاصل ہوگا۔ اور گرانڈ گیلری اور ایوان شاہی کے درمیان جو ایک اور عقبی کمرہ ہے۔ اس کے بھی عرض و طول اور دیگر پیمائشوں میں اسی طرح "پائی" ۲۲/۷ کا استعمال پایا جاتا ہے علاوہ ازیں اگر اس عقبی کمرہ کے فرش کی پوری لمبائی کو اگر ۲۲/۷ سے ضرب دیا جائے تو سال کے پورے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے۔ اس عقبی کمرہ میں جو پتھر کا پردہ ہے۔ اس کو اگر صاف کناروں تک ناپا جائے۔ تو اس کی پیمائش π ۱۰۰۰ یعنی ۲۲/۷ × ۱۰۰۰ نکلتی ہے اسی طرح ملکہ کے ایوان میں جو طاق مشرقی دیوار میں ہے۔ اگر اس کی اونچائی کو ۲۲/۷ × ۱۰ میں ضرب دیا جائے تو ہرم اعظم کے قاعدہ کا ایک ضلع نکل آتا ہے اگر ملکہ کے ایوان کی آخری دیوار کی اونچائی کو دس میں ضرب دیا جائے۔ اور پھر اس کا جذر نکالا جائے اور پھر اسے طاق کی اونچائی سے تقسیم کر دیا جائے تو ۲۲/۷ نکل آتا ہے۔ پھر اگر پہلے سلامی دار راستہ کی لمبائی کو ۲۲/۷ سے تقسیم کیا جائے۔ تو داخلہ کے راستہ کی اس قدر لمبائی نکل آتی ہے۔ جو دہانہ سے لگا کر پہلے چڑھنے والے راستہ تک ہے۔

ہرم اعظم کی تعمیر میں ایک اور بات دیکھنے کے قابل ہے یعنی اس میں سنگین چوکوں کی چھتیسویں منزل کی موٹائی اوپر یا نیچے والی منزلوں کی اونچائی سے

دوگنی ہے اور اسی چھتیسویں منزل کا قاعدہ عقبی کمرہ کی اونچائی سے دس گنا ہے۔
اس عمارت کے عمودی مرکز کا فاصلہ اس بلندی کے دونوں اطراف کے قریب ترین نقطہ تک اگر دس سے تقسیم کیا جائے تو ایک سال کے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے۔ اور اگر اسی فاصلہ کو اس نقطہ کی عمودی بلندی سے تقسیم کیا جائے تو ۲۲/۷ یعنی دائرہ کے محیط اور قطر کی نسبت نکل آتی ہے۔

اسی طرح بڑے صندوق میں بھی وہی ۲۲/۷ موجود ہے۔ صندوق کی اونچائی اور اس کی لمبائی میں وہی نسبت ہے جو ایک اور ۲۲/۷ میں ہے اگر صندوق کی گہرائی کو اس کی ایک لمبی طرف کے رقبہ سے ضرب دیا جائے تو ۲۲/۷ ہوتا ہے

یہی حال ہرم اعظم کے بعض بڑے بڑے اندرونی حصص ایوان شاہی اور صندوق کا ہے۔ ہر چیز کی صورت ایک ہی اصول پر قائم کی گئی ہے یعنی اگر دو بڑی طرفوں کی لمبائی جمع کر کے دیکھا جائے تو وہ مجموعہ تیسری طرف کی لمبائی کا ۲۲/۷ گنا ہوگا۔ مثلاً ہرم اعظم کی لمبائی اور چوڑائی اس کی اونچائی اور ۲۲/۷ کا حاصل ضرب ہے۔ ایوان شاہی کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اس کی اونچائی اور ۲۲/۷ کا حاصل ضرب ہے اور صندوق کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اُس کی اونچائی اور ۲۲/۷ کا حاصل ضرب ہے۔

ہرم اعظم کے حجم اور وزن کے متعلق بھی بہت سے حساب لگائے گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہرم کے اندر ۹۵ لاکھ ہاتھ (مکعب) مسالہ پایا جاتا ہے

رہر ہاتھ کی لمبائی ۲۵ اینچ ہے) ہرم کی تعمیر میں مختلف قسم کا مسالہ اور سامان صرف ہوا ہے۔ جن کا نسبتی وزن مختلف ہے۔ بہر حال ان جملہ امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اندازاً حساب لگایا گیا ہے کہ ہرم اعظم کا کل وزن ۵۲۷۳۸۵۴ ٹن ہے (ایک ٹن ۲۸ من کے قریب ہوتا ہے)

ہرم کے اندر کا ٹمپریچر کم و بیش یکساں قائم رہتا ہے۔ اور بیرونی ہوا کے ٹمپریچر سے بہت زیادہ کم ہے۔ مگر باینہمہ ہرم کے اندر سخت گرمی ہوتی ہے۔ مسٹر ایل۔ ڈاد کرینگٹن نے ایک روشندان کی سرنگ کو جو ایوانِ شاہی سے نکلی ہے صاف کرایا تھا۔ اس سے ہرم کا ٹمپریچر مستقل طور پر کئی درجہ کم ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق مصر کے عربوں میں یہ روایت ہے کہ اگر دوسرا روشندان بھی اسی طرح صاف کر دیا جائے تو ہوا کی آمد و رفت سے رباب جیسا نغمہ پیدا ہونے لگے گا۔ اور اندرونی ٹمپریچر اور بھی زیادہ سرد ہو جائے گا لیکن تا وقتیکہ روشندان کی سرنگ صاف نہ ہو اس قول کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔

تعمیرِ ہرم کی وجہ یا غرض

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہرم اعظم کیوں تعمیر کیا گیا تھا؟ کیا یہ عظیم الشان تعمیر محض ایک مقبرہ تھی؟ اگر یہی مقصد تھا۔ تو پھر اس کے اندر یہ گرانڈ گیلری اور دیگر راستے اور ایوان کیوں بنائے گئے؟ کیا ان کا کوئی اور مقصد تھا؟ اگر تھا تو وہ کیا تھا؟ ان سوالات کے لوگوں نے مختلف جوابات دئے

ہیں جن کا مختصر خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اہرام اعظم کی تعمیر کے بارہ میں جو مختلف نظریئے پرانے زمانہ میں قائم کئے گئے تھے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

(۱) اہرام مصر کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ ریگستان کی طرف سے جو ریت اُڑ کر آئے اس کو روکا جائے تاکہ قاہرہ اور رود نیل کی دوسری بستیاں محفوظ رہیں۔

(۲) ان کی تعمیر اس غرض سے ہوئی تھی کہ اس زمانہ کے علما دین کی جو پُر اسرار تعلیم تھی۔ وہ محفوظ رہے اور اگر دوسرا طوفان نوح آئے تو غرقاب نہ ہو۔

(۳) اہرام کی تعمیر کا مقصد یہ تھا۔ کہ ان کے اندر عمدہ فصلوں میں غلہ بھر لیا جائے تاکہ خشک سالی میں کام آئے۔

(۴) اہرام کی تعمیر کا مقصد یہ تھا۔ کہ فراعنہ مصر کی شوکت و عظمت اور قدیم مصر کے علم و ہنر کی نمائش کی جائے۔

(۵) تعمیر اہرام کی غرض و غایت یہ تھی۔ کہ انہیں مصری اوزان اور پیمانوں کا معیار بنایا جائے۔

(۶) ان عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر بذریعہ الہام ہوئی تھی۔ اور ان کی تعمیر سے اہل مصر کی زبردست روحانی قوتوں کا اظہار مقصود تھا۔

بہر حال ایک مقصد تو اہرام کی تعمیر کا ضرور ظاہر ہے۔ یعنی یہ کہ وہ شاہی مقبرے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایوانِ شاہی میں ایک تابوت موجود ہے گو اس کے

اندر سے لاش اور اس کے اوپر کا ڈھکنا غائب ہیں۔ ملک خوفو فرعون مصر کا مقصد یہ تھا۔ کہ اس کی لاش ان پتھروں کے عظیم الشان حجرہ میں ہمیشہ تک محفوظ رہے اس لئے اس نے اپنی عظمت و جلالت کے مطابق یہ عظیم الشان مقبرہ تیار کرایا تھا۔ جس ہوشیاری اور سلیقہ کے ساتھ ہرم میں داخل ہونے کے مختلف راستے مخفی رکھے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاش اور ان خزائن کو جو اس کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ پوری طرح محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ حال ہی میں مقبرہ توت انخ آمن فرعون مصر کے مقبرہ سے جس قدر بیش بہا خزائن برآمد ہوئے ہیں ان سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر کی لاش کے ساتھ کس قدر خزائن مقبرہ میں رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خزائن یقیناً ایوان شاہی اور عقبی کمرہ میں محفوظ کر کے ہرم میں داخل ہونے کے تمام راستے پوشیدہ اور سر بمہر کئے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ملکہ کے ایوان میں بھی خزائن ہوں مگر افسوس ہے کہ وہ بیش بہا خزائن قبطی ڈاکوؤں یا عرب چوروں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہے۔ الغرض یہ تو ثابت ہے کہ تعمیر ہرم کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ کہ وہ مقبرہ شاہی کا کام دے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو اٹھائیس فٹ اونچی عظیم الشان گیلری بنی ہوئی ہے اس کا مقصد کیا تھا؟

اس کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ مقبرہ کے علاوہ ہرم اعظم کی تعمیر کا مقصد یہ بھی تھا۔ کہ اسے ایک عظیم الشان رصدگاہ بنایا جائے۔ اور اس

گرانڈ گیلری کا مقصد مشاہدہ فلکیات تھا۔ یہ گویا ہماری عظیم الجثہ دوربینوں کی طرح ٹھوس پتھروں سے بنائی ہوئی ایک دوربین تھی۔ جس میں شیشے (Lenses) نہیں تھے۔ الغرض ایوان شاہی کی حد تک ہرم اعظم کی تعمیر اسی نظریہ پر ہوئی تھی۔ ایوان شاہی گرانڈ گیلری پر واقع ہے۔ اس کے بعد ملک خوفو فرعون مصر کی وفات تک تعمیر کا کام بند کر دیا گیا۔ اور اس کے اوپر کی سطح ایک ہموار میز کی طرح رہ گئی۔ بعد ازاں جب فرعون خوفو کا انتقال ہو گیا تو ایوان شاہی میں اس کی لاش رکھ کر ہرم اعظم کے بالائی حصے کی تکمیل کر دی گئی۔ اس خیال کے اثبات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔

نظریہ رصدگاہ کے اثبات میں شہادتیں | ہرم اعظم خط عرض البلد شمالی درجہ ۳۰ کے بہت قریب تعمیر کیا گیا ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس عرض البلد پر جہاں سے آسمان کا صحیح قطب خط افق سے نقطہ سمت الراس تک کل فاصلہ کے ایک ثلث پر واقع ہے۔ یعنی جہاں ٹھیک فصل بہار یا فصل خزاں کے زمانہ میں آفتاب نصف النہار اس فاصلہ سے دو تہائی دوری پر ہوتا ہے جو خط افق اور نقطہ سمت الراس کے درمیان ہے ایسے رصدخانہ میں جس کا ٹھیک محل وقوع یہ ہو بعض حسابات اور اقلیدسی اشکال جن کی مسائل فلکیات میں ضرورت پڑتی ہے۔ بہت زیادہ آسان ہو جاتے ہیں نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد اس امر کی تصدیق کی جا چکی ہے۔ کہ ہرم اعظم اس مقام سے جو صحیح طور پر منتخب

کیا جاتا صرف چند گز ہٹ کر تعمیر کیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان زمانہ کے لوگوں کے آلات پیمائش اور طریقہ زیادہ صحیح نہ تھے۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کے لئے صرف ایک خاص ستارہ منتخب کیا ہوگا یعنی قطب ستارہ عمارت کا محل وقوع منتخب کرنے کے بعد اس کی وضع قطع کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہرم اعظم کے چاروں رخ صحیح شمال، صحیح جنوب، صحیح مشرق اور صحیح مغرب کی طرف واقع ہیں۔ اس قدر صحت حاصل کرنے کے لئے ٹھوس چٹان میں ایک لمبی اور سلامی دار سرنگ کھود کر قاعدہ ہرم کا بنیادی خط قائم کیا گیا ہوگا۔ چنانچہ ابھی سرنگ موجود ہے۔ جو زمین دوز کمرہ کے اندر اترتی ہے، جب اس طرح پوری صحت کے ساتھ سمت شمال معلوم کر لی گئی تو عمارت کی وضع قطع اور تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ اور یہ صحت صرف علم نجوم کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہوگی۔ بعد ازاں سنگین منزلیں نہایت صحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعمیر ہونا شروع ہوئیں۔ "گرانڈ گیلری" کا نقشہ تیار ہو کر وہ تعمیر کی گئی۔ اول اول ہرم اعظم صرف اس قدر تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں تک ایوان شاہی موجود ہے۔ اب آئندہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس گرانڈ گیلری کا کیا راز ہے

گرانڈ گیلری کا راز | اس کے متعلق مشہور ماہر فلکیات رچارڈ اے پراکٹر تحریر فرماتے ہیں "یہ امر یقینی ہے کہ جن لوگوں کو دوربین کا کوئی علم حاصل نہ تھا۔ اور جو ہمارے زمانہ کے ماہرین فلکیات کی طرح صحت کے ساتھ سمتیں

معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس مقصد کیلئے یہی طریقہ رکھا ہوگا۔ جو ہرم اعظم کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے ٹھوس چٹانوں میں طویل راستے نکالے اور جہاں ضرورت ہوئی معمولی انحراف شعاع کے ذریعہ سے خط نظر بدل دیا۔ . . . . . اس خیال کی اسوقت اور بھی زیادہ وضاحت ہوگی۔ جب ہم گرانڈ گیلری کے معاملہ پر غور کریں گے۔ کیونکہ ایک ماہر فلکیات کے نزدیک اس تعمیر کا سب سے زیادہ ہیئتی (Astronomical) حصہ یہی ہے۔ آپ اس مسئلہ پر کسی قدر غور فرمائیں کہ ہیئت دان جو ایک ہی وقت میں ماہر تعمیرات بھی ہو وہ اس شگاف یا سرنگ سلامی دار کو کیا شکل دیتا جس میں سے وہ اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھ سکتا۔ ہیئت داں کی حیثیت سے تو وہ ایک بہت بلند مگر تنگ مقام پر بیٹھنا پسند کرتا۔ مگر بحیثیت ایک ماہر تعمیرات کے وہ جانتا۔ کہ وہ مقام بالکل عمودی نہیں ہو سکتا۔ گرانڈ گیلری کے عمودی سکشن یا کٹاؤ کی صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والے میں ہیئت دانی اور فن تعمیر سے کمال آگاہی دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ دیوار کا ہر حصۂ قطعی عمودی ہے باینہمہ دیواریں بہ ہیئت مجموعی سلامی دار ہیں اگر ہم شروع ہی سے اس ہرم اعظم کا ہیئتی نقشہ نہ دیکھ پاتے اور ہم کو یہ معلوم نہ ہوتا۔ کہ اس قسم کے نقشہ کا تعلق علم ہیئت سے ہے۔ تو بھی ہم کو اس گرانڈ گیلری کی دوہری نوعیت سے صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ مشاہدات فلکی کے لئے

تعمیر کی گئی ہے۔ اور صرف ایک ہیئت داں کسی ماہر تعمیرات کے سامنے ایسا مسئلہ پیش کر سکتا تھا۔" اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ گرانڈ گیلری مشاہدات فلکی کے لئے تعمیر کی گئی تھی۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر سلامی دار گیلری میں جس کا فرش اس قدر چکنا اور جھکا ہوا ہے۔ لوگ کس طرح بیٹھ کر مشاہدات فلکی کرتے ہوں گے؟ اس کا جواب وہ سنگین کنارے دے سکتے ہیں جو گیلری کے دونوں طرف بہت دور تک سلامی دار چلے گئے ہیں یہ کنارے سلامی دار فرش سے مناسب بلندی پر واقع ہیں اور اگر ان پر مضبوط چوبی تختے رکھ دئے جائیں تو ان تختوں پر بہت سے آدمی ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ کر مشاہدات فلکی کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کی غلطیاں بھی معلوم کی جا سکتی ہیں اس طرح ایک ہی وقت میں آدمی فلکیات کے متعلق آلات سے مسلح ہو کر مشاہدات فلکی کر سکتے ہیں۔

الغرض اس عظیم الشان رصد گاہ میں اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھی جا سکتی تھی اور علم ہیئت کے متعلق صحیح نتائج اخذ کئے جا سکتے تھے رصدگاہ کا نظریہ ہم اس لئے صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ ہرم اعظم کے تمام مخفیہ راستوں اور گرانڈ گیلری کی جملہ تفصیلات کی تطبیق اسی نظریہ سے ہوتی ہے اور اگر یہ نظریہ تسلیم نہ کیا جائے تو بہت سی باتوں کی صحیح توجیہ و تاویل نہیں کی جا سکتی۔ لہذا ہرم اعظم کی تعمیر کا اول حصہ تو رصد خانہ تھا۔ مگر بعد کو جب ملک خفو

کا انتقال ہو گیا۔ تو اسی میں اس کا مقبرہ بھی بنا دیا گیا۔

علم احکام النجوم کا اثر اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر کو مشاہدات فلکی سے ایسی کیا دلچسپی تھی۔ جو یہ رصد خانہ تعمیر کیا گیا؛ اس کا ایک معقول جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی آج کل کی طرح علم احکام النجوم یا جوتش پر زبردست عقیدہ رکھتے تھے۔ اس زمانہ کے جوتشیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ نہ صرف اجرام سماوی کی نقل و حرکت کا مطلب سمجھتے ہیں بلکہ جو کچھ اثر ستاروں کی گردش کا حیات انسانی پر پڑتا ہے۔ اس سے بھی واقف ہیں۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ نہیں تھا۔ کہ وہ واقعی اجرام سماوی پر حکومت رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ یہ کہتے تھے۔ کہ ستاروں کی چال دیکھ کر وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کا حیات انسانی پر کیا نیک و بد اثر پڑے گا۔ اور بد اثر سے کیونکر بچ سکتے ہیں۔ ان کا یہ محض دعویٰ ہی نہیں تھا۔ بلکہ زمانہ حال کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی طرح وہ اس عقیدہ پر ایمان بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ملک خوفو فرعون مصر کا اعتقاد تھا۔ کہ وہ اس رصد خانہ کے ذریعہ سے اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھ کر مستقبل کے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ اور یہ بھی جان سکتا ہے کہ دشمنوں پر کیونکر فتح حاصل ہو اس لئے اس نے یہ عظیم الشان رصد خانہ تعمیر کرایا تاکہ اس کی سلطنت کے معاملات احکام سماوی کے مطابق انجام پذیر ہوں۔

دیگر اہرام اس وقت مصر میں کم از کم چھتیس ہرم اور بھی موجود ہیں لیکن

ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے اندر اہرم اعظم کی طرح راستے، خفیہ ایوان، اور گیلریاں وغیرہ ہوں۔ اور نہ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی دلچسپی یا قدیم روایت متعلق ہے۔ انہیں معمولی مگر عظیم الشان مقبرہ سمجھنا چاہیئے۔ ان کے متعلق کوئی ثبوت ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کر ان کی تعمیر کا مقصد مقبرے کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔

(نگار مارچ ۱۹۳۳ء)

Sm ikh

قانون تجاذب

کیپلر کے اصول ثلاثہ (اور) نیوٹن کا نظریہ کشش اجرام

یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ جب وہ پتھر کے ٹکڑے کو اوپر سے چھوڑتا ہے تو وہ سیدھا زمین پر گر جاتا ہے، اور اس واقعہ سے اسے کوئی حیرت بھی نہیں ہوتی لیکن ہمارے سامنے مقناطیس کے ذریعہ کوئی لوہے کا ٹکڑا کھینچ لیا جائے یعنی اگر کوئی آہنی چیز کسی پارہ مقناطیس سے آکر متصل ہو جائے۔ تو ہم اس کو نگاہ تعجب سے دیکھیں گے، درآنحالیکہ وہ قانون قدرت جو ایک ذرنی چیز کو زمین کی طرف منجذب کر دیتا ہے اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر کشش مقناطیس کے اصول۔

جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح زمین بھی

تمام اشیار کو اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ مقناطیس کا یہ عمل بہت محدود اشیار پر ہوتا ہے، اور زمین کی کشش بہت عام اور عالمگیر ہے تم اپنے ہاتھ میں سیسے کا ایک چھوٹا ٹکڑا لو اور زمین کی طرف چھوڑ دو تو سب سے پہلے تم یہ محسوس کروگے کہ سیسے کے ٹکڑے کو زمین تک پونچنے میں کچھ وقت صرف ہوا۔

اب تم دوسرے ہاتھ میں اس ٹکڑے سے زیادہ وزنی ٹکڑا لو اور ان دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دو تو دونوں زمین پر ساتھ ہی ساتھ گریں گے۔ حالانکہ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ زیادہ وزنی چیز زیادہ سرعت کے ساتھ زمین کی طرف آئے گی، اور ہلکی چیز کم سرعت کے ساتھ، لیکن یہ غلط ہے اور تم ہر وقت تجربہ کر سکتے ہو کہ جب دو مختلف وزن کی چیزوں کو ایک ساتھ چھوڑا جائے گا۔ تو وہ ساتھ ہی ساتھ زمین پر گریں گی، یہاں تک کہ اگر تم ایک ہاتھ میں بوتل کا کاگ لو۔ جو بہت ہلکا ہوتا ہے، اور دوسرے ہاتھ میں سنگ مرمر کا ٹکڑا اور دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دو تو یہ زمین تک ایک ہی ساتھ پہونچیں گے۔

البتہ اگر تم ایک ہاتھ میں پر لوگے اور دوسرے ہاتھ میں لوہے کا ٹکڑا تو پر کو زمین تک پہنچنے میں زیادہ دیر لگے گی، لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پر کو ہوا آسانی کے ساتھ روک سکتی ہے۔ اور وہ ہوا میں تیرتا ہوا زمین کی طرف آتا ہے، برخلاف ایک وزنی چیز کے کہ ہوا اس کے روکنے میں کامیاب نہیں

ہوتی، اور وہ دفعتہً زمین پر آجاتی ہے، لیکن اگر تم اس پر کو پیسہ کے اوپر رکھو اور پھر پیسہ کو ترچھا کر کے چھوڑ دو تو پر بھی ساتھ ہی ساتھ زمین پر آئے گا کیونکہ اس صورت میں پیسہ کا وزن یا ثقل نے پر کے لئے راستہ صاف کر دیا اور ہوا اس کی مزاحم نہیں ہوئی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ ایک چیز کا ہلکا یا بھاری ہونا غیر معتبر ہے۔ اور ایک متعین بلندی سے جب مختلف اوزان کی چیزیں زمین کی طرف چھوڑی جائیں گی۔ تو وہ ایک ہی ساتھ اور ایک ہی وقت میں زمین پر گر پڑیں گی۔

مختلف طریقوں سے اس کا تجربہ کیا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ اوپر سے نیچے تک آنے میں ایک چیز فی سکنڈ ۱۶ فٹ کا فاصلہ طے کرتی ہے، یہاں تک کہ ایک بوتل کا کاگ اور اس سے بھی زیادہ ہلکی چیز ۱۶ فٹ کی بلندی سے صرف ایک سکنڈ میں زمین تک پہنچ جائے گی۔ یہ اصول اس قدر عام اور مستحکم ہے کہ دنیا کے جس حصہ میں یہ عمل کریں گے نتیجہ ایک نکلے گا، البتہ مختلف مقامات پر تجربہ کرنے سے خفیف سا فرق ضرور محسوس ہوگا۔ لیکن اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں، اور جو کشش ثقل کے اس اصول پر موثر نہیں ہوتے۔

اب اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ سطح زمین سے اوپر بلندی میں کس حد تک یہ حقیقت باقی رہتی ہے۔ اس غرض کے لئے اگر کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ایک وزن کو نیچے تک آنے

میں بہ نسبت سطح زمین کے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے ہر چند یہ فرق بہت کم ہوگا۔ تاہم اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم اور بلندی پر چڑھ جائیں تو یہ قانون تجاذب پایا تو وہاں بھی جائے گا، لیکن بعد زمین کے ساتھ ساتھ اس میں کمی ضرور ہوتی جائے گی۔

ہم غبارہ میں بیٹھ کر پانچ چھ میل سے زیادہ بلند نہیں جا سکتے لیکن فرض کرو کہ ایک شخص ڈھائی لاکھ میل زمین سے بلند ہو جائے اور وہاں سے کسی وزنی چیز کو نیچے کی طرف چھوڑے۔ تو وہ اول نظر میں محسوس کریگا۔ کہ وہ چیز معلق ہو کر ایک جگہ قائم ہو گئی ہے۔ اور نیوٹن کا یہ نظریہ کہ قانون تجاذب اس قدر بلندی پر بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ غلط ثابت ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ مگر تھوڑی دیر میں معلوم ہو گا کہ وہ چیز نہایت آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جا رہی ہے، اور جس قدر نیچے ہوتی جاتی ہے، اس کی سرعت رفتار بڑھتی جاتی ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ڈھائی لاکھ میل کی بلندی سے یہ تجربہ کرنا ناممکن ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ واقعی وہاں قانون تجاذب پایا جاتا ہے یا نہیں لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اتنی ہی دور اس کا تجربہ غلط ہو رہا ہے اور ایک چیز اتنی ہی دور سے زمین کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہے۔ اور وہ چیز چاند ہے۔ پھر چونکہ ہم اس کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ چاند زمین کی طرف کس رفتار سے جذب ہو رہا ہے۔ اس لئے ہم زمین کی قوت کشش کو

بھی اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں، یہی تھی۔ وہ حقیقت جس نے نیوٹن کو بتا دیا کہ اگر کوئی چیز دو لاکھ اتنالیس ہزار میل کی بلندی سے بھی (جو بلندی چاند کی ہے)، چھوڑی جائے گی تو زمین اسے اپنی طرف کھینچ لے گی۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ زمین کی قوت کشش فاصلہ کے لحاظ سے کس قدر کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ماہرین ہیئت نے متعدد تجربے کیئے اور آخر کار اس نتیجہ پر پونچے کہ زمین سے اوپر ہم جسقدر بلند ہوتے جائیں گے۔ اسی نسبت سے ریاضی کے ایک متعین اصول کے ماتحت وزن بھی کم ہوتا جائیگا جو عبارت ہے۔ زمین کے جذب مرکزی سے اس کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اگر کوئی چیز چار پونڈ وزن کی مرکز زمین سے چار ہزار میل بلند پہنچ جائے گی۔ تو اس کا وزن صرف ایک پونڈ رہ جائیگا۔

اس تجربہ کے ماتحت جب ریاضی سے مدد لی گئی تو حسب ذیل اصول قرار پائے۔

وزن ÷ {فاصلہ + نصف قطر زمین ÷ $\frac{1}{2}$ قطر زمین}۲

یعنی جو فاصلہ مرکز زمین سے اس چیز تک ہے، اس کو نصف قطر زمین سے تقسیم کرنے کے بعد جو خارج قسمت حاصل ہو اور پھر اس کے مربع سے وزن کو تقسیم کیا جائے تو جو نتیجہ حاصل ہوگا وہی وزن ایک جزء ہوگا۔ چنانچہ اس پر قیاس کر کے ہم معلوم کر سکتے ہیں، کہ اگر یہی چار پونڈ کی چیز آٹھ ہزار میل تک

پونچادی جائے گی تو اس کا وزن صرف ۴/۹ پونڈ رہ جائے گا۔ اور اگر چاند کی سطح تک پہونچ جائے گی جو تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار میل مرکز زمین سے ہے، تو اس کا وزن صرف ۱/۶ پونڈ رہ جائے گا۔

یہ ایک نہایت عام فہم اور معمولی صورت جذب زمین کے سمجھنے کی ہے، ورنہ حقیقتاً یہ مسئلہ بہت مشکل ہے علی الخصوص اس وقت جب کہ تجاذب کے اصول تمام اجرام فلکی سے وابستہ ہیں اور فضا کے بسیط میں پھیلی ہوئی تمام کرے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔

یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ زمین چاند کو اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ چاند کیوں نہیں زمین پر ٹوٹ پڑتا اور زمین کیوں نہیں سورج سے ٹکرا جاتی اسی طرح اگر اور تمام اجرام فلکی ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہوں تو کیوں ان میں باہم تصادم نہیں ہو جاتا لیکن یہ ادنیٰ تامل معلوم ہو سکتا ہے، کہ اگر تمام اجرام سماوی ساکن ہوتے تو باہم تصادم ہو جاتا، مگر چونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے محور پر نہایت سرعت کے ساتھ گردش کر رہا ہے یعنی خود اس کے اجزاء اپنے مرکب کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اس لئے دوسرے اجرام کی کشش کی مدافعت ہوتی رہتی ہے۔

ذیل کی صورت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔



اگر ایک توپ معمولی قوت کیساتھ مقام (الف) سے جو پہاڑ کی چوٹی ہے (ب) کی طرف سر کی جائے تو گولہ فوراً ایک خمیدہ راستہ اختیار کر کے (د) کے اوپر اوپر گرے گا۔ اگر زیادہ قوت سے کام لیا جائیگا تو وہ آگے بڑھ کر مقام (ہ) پر گرے گا۔ لیکن اگر کوئی نہایت قوی توپ بنائی جائے۔ جو فی سیکنڈ دس پندرہ میل کی رفتار سے گولے کو پھینک سکے۔ تو وہ الف ب ج کا راستہ اختیار کرے گا۔ اور اس کی سطح رفتار زمین سے بھی اسی قدر بلند ہے۔ جتنی سر ہونے کیوقت قائم ہوئی تھی۔ جب گولہ نقطہ ج پر پہنچے گا۔ تو اس کی رفتار وہی قائم رہے ہے اور وہ دائرہ زمین کے دوسرے تیسرے اور چوتھے ربع کو طے کر کے آخر کار اسی نقطہ پر پہنچ جائے گا۔ جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اگر پہاڑ

کی چوٹی جہاں سے گولہ روانہ ہوا تھا۔ محو کر دی جائے تو بھی وہ برابر معلق حالت میں گردش کرتا رہے گا۔

اب خیال کو اور زیادہ وسیع کرو اور سمجھو کہ اگر ایک توپ اتنی بڑی بنائی جائے جو دو ہزار میل قطر کے گولے کو تین ہزار فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے پھینک سکے اور دس لاکھ میل سطح زمین سے بلند کسی مقام سے سر کیا جائے تو یہ گولا نکل کر صرف چار ہفتے میں ساری زمین کا چکر لگا سکے گا۔ اور پھر ہمیشہ اسی طرح گھومتا رہے گا۔

ایک شخص اس کو صرف وہم و گمان خیال کرے گا لیکن یہ واقعہ ہے۔ کہ ایک گولہ اتنا ہی بڑا زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے جسے چاند کہتے ہیں، پھر جس طرح زمین چاند کے گرد چکر لگا رہا ہے، اسی طرح زمین آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے اور اجرام فلکی کا باہمی تجاذب تصادم سے محفوظ رکھتا ہے، اس میں شک نہیں کہ اگر آج زمین ساکن ہو جائے۔ یا چاند سے اس کی گردش سلب ہو جائے تو چاند زمین سے اور زمین آفتاب سے متصادم ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائیں، اسی طرح اگر اور اجرام فلکی اپنی گردش ترک کر دیں تو وہ بھی آپس میں ٹکرا جائیں اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اصل چیز جو باعث کشش ہے اور جو منجذب ہونے کے ساتھ ہی قوت مدافعت بھی اپنے اندر رکھتی ہے، وہ اجرام فلکی کی گردش ہے، اس لئے ہم بتانا چاہتے ہیں کہ گردش کا مفہوم کیا ہے۔

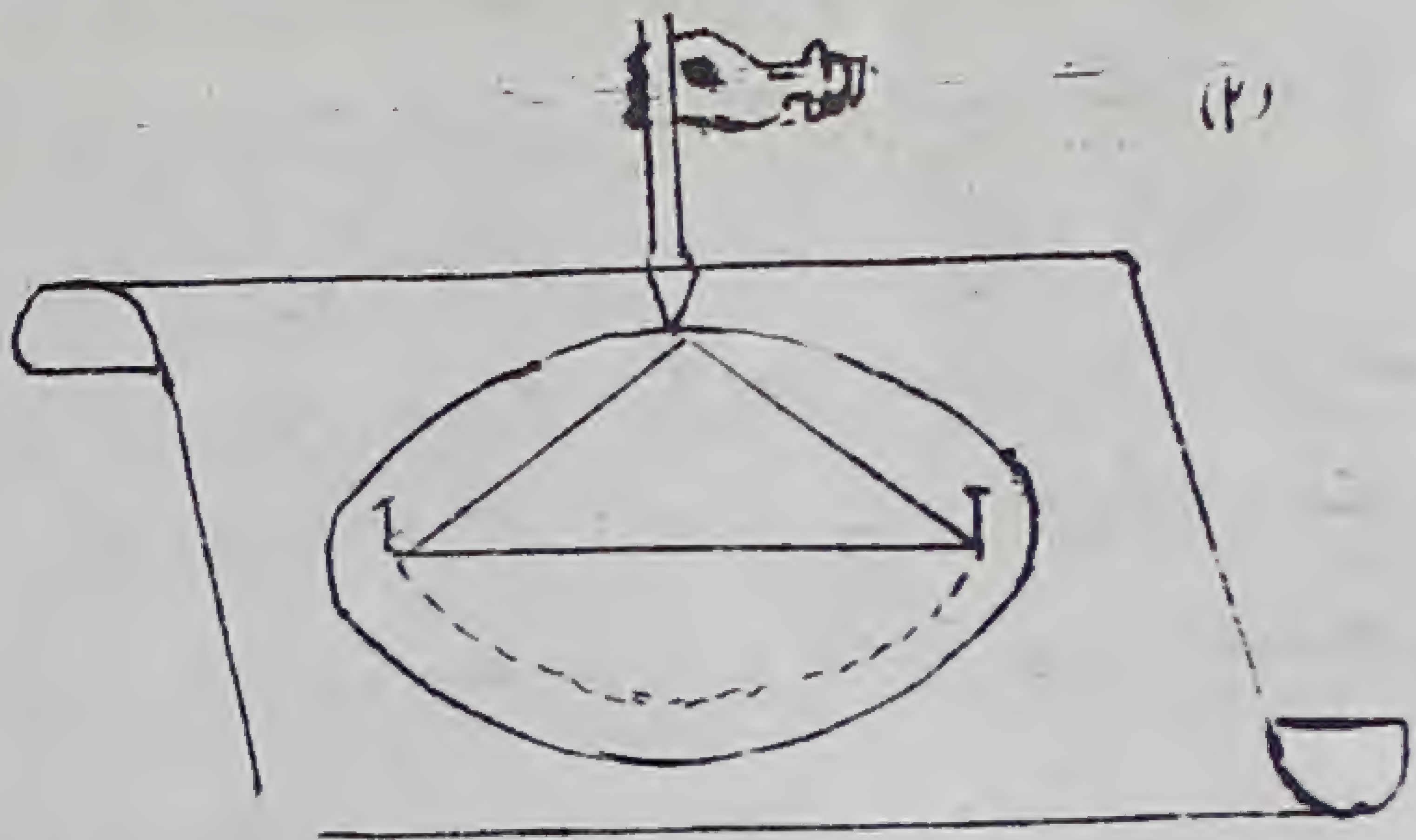
گردش دو قسم کی ہوتی ہے ایک گردش محوری کہلاتی ہے، اور دوسری گردش
دوری، گردش محوری سے تو کوئی کرہ خالی نہیں ہے۔ ورنہ وہ قائم نہیں رہ سکتا۔
البتہ گردش دوری انہیں اجرام میں ہے جنہیں ہم سیارہ کہتے ہیں۔ اور جو
ہمارے نظام شمسی میں علاوہ اقمار اور دمدار ستاروں کے اس وقت تک صرف
نو دریافت ہوئے ہیں ہم ان سیاروں کی گردش سے یہاں بحث کرنا نہیں چاہتے
کہ اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، البتہ اصول تجاذب کے
سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے، کہ ان سیاروں کی گردش دوری (Revolution)
کس صورت سے ہوتی ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے گرد سیاروں کی گردش بالکل دائرہ کی
صورت میں ہوتی ہو گی اور اس سے قبل یہی یقین کیا جاتا تھا، لیکن سب سے
پہلے کپلر نے اس کی تردید کی، اور دنیائے ہیئت میں اپنے انکشاف سے بڑا
زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ سیاروں کی گردش دائروں کی طرح ہوتی ہے لیکن ان
سے مکمل دائرہ نہیں بنتا، بلکہ بیلبی کی شکل کا ایک دائرہ بنتا ہے جسے انگریزی
میں الپٹیکل (Elliptical) اور عربی میں اہلیلجی کہتے ہیں۔

کاغذ کے ایک تختہ پر کچھ فصل سے الگ الگ دو آلپین گاڑ دو اور موٹے
تاگے کا ایک حلقہ ان کے گرد ڈالو۔ اس کے بعد پنسل یا قلم کی نوک سے تاگے

کو تان کر آلپینوں کے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچو تو تو ہلیلجی شکل بن جائیگی



پھر جس طرح ایک دائرہ چھوٹا بڑا بن سکتا ہے، اسی طرح آلپینوں کے قرب و بعد و تاگے کو چھوٹا بڑا کرنے سے مختلف ناپ کے ہلیلجی دائرے بن جائیں گے ریاضی کے نقطہ نظر سے ان دونوں مقامات جہاں آلپنیں نصب کی گئی تھیں فوسائی (تصحح) عربی میں محترقین کہتے ہیں اور انہیں دونوں نقطوں میں سے کسی جگہ آفتاب کا ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ اسی اصول کے بنا پر کیپلر نے پہلا قاعدہ یہ مقرر کیا کہ :-

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اہلیجی دائرہ بناتا ہے، اور آفتاب کا دونوں محترقین میں سے کسی ایک محترق پر ہونا ضروری ہے۔

جب یہ متعارف ہو گیا کہ تمام سیارے آفتاب کے گرد دائرہ اہلیجی

بناتے ہیں تو اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنی گردش کس طرح پوری کرتے ہیں یہ ظاہر ہے کہ ہر سیارہ ایک مدت معنیہ کے اندر اپنی گردش دوری پوری کر لیتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ وہ ایک رفتار سے چلتا ہے درست نہیں مثلاً زمین ۳۶۵ $\frac{1}{4}$ دن میں آفتاب کے گرد اپنی گردش پوری کر لیتی ہے لیکن یہ سمجھنا کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ ۱۸ میل فی سکنڈ کی رفتار سے گذرتی ہوگی غلط ہے،

اگر گردش بالکل دائرہ کی شکل میں ہوتی تو سیارہ کی رفتار یقیناً ہر وقت ایک ہی رہتی کیونکہ آفتاب عین مرکز پر واقع ہوتا۔ اور اس کی کشش محیط یعنی دائرے کے ہر نقطہ پر یکساں ہوتی لیکن چونکہ سیارے اہلیجی دوائر بناتے ہیں اور آفتاب محیط سے دور و نزدیک ہوتا رہتا ہے، اس لئے اسی لحاظ سے سیارہ کی رفتار بھی سریع و بطی ہوتی رہتی ہے۔

(۳)

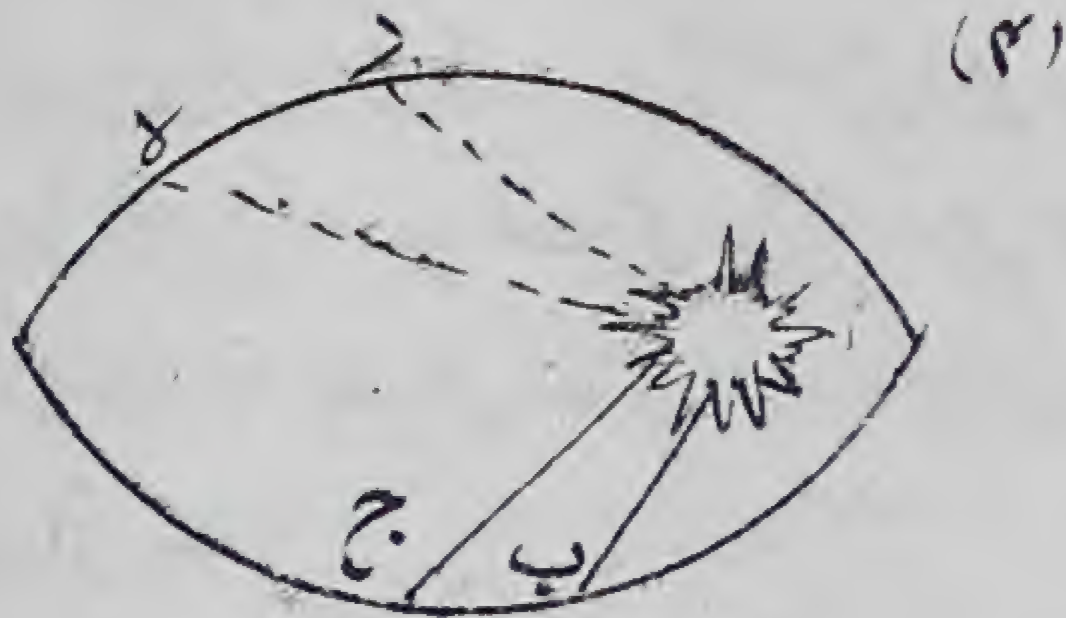


اس شکل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہلیجی دائرہ بنانے کی صورت میں سیارہ ایک جگہ آفتاب سے بہت قریب ہو کر گذرتا ہے، ایک جگہ بعید ہو کر اور دو

نقطے ایسے ہیں جنہیں ہم بعد اوسط کہہ سکتے ہیں۔

پھر چونکہ آفتاب کے بعد و قرب کو گردش میں بڑا دخل ہے، اس لئے ظاہر ہے بعد البعد میں سیارے کی رفتار بہت کم بعد اوسط میں متوسط اور بعد اقرب میں بہت زیادہ ہوگی یہ مسئلہ ریاضی کی مدد سے بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

(۴)



شکل مذکور بالا میں ایک سیارہ کی گردش اہلیلجی دکھائی گئی ہے جس میں الف مقام آفتاب ہے، محیط میں سے ب ج اور د ہ دو قوس لے لئے گئے اور ان سے مرکز آفتاب تک ایک خط کھینچ دیا گیا۔ فرض کرو کہ ا ب ج کا رقبہ ا د ہ کے برابر ہے تو ایک سیارہ دونوں فاصلوں کو ایک ہی وقت میں طے کرے گا، لیکن ظاہر کہ قوس ب ج جو قریب آفتاب کے ہے قوس د ہ سے بڑا ہے اس لئے کیپلر کا دوسرا قاعدہ یہ قرار پایا کہ۔

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اس طرح حرکت کرتا ہے کہ اگر اس سے ایک خط مستقیم آفتاب تک کھینچا جائے تو وہ خط برابر اوقات میں برابر رقبوں سے گذریگا

ان دونوں قاعدوں کیساتھ کیپلر نے ایک تیسرا قاعدہ اور قائم کیا جس سے دو مختلف سیاروں کی گردش کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے سمجھنے سے قبل یہ معلوم کرلینا چاہیئے۔ کہ بعد اوسط کسے کہتے ہیں یہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ اہلیلجی گردش میں سیارے کا فصل گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اسی جگہ شکل نمبر ۳ میں بعد اوسط کی جگہ بھی تبادی گئی ہے۔ یعنی وہ بعد جو مدار کے تمام مختلف فاصلوں کا اوسط ہو بعد اوسط اور بعد اقرب کو جمع کرکے نصف کر دینے سے بعد اوسط معلوم ہوتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ ہر سیارہ ایک مدت معینہ کے اندر اپنی گردش پوری کرلیتا ہے

جب یہ دونوں باتیں ذہن نشین ہو جائیں گی تو کیپلر کا تیسرا قاعدہ سمجھ میں آجائیگا۔ جس کے ذریعہ سے مختلف سیاروں کے بعد اوسط اور مدت گردش کی نسبت باہمی معلوم ہوسکتی ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ:۔

دو سیاروں کی مدت گردش کا مربع انکے ابعاد اوسط کے کعب کی نسبت سے ہوتا ہے۔

چونکہ کیپلر کو معلوم تھا کہ ہر سیارہ کی مدت گردش مختلف ہے، اور اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی آگاہ تھا کہ جس قدر بعد اوسط زیادہ ہوگا اسی قدر مدت گردش زیادہ ہوگی۔ اس لئے اس نے یہ نسبت سمجھ لی، اس نے یہ نہیں کہا کہ مدت گردش بعد اوسط کے نسبت سے ہوگی، کیونکہ اس صورت میں اگر کسی سیارے کا بعد اوسط دو چند ہوتا تو مدت گردش بھی دو چند قرار پاتی، حالانکہ بعض دور کے سیارے ایسے ہیں، جو سہ چند مدت میں اپنی گردش پوری کرنے میں ذیل کی مثال سے یہ قاعدہ اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا۔

فرض کرو کہ زمین کا بعد اوسط ایک ہے اور مدت گردش ۳۶۵٫۱۲ اسی طرح زہرہ کا بعد اوسط ۰٫۷۲۳ اور مدت گردش ۲۲۴٫۷ ہے، اس لئے ۳۶۵٫۲ کے مربع ۲۲۴٫۷ کے مربع میں وہی نسبت ہوگی جو ان دونوں کے ابعاد اوسط کے کعب میں ہے۔

اگر زہرہ کی مدت گردش نہ معلوم ہوتی یا اس کا بعد اوسط غیر معلوم ہوتا۔ تو بھی وہ دریافت ہو سکتا تھا اور اسی طرح ہر سیارہ کی مدت گردش اور اس کا بعد اوسط معلوم کیا جا سکتا ہے۔

یہ تھے کیپلر کے وہ تین اصول جنہوں نے نظام شمسی کو ایک منضبط صورت میں پیش کیا، لیکن کیپلر یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اور گردش اجرام کے متعلق اس نے جو وہ تین اصول قائم کئے ہیں وہ کس سبب کے تحت

منضبط ہوتے ہیں، اس مسئلہ پر سب سے پہلے نیوٹن نے توجہ کی اور اس نے ثابت کیا کہ یہ سب کچھ اجرام کے باہمی تجاذب و کشش کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی کرہ جو محاً میں معلق ہے، اور اس پر کسی دوسرے کرہ کا کوئی اثر نہیں ہے تو وہ کسی قوت سے حرکت دے جانے کے بعد فضائے کائنات میں چل پڑے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنا راستہ کس طرح متعین کرے گا، جس وقت ایک پتھر پھینکا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فضا میں ہمیشہ ایک منحنی خط بناتا ہے اسلئے ہم اس کرہ کے متعلق خیال کر سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنا مدار منحنی خط پر قائم کرے گا لیکن یہ خیال غلط ہوگا، کیونکہ زمین پر ہم جو پتھر پھینکتے ہیں۔ اس پر خارجی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں برخلاف فضائے بسیط کے کہ وہاں اوپر نیچے، پست و بلند کا کوئی مفہوم نہیں ہے اس لئے جب ہم یہ تسلیم کریں گے کہ کوئی قوت کشش کرہ متحرک پر کام نہیں کر رہی ہے۔ تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ خط مستقیم میں حرکت کر رہا ہے، لیکن چونکہ ان کی حرکت دائرہ دار ثابت ہو چکی ہے۔ اس لئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جو کوئی قوت ایسی موجود ہے۔ جو انہیں خط مستقیم سے منحرف کر کے انحنا کی طرف مائل کئے ہوئے ہے، اور یہی وہ قوت ہے جسے جذب و کشش سے تعبیر کیا جاتا ہے

(نگار مئی ۲۲ء)

شعاعوں کے حیرت انگیز استعمالات

انکشاف جرائم کی ایک نئی راہ

حال ہی میں نیویارک (امریکہ) کے ایک جرائم پیشہ گروہ نے نہایت ہی معمولی قسم کا عطر تیار کیا اور فکر یہ کی کہ بازار کے قیمتی سے قیمتی عطر کی طرح فروخت ہو ـــــ انہوں نے کامل غور کے بعد یہ تدبیر اختیار کی کہ بازار سے عطر کی ایک شیشی جس کی قیمت ۲۰ گنی تھی لے کر شیشیاں بنانے کے کارخانہ میں گئے اور اس کو آمادہ کیا کہ بالکل اسی قسم کی شیشیاں تیار کر دے۔ جب شیشیاں تیار ہو گئیں تو ان میں نہایت ہی معمولی قسم کا عطر بھر دیا۔ اور ان پر بالکل اسی قسم کا لیبل چھپوا کر چسپاں کر دئے۔ جو اس قیمتی عطر کی شیشی پر پایا جاتا تھا ـــــ جب یہ شیشیاں بازار میں پہنچیں اور لوگوں نے انہیں خریدا تو دکانداروں سے شکائت

کی گئی۔ کہ عطر میں میل کیوں کیا جاتا ہے اور عمدہ عطر کے دام لیکر خراب عطر دینے کا کیا سبب ہے۔

دوکاندار غریب حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اور ان کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آتی تھی۔ کہ بند شیشیوں کے اندر اچھے اور خراب عطر کی تمیز کیوں کر کی جائے ـــــ آخر کار یہ معاملہ مقامی پولیس تک پونچا۔ اور ڈاکٹر ہرجان سے مشورہ طلب کیا گیا۔ جو شعاعوں کے ذریعہ سے کشف جرائم میں خاص مہارت رکھتا تھا ـــــ یہ شیشی لے کر اپنی تجربہ گاہ میں گیا۔ اور فوق البنفشی شعاعیں اس پر ڈالیں۔ اس کے بعد اور متعدد شیشیاں لے کر تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ اچھے عطر کی شیشی سے جو شعاعیں گذرتی ہیں وہ نیلگوں ہوتی ہیں اور خراب عطر کی شیشی سے گزرنے والی شعاعیں، زرد ہوتی ہیں۔

ـــ اسی طرح اُس نے لیبل پر بھی شعاعیں ڈالیں تو معلوم ہوا کہ اصلی شیشی کا لیبل چھاپنے کے لئے جو سیاہی استعمال کی گئی ہے وہ اور ہے اور نقلی شیشی کا لیبل کسی اور سیاہی سے چھاپا گیا ہے ـــــ آخر کار دوکانداروں نے یہ آلہ خرید کر اپنی دوکان کی تمام شیشیوں کا امتحان کر لیا اور جتنی خراب عطر کی شیشیاں تھیں ان کو علیحدہ کر دیا۔

چند موٹر ڈرائیور سڑک کے ایک جانب کھڑے ہوئے ٹائر درست کر رہے

تھے۔ کہ قریب ہی ایک خندق میں انہیں لاش نظر آئی جس کے سر سے گولی گزر گئی تھی۔ دیکھ بھال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ کیونکہ کشاکش کے نشان وہاں موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ایک سرخ ریشمی رومال بھی گھاس پر پڑا ہوا ملا۔ جو غالباً قاتل کا تھا۔ اور بھاگتے وقت گھبراہٹ میں وہیں چھوٹ گیا تھا۔ ——

مقتول ایک نہایت مشہور بخیل زمیندار تھا۔ جو اپنے کاشتکاروں کو بہت تکلیف پہنچایا کرتا تھا۔ اور کاشتکار اس کے پاس تہدید و تخویف کے خطوط بھی بھیجا کرتے تھے —— پولیس نے خیال کیا کہ یقیناً انہیں پڑوس کے مزارعین میں سے کسی نے اس کو ہلاک کیا ہوگا۔ اور اسی یقین کی بنا پر تفتیش شروع کر دی گئی۔ ——

دوران تفتیش میں جب رومال پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں جا بجا مٹی کے دھبے بھی موجود ہیں۔ جیسے پسینہ پونچھنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ رومال ایک ماہر فن کے پاس بھیجا گیا —— اس نے جب رومال پر شعاع ڈالی تو رومال کے دھبے چمکنے لگے —— اس نے کہا کہ اس مٹی میں کوئی ایسا مادہ ہے جو فاسفورس کی طرح چمکتا ہے —— پولیس نے تمام مزارعین کے کھیتوں اور مکانوں کی مٹی کو امتحان کیلئے بھیجا۔ تاکہ جس مزارع کے کھیت یا مکان کی مٹی ویسی ہی چمکتی ہوئی نظر آئے گی۔ اسی کو مجرم گردانا جائے گا۔ لیکن پولیس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کسی مزارع کے کھیت کی مٹی اس طرح کی نہ نکلی —— جستجو سے معلوم ہوا کہ جائے قتل کے قریب ہی ایک بڑا گڑھا ہے۔ جس کے اندر

سے کنکر نکلتے ہیں اور چینی کا برتن بنانے کے لئے مزدور یہاں سے مٹی لے جاکر فروخت کرتے ہیں جسوقت اس خندق کی مٹی کا امتحان لیا گیا تو وہ بالکل اسی طرح چمکنے لگی جس طرح رومال کے دھبے چمکتے تھے۔ آخر کار تمام مزدور طلب کئے گئے اور قاتل گرفتار ہو گیا۔ اس نے بعد کو بیان کیا کہ مقتول مٹی لے جانے سے اُسے روکتا تھا اس لئے غصہ میں آکر اُس نے پستول کا فیر کر دیا۔

امریکہ کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہونے لگی۔ کہ فلاں مجرم جس کا نام کابونی ہے۔ سزایاب نہیں ہوا۔ بلکہ اُس نے ایک اور شخص کو جو بالکل اُسی کا ہم شکل ہے اپنی جگہ قید خانہ میں بھیجدیا ہے۔ اور خود آزاد پھر رہا ہے۔ کابونی کے چہرہ پر بھی زخم کا سا ایک داغ تھا۔ اور جو شخص اس کی جگہ قید خانہ گیا تھا۔ وہ بھی ویسا ہی داغ رکھتا تھا۔ لیکن فرق یہ تھا کہ کابونی کا داغ بہت پرانا تھا۔ اور دوسرے شخص کا جدید۔ اس لئے ماہر فن نے کہا۔ کہ اس شخص کے داغ پر شعاعیں ڈال کر دیکھنا چاہیئے۔ اگر داغ پرانا ہو گا تو چمکدار نیلا نظر آئیگا ورنہ نہیں۔ چنانچہ یہ تجربہ کیا گیا۔ اور اخباروں کی خبر بالکل صحیح نکلی۔ بعد کو اصل مجرم ڈھونڈھ کر گرفتار کیا گیا۔ اور اس کو سزا دی گئی۔

ایک بار سڑک پر ایک لاش ملی۔ جس کے پاس کانچ کے بہت سے ٹکڑے

پڑے ہوئے تھے۔ خیال کیا گیا۔ کہ غالباً کسی موٹر سے ٹکر کھا کر یہ شخص مرا ہے۔ اور کانچ کے ٹکڑے موٹر کے لمپ کے ہیں ــــ اتفاق سے تلاش کرنے پر قریب ہی کسی گراج میں ایک موٹر نظر آیا۔ جس کا لمپ آگے کی جانب کا ٹوٹا ہوا تھا۔ اور کانچ کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس ملے تھے۔ قریب قریب اس کانچ سے ملتے جلتے تھے۔ جو لمپ میں لگا ہوا رہ گیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق ہو گیا۔ کہ گذشتہ شب کو موٹر ڈرائیور اسے لے گیا تھا۔ اور راستہ میں شیشہ بھی ٹوٹا تھا ــــ الغرض اس قدر تحقیق کے بعد موٹر ڈرائیور گرفتار کیا گیا۔ اس نے کہا کہ "بیشک میں رات کو موٹر لے گیا تھا۔ اور لمپ بھی راستہ میں ٹوٹا۔ لیکن کسی آدمی سے ٹکرا کر نہیں بلکہ ایک اور موٹر سے ٹکرا کر جو نہایت تیزی سے گذر رہی تھی"۔ آخرکار کانچ کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس پڑے تھے۔ اور وہ ٹکڑے جو لمپ میں لگے ہوئے رہ گئے تھے۔ ماہر فن کے پاس بھیجے گئے۔ اور اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔ کہ لاش کے پاس جو کانچ کے ٹکڑے ملے ہیں وہ موٹر کے لمپ کے نہیں ہو سکتے کیونکہ ان سے شعاعیں سیدھی ہو کر نکلیں۔ اور لمپ کے شیشہ سے کسی اور رنگ کی۔ آخرکار یہ چھوڑ دیا گیا۔ اور بعد کو جستجو سے اصل مرتکب جرم کا گرفتار کیا گیا۔

چکاگو کے جوار میں ایک چور تھا۔ جو رات گئے آنے جانے والی عورتوں

کو ریوالور کا فیر کرکے روک لیتا تھا۔ اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا لوٹ لیتا تھا اور پھر فوراً ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ چوم لیتا تھا۔ اور چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن ہاتھ میں اس کے دستانہ ضرور رہتا تھا۔ تاکہ عورتوں کے چہرہ پر اس کے ہاتھ کا نشان نہ پایا جائے۔ ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا۔ لیکن کسی طرح گرفتار نہ ہوسکا ____

پولیس نہایت سرگرمی سے اُس کی جستجو کر رہی تھی۔ کہ اتفاق سے ایک رات ایک نوجوان جو نہایت اچھے ملبوس میں تھا۔ اسی مقام پر ملا۔ جہاں گذشتہ رات اسی مقام پر ایک واقعہ ہوگیا تھا۔ اس کو گرفتار کیا گیا۔ لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ جس وقت واقعہ ہوا ہے وہ یہاں موجود ہی نہ تھا۔ پولیس نے اُسے توضمانت پر چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے دستانے امتحان کی غرض سے لے لئے ____

جس وقت ان دستانوں پر شعاعیں ڈالی گئیں تو معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ کے دستانے کے وسط میں ایک مستطیل سا نشان ایسا ہے۔ جس سے شعاعیں عجیب رنگ کی گزرتی ہیں۔ اب مزید جستجو کے سلسلہ میں وہ لڑکی طلب کی گئی۔ جس پر آخری بار حملہ کیا گیا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر لگی ہوئی سرخی کا امتحان لیا گیا۔ تو اس سے بھی بالکل وہی رنگ پیدا ہوا۔ جو دستانے کے داغ سے پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سے ثابت ہوگیا کہ دستانہ اسی لڑکی کے ہونٹوں سے مس ہوا تھا۔ اور مجرم کو سزا دی گئی۔

شہر کوپن ہاگن سے قریب خندق میں ایک عورت کی لاش ملی جس کے دونوں پاؤں پنڈلیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ پولیس نے غائب ہو جانیوالے لوگوں کی فہرست میں جستجو کی لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ عورت کون ہے پولیس نے عکس ریز (X. Rays) کے ذریعہ سے اس کے اندرونی اعضاء کی تصویر لی تو معلوم ہوا کہ اس کے پھیپھڑے میں سل کی بیماری کے داغ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پولیس نے یہ دیکھ کر ان شفاخانوں کی جستجو کی جہاں اس بیماری کے مریض رکھے جاتے تھے۔ اور آخر کار ایک شفاخانہ میں ایک پھیپھڑے کی تصویر ملی جو بالکل عورت کے پھیپھڑے کی طرح تھی، اور پتہ چلا کہ اس عورت کا یہ نام تھا، یہ پتہ تھا اور دو ہفتے ہوئے کہ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ پولیس اس کے مکان پر پہونچی۔ اور مختلف کاغذوں اور کپڑوں کی جستجو کے سلسلہ میں انگلیوں کے نشان بھی کسی کسی چیز پر نظر آئے اور انہیں نشانوں سے پتہ چلا کہ مقتول واقعی وہی عورت تھی اور بعد کو قاتل بھی ملا اور اس کو سزا ہوئی۔

اوپر کی چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ فوق البنفسجی شعاعوں سے تحقیق جرائم میں کتنی زبردست مدد ملتی ہے۔ اور ان شعاعوں کے اثرات و نتائج کس درجہ قابل یقین ہوتے ہیں۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ اس طریق سے ہزاروں قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور دنیا کی کوئی دو چیزیں ایسی نہیں ہیں۔

جن میں ذرا سا بھی کسی قسم کا اختلاف ہو، اور اس طریق عمل سے ظاہر نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر گوڈوین نے جو اس کے بڑے ماہر ہیں اس وقت تک ۲۰ ہزار نمونے ان شعاعوں کے منضبط کر لئے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ اگر کبھی جرم کی جائے وقوع پر کاغذ یا چمڑے یا کوئی ٹکڑا یا بال کا کوئی حصہ نظر آئے تو وہ بھی انکشافِ جرم کے لئے کافی ہے کیونکہ شعاعی عمل کے ذریعہ سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ اس چمڑے کی دباغت کس طرح ہوئی ہے اور مختلف دباغتوں کے مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح کاغذ کے ٹکڑے کا امتحان کرنے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کاغذ کہاں کہاں رہا ہے۔ اور وہ کن کن چیزوں سے مس ہوا ہے۔ بال کا بھی یہی عالم ہے۔ کہ ہر چند بظاہر تمام بال ایک ہی قسم کے معلوم ہوتے ہیں لیکن شعاعی تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف لوگوں اور قوموں کے بال سے کتنے رنگ مختلف پیدا ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے اصلی و نقلی سنگ مرمر، اچھے اور برے ریشم کی بھی پہچان ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے۔ کہ آٹا کس قسم کی چکی کا پسا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک چور کے کپڑوں پر آٹے کے ذرات نظر آئے اور شعاعی تحقیق سے پتہ چل گیا کہ یہ آٹا فلاں چکی کا پسا ہوا ہے۔

شعاعی تجربہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک عورت کے بالوں کا حسن قدرتی ہے یا مصنوعی۔ کیونکہ قدرتی حسن والے بالوں سے تقریباً ۱۲ قسم

کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور مصنوعی طور سے جو حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی قسم کی شعاع پیدا کرتا ہے، البتہ یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ بالوں میں کسی قسم کا مسالہ، تیل یا عطر استعمال کیا گیا ہے۔

فرض کیجیے کسی کمرہ کے اندر کوئی مقتول نظر آیا اور ماحول کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمیوں میں باہم ضرور کشاکش ہوئی ہے۔ اور بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے قاتل کا پتہ چل سکے تو آپ سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن امریکہ کی پولیس مقتول کے ناخنوں کو دیکھے گی کہ آپس کی نوچ کھسوٹ میں قاتل کی کھال کا کوئی حصہ تو نچ کر نہیں آ گیا۔ اور پھر شعاعی تجربہ سے فوراً معلوم کر لے گی کہ قاتل کس قوم و جنس کا تھا۔ چنانچہ امریکہ میں ایک بار بالکل ایسا ہی اتفاق پیش آیا اور پتہ چلا کہ قاتل زنگی تھا اور چونکہ قتل کا واقعہ جاڑوں میں ہوا تھا اس لئے یہ سمجھ لیا گیا۔ کہ قاتل ضرور جنوب کی طرف سے آیا ہوگا اور آخر کار اس کا پتہ چل گیا۔

پھر یہ تمام نتائج اتفاقی نہیں ہیں بلکہ حقائق علمی کی صورت رکھتے ہیں۔ جو مختلف ممالک یورپ میں متعدد ماہرین فن کے ہزاروں تجربہ کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ اڈمون لوکا جو فرانس کا مشہور ماہر فن ہے اس نے اسی شعاعی عمل سے فرانس کے تمام مصنوعات کا تجربہ کر کے معلوم کر لیا ہے کہ فلاں کارخانے کے غبار سے کس قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی

طرح آگسٹ باسلینی نے جو شکاگو میں علمی ذرائع سے کشفِ جرائم پر مامور ہے، معدنی اشیاء کی تحقیق کر کے بہت سے جرائم کا انکشاف کیا ہے۔ اُس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں تمام زہروں کا شعاعی تجربہ کر کے نتائج درج کئے ہیں۔

نیویارک کے ڈاکٹر گوڈمین نے عورتوں کے اسباب زیبائش و آرائش کی تحقیق کی ہے، اور معلوم کیا ہے کہ مختلف تیلوں، عطروں، پوڈروں، غازوں سے کتنی مختلف رنگ کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح اس نے ۳۰۰ جرائم کا انکشاف کیا ـــــــ اسی طرح شعاعی عمل سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک ناخن کا ٹکڑا کتنے عرصہ کا کٹا ہوا ہے۔

گذشتہ سال باسینی کے معاون کیمیاوی نے اعلان کیا تھا کہ قوقازی جنس کے آدمیوں کے دانت اگر گھسے جائیں تو ان سے نیلگوں شعاع پیدا ہوتی ہے۔ مشرقی لوگوں کے دانتوں سے زرد اور زنگیوں کے دانتوں سے سرخ شعاع نکلتی ہے۔ چنانچہ شکاگو کے کسی گندے نالہ میں ایک لاش پائی گئی جو بالکل پھول کر خراب ہو گئی تھی۔ اور اس کی شناخت مشکل تھی۔ سر البتہ ٹوٹا ہوا تھا اس لئے اس کے مقتول ہونے کا یقین ضرور تھا۔ اب جستجو یہ ہوئی کہ آیا اسے چوروں نے ہلاک کیا ہے یا چینی آبادی میں قتل کیا گیا ہے اس کا ایک دانت امتحان کے لئے بھیجا گیا اور اسے گھس کر شعاعی تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا

کہ مقتول مشرقی جنس کا ہے۔ اور آخر کار اسی تحقیق سے یہ انکشاف ہوا کہ چینیوں نے اسے مار کر نالہ میں پھینک دیا تھا۔

امریکہ میں ایک ماہر فن نے اسی شعاع کا آلہ بنا کر بازار میں پیش کیا ہے اور ہر شخص اسے خرید سکتا ہے۔ چنانچہ بنکوں میں عام طور پر اس کا استعمال شروع ہو گیا ہے اور نہایت آسانی سے کھرے کھوٹے سکے اور اصلی و نقلی نوٹ کا پتہ چل جاتا ہے ـــــ یورپ کے بھی اکثر بنکوں میں اس قسم کے لمپ رکھے رہتے ہیں تاکہ جعلی نوٹ اور کاغذات مالی کا پتہ ان سے چلایا جائے کیونکہ اصلی نوٹوں سے نیلگوں شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور نقلی نوٹوں سے سبزی مائل ـــــ ثلثی شیشیوں سے جو شعاعیں نکل کر اپنی تموجات منتشر کرتی ہیں۔ وہ بھی فوائد سے خالی نہیں ہیں۔ اگر خوردبین تیر و غرافی کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ ایک بار کوئی امریکی فلاح اپنے داماد کے ساتھ موٹر پر سوار ہو کر گیا۔ راستہ میں موٹر الٹ گیا۔ اور بڈھا فلاح ایک پتھر سے ٹکرا کر مر گیا ـــــ تفتیش کی گئی تو داماد نے بیان کیا کہ جس وقت پتھر سے موٹر ٹکرایا تو میں کود کر علیحدہ ہو گیا لیکن بڈھا فلاح نہ نکل سکا اور پتھر کے تصادم سے مر گیا۔ چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ اس فلاح کو حال ہی میں کسی بیمہ کمپنی سے بڑی رقم ملی تھی۔ اس لئے کچھ شبہ پیدا ہوا۔ اور شعاعی عمل کیا گیا جس سے یہ پتہ چلا کہ بڈھے کے سر سے جو ریزے پتھر کے نکلے ہیں وہ اس پتھر کے ایزدل سے بالکل مختلف ہیں جس سے موٹر کا ٹکرا جانا بیان کیا جاتا تھا۔ اور اس طرح خیر

میں یہ معلوم ہوا کہ داماد نے خود اپنے خُسر کو ہلاک کر کے صورت ایسی پیدا کی تھی کہ کسی کو شبہ نہ پیدا ہو۔

الغرض یہ دور شعاعوں کا ہے اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اہل مغرب اسی سے کام لے رہے ہیں لیکن ہندوستان کی کم علمی و جہل کا یہ عالم ہے کہ یہاں کی آبادی کا بڑا حصّہ ابھی تک عہد حجری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور اُسے بالکل خبر نہیں کہ قدرت کے کتنے عطیات کی طرف سے وہ محروم زندگی بسر کر رہا ہے۔

نگار مارچ ۱۹۳۳ء

صحافت مغرب کی حیرتناک داستان

نیویارک ٹائمس کی ترقی کے ساحرانہ مناظر

نیویارک ٹائمس کا سب سے پہلا پرچہ ۱۸ ستمبر ۱۸۵۱ء کو شائع ہوا لیکن ایک ایسی حقیر کوٹھری سے نہ جس میں کھڑکیاں تھیں، اور نہ الماریاں، نہ ٹیلیفون تھا نہ تار اور مقالاتِ ادارہ ایک قدیم وضع کی ناتراشیدہ میز پر لکھے جاتے تھے جہاں ایک موم بتی سے زیادہ روشنی کا کوئی سامان نہ تھا۔

لیکن اب وہ ایک ایسی عظیم الشان عمارت سے شائع ہوتا ہے جسکی ۲۴ منزلیں ہیں اور منزل کی وسعت سوائے بالائی تین منزلوں کے ۲ ہزار مربع گز کی ہے اور ہر منزل جدید ترین آرائش و زیبائش اور ضروریات صحافت سے آراستہ ہے۔

اس کی موجودہ اشاعت روزانہ تین لاکھ پچاس ہزار ہے اور ہفتہ وار ایڈیشن چھ لاکھ شائع ہوتا ہے۔ موجودہ اسٹاف جس میں ادارہ، تحریر، مراسلہ نگاری، اور خبر رسانی کے تمام اشخاص شامل ہیں دو ہزار نفوس سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ جن کی سالانہ اُجرت دس لاکھ گنی ہے۔

اس اخبار میں روزانہ ۲۰۰ ٹن کاغذ کا خرچ ہے۔ یعنی سال میں ۶۴ ہزار ٹن کاغذ جس کی قیمت گیارہ لاکھ گنی ہوتی ہے۔ روزانہ ۴ ٹن سیاہی صرف ہوتی ہے جس کی سالانہ قیمت ۵۰ ہزار گنی ہوئی۔ اخبار موٹروں، ریلوں، اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے تقسیم ہوتا ہے جس کے مصارف دو لاکھ گنی سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور یہ سب نتیجہ ہے۔ ایک ایسے شخص کی فکر و محنت کا جو امریکہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اور ٹائپ کمپوز کرنیوالے کی حیثیت سے دنیا میں اوّل اوّل داخل ہوا۔ اس وقت تک دو کروڑ گنی وہ اس اخبار کے ذریعہ سے کما چکا ہے جس میں سے تین فیصدی کے حساب سے اس نے حصہ داروں کو تقسیم باقی اخبار کی ترقی میں لگایا یہ حالت موجودہ اس کی املاک کی قیمت ۳۰ لاکھ گنی ہے۔ اس اخبار کا نظم و نسق چھ شعبوں پر منقسم ہے۔ پہلا شعبہ خبروں سے متعلق ہے جس میں سیاسی، علمی، تجارتی، تمثیلی خبریں اور وہ خبریں جو لہو و لعب سفر و سیاحت، جرائم اور عدالت گاہوں سے متعلق ہیں فراہم کی جاتی ہیں۔ دوسرا شعبہ اڈیٹر اور اس کے مددگاروں کا ہے۔ جو مقالہ افتتاحیہ وغیرہ

لکھتے ہیں تیسرا شعبہ تجارتی ہے جس سے اشتہارات، نشر و اشاعت اور حسابات وغیرہ متعلق ہیں چوتھا شعبہ میکانکی ہے جس میں مشینیں وغیرہ شامل ہیں پانچواں شعبہ ملازموں کے کام کی جانچ اور ان کی اجرت وغیرہ سے متعلق ہے اور چھٹا شعبہ متفرق کاموں کو دیکھتا ہے۔

پہلا شعبہ جس کا تعلق خبروں سے ہے۔ نہایت اہم ہے کیونکہ ایک اخبار کی اشاعت و ترقی کا انحصار اسی کی تکمیل پر ہے۔ یہ شعبہ ڈاک، ٹیلی فون، تار، لاسلکی وغیرہ کی مدد سے تمام دنیا کی خبریں جمع کرتا ہے اور اس شعبہ کا صدر وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو میدان جنگ میں سر عسکر کی ہوتی ہے اس کے ماتحت تین سو سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں۔ جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے وہاں کی خبریں روزانہ بھیجتے رہتے ہیں۔ یہ ہر وقت اپنے آدمیوں کو تار کے ذریعہ سے ہدایات بھیجتا رہتا ہے اور اس کی کوشش یہی ہوتی ہے۔ کہ دنیا کی کوئی اہم خبر شائع ہونے سے نہ رہ جائے اور سب سے پہلے نیویارک ٹائمس میں شائع ہو۔

مغرب کی صحافت میں بڑی زبردست مسابقت اسی امر میں ہوتی ہے کہ کون سب سے پہلے خبر شائع کرتا ہے یہ شعبہ دو حصوں میں منقسم ہے ایک کا تعلق شہر کی خبروں سے ہے اور دوسرے کا تمام بیرونی دنیا سے پہلے حصہ میں نیویارک اور اس کے چاروں طرف دو دو سو میل تک کی خبریں فراہم

کی جاتی ہیں۔ اور دوسرے میں ڈاک، لاسلکی ٹیلی فون اور تاروں کے ذریعے تمام دنیا کے حالات اکھٹا کئے جاتے ہیں۔ اس شعبہ کے ایڈیٹر دو ہوتے ہیں ایک دن کو کام کرتا ہے، دوسرا رات کو۔ ان کے ماتحتی میں ۷۰ مخبر کام کرتے ہیں۔ جن میں سے ۱۲ صرف کھیل کود اور تفریحی خبروں کو فراہم کرتے ہیں۔

صبح کا ایڈیٹر بہت تڑکے آکر تمام مخبروں کے فرائض متعین کرتا ہے کہ کس کو کس طرف جانا ہے اور اس کا ایک نقشہ بنا دیتا ہے جس کو چلتے وقت شام کے ایڈیٹر کے سپرد کر دیتا ہے۔ شام ہوتے ہوتے دفتر میں شہر اور ساری دنیا کی خبریں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور ان کو شہری و بیرونی دو حصوں میں تقسیم کر کے متعلقہ ایڈیٹروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو اپنے مددگاروں کو ان کے ذوق و استعداد کے لحاظ سے صحت و درستی، حذف و اضافہ کے لئے تقسیم کر دیتا ہے لیکن انہیں اصل خبر میں کمی زیادتی کا اختیار نہیں ہوتا اور نہ ان خبروں پر بُری یا بھلی تنقید کر سکتے ہیں۔ یہ کام صرف ایڈیٹر کا ہے۔

روزانہ گیارہ بجے دن کو اخبار کا مالک چیف ایڈیٹر ایک وسیع کمرہ میں جو نہایت آراستہ ہے اور جس میں ایک بڑی مستطیل میز بچھی ہوئی ہے۔ اپنے تمام ماتحت ایڈیٹروں کو بلاتا ہے۔ اور تمام اہم مسائل پر گفتگو کرنے کے بعد ہر مسئلہ میں پالیسی متعین کرتا ہے اور اسی کے مطابق دن بھر کام کیا جاتا ہے۔ یہاں کے کتب خانہ میں ۲۰ ہزار بہترین کتابیں موجود ہیں۔ جن سے ایڈیٹر کام

کام لیتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں۔ انہیں کتابوں کی مدد سے دلائل وشواہد کی بنا پر لکھتے ہیں یہی سبب ہے کہ اس اخبار کا مرتبہ ملک میں بہت بلند ہے۔ اور اس کی حیثیت ایک حکم کی سی ہے۔ امریکہ کا کوئی کالج اور کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے۔ جہاں اس اخبار کا باقاعدہ قائل نہ ہو اور وقت ضرورت اس سے استناد نہ کیا جاتا ہو۔

کتب خانہ میں دیواروں پر بڑے بڑے رنگین شیشے لگے ہوئے ہیں جن پر تصاویر کے ذریعہ سے اخبار کی تمام تاریخ درج ہے پہلے یہ دکھایا ہے۔ کہ اخبار کس طرح ایک دستی مطبع میں چھپتا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے کس طرح ترقی کی یہاں تک کہ وہ بجلی کے ذریعہ سے کمپوز ہونے لگا۔ اور بڑی بڑی عفریت پیکر مشینوں سے کام لیا جانے لگا۔ اخبار کی تقسیم و اشاعت کے جو ذرائع ہیں انہیں بھی تصاویر کے ذریعہ سے بتایا ہے اور وہ قدیم و جدید طریقے فوٹوگرافی کے بھی دکھلائے ہیں جن سے اخبار میں کام لیا گیا اور اب لیا جاتا ہے۔

اخبار کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اشتہارات ہیں ورنہ محض اخبار کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی ہے، وہ کاغذ کی قیمت سے بھی ۶ ہزار ڈالر کم ہوتی ہے۔

اشتہارات کی بابت اس اخبار کا اعتبار بہت بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ اس وقت تک کوئی اشتہار شائع نہیں کرتا۔ جب تک مشتہرہ چیز کی خوبی کا اس

کو یقین نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے ایک شعبہ الگ ہے جو صرف اس امر کی تحقیق کرتا رہتا ہے اور ہر ممکن کوشش سے حقیقت کا علم حاصل کرتا ہے۔

اس اخبار میں جو اشتہار شائع ہوتے ہیں ان کی ترتیب اور ان کے عنوانات اس قدر دلچسپ ہوتے ہیں کہ پبلک پر ان کا بہت اثر پڑتا ہے اور چونکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اس اخبار میں کوئی اشتہار لغو اور جھوٹا نہیں ہوتا۔ اس لئے مشتہرین کا مال بہت فروخت ہوتا ہے اور لوگ کثرت سے اشتہار بھی دیتے ہیں۔ اجرت اشتہار فی سطر نصف ڈالر (تقریباً ۱۲؎) لی جاتی ہے اور اس ذریعہ سے سالانہ آمدنی ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر سے کم کسی طرح نہیں ہوتی۔

یہاں جتنی مشینیں اور آلات جدیدہ لگے ہوئے ہیں وہ دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک حصہ تحریر و ادارہ سے متعلق ہے اور دوسرا طباعت کے شعبہ سے عمارت کے تیسرے درجہ میں تین کمرے ایسے بنے ہوئے ہیں کہ ان سے باہر آواز کسی طرح نہیں جا سکتی۔ ایک کمرے میں نو برقی ٹائپ رائٹر رکھے ہوئے ہیں جن کا تعلق براہ راست اسوسی ایٹڈ پریس سے ہے یعنی ہر وقت وہاں سے خبریں آتی ہیں اور از خود ان ٹائپ رائٹروں میں چھپتی رہتی ہیں ہر منٹ میں ۶۰ لفظ کے حساب سے یہ آلات کام کرتے ہیں اور کوئی ایک شخص بھی یہاں موجود نہیں ہوتا۔ نیویارک ٹائمس نے خاص اپنے تار الگ کھنچوائے ہیں جن کا تعلق

براہ راست اسوشیٹڈ پریس کے صدر دفتر سے ہے۔

اس کمرہ سے ملا ہوا۔ دوسرا کمرہ لاسلکی کا ہے۔ جہاں دو آدمی ہر وقت اپنے کانوں سے آلہ لگائے ہوئے ہزار ہا میل کی خبریں حاصل کر کے لکھتے رہتے ہیں تیسرا کمرہ خبروں اور برقیات کا ہے۔ یہاں ۶۵ کلرک تار کے ہیں جو ہر وقت کم از کم ستر ہزار الفاظ کی خبریں حاصل کرتے اور نیویارک ٹائمس کمپنی کے دوسرے اخباروں (ٹربیون۔ گلوب۔ ہرلڈ وغیرہ) کے پاس بھیجتے رہتے ہیں ٹائمس کے تین تار علیحدہ کھنچے ہوئے ہیں جو واشنگٹن شکاگو اور ہلی فاکس کے دفاتر سے براہ راست ملتے ہیں۔

ٹیلی فون کے آلات بھی اتنے ہی ہیں خود عمارت کے اندر ۸ تار ٹیلی فون کے ہیں جو ۲۹۰ شاخوں میں تقسیم ہو کر عمارت کے ہر حصّہ تک پہنچتے ہیں۔ اس کا اکسچینج بھی یہیں ہے جہاں چودہ عورتیں ہر وقت کام کرتی ہیں علاوہ ان کے پانچ تار ٹیلی فون کے بالکل علیحدہ ہیں جو دور دراز مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ گرمی کے لئے ایک خاص تار اور لگا ہوا ہے۔ جو چیف ایڈیٹر کے گرمائی مقام سے متعلق ہوتا ہے۔

ایک اور وسیع کمرہ میں ٹیلی فون کی تین شاخیں ہیں جو مختصر خبروں اور روز کی معمولی گفتگو کے لئے وقف ہیں ہر روز تقریباً ۲۵۰۰ آدمی اس دفتر سے گفتگو کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس دفتر میں ہزاروں آدمی کام کرتے ہوں، سینکڑوں مقامات سے ہر وقت خبریں آتی رہتی ہوں، ہزاروں اعلانات اور اشتہارات کا انتظام ہو، تمام دنیا کے اخبارات کے ضروری تراشے جمع ہوتے ہوں۔ بات بات میں ادارہ کے تمام افراد کو مشورہ کی ضرورت ہوتی ہو وہاں اگر ایک دوسرے کے ساتھ ٹیلی فون کا تعلق نہ ہو تو کیونکر کام چل سکتا ہے۔ اس لئے عمارت کا کوئی حصہ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں تار اور ٹیلی فون نظر نہ آتا ہو۔

اس میکانکی حصہ یعنی وہ حصہ جس کا تعلق مشینوں سے ہے نہایت وسیع ہے۔ کمپوز کرنے کے لئے لینو ٹائپ اور مونو ٹائپ مشینوں کے علاوہ اور بڑی بڑی مشینیں اخبار اور تصاویر چھاپنے کی ہیں۔ اشتہارات کا حصہ کمپوز کرنے کے لئے مونو ٹائپ مشین سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ اشتہاروں کے عنوان مختلف شکلوں کے ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو اور ظاہر ہے کہ ان کے لئے ہمیشہ نئے ٹائپ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لینو ٹائپ کے ذریعہ سے ایسے ٹائپ ہر وقت آسانی سے ڈھل جاتے ہیں۔

یہاں بیس مشینیں طباعت کے لئے ہیں۔ جن سے ہر گھنٹہ میں ۴ لاکھ کاپیاں اخبار کی نکلتی ہیں جس کا حجم ۴ صفحے سے لے کر ۴۶ صفحات تک ہوتا ہے یہ مشینیں بالکل نیچے کے درجہ میں ہیں اور اس کا رقبہ ۲۸۵۰۰ مربع گز ہے جن موٹروں سے یہ مشینیں چلائی جاتی ہیں۔ اُن میں ۱۶۰۰ گھوڑوں کی برقی قوت صرف

ہوتی ہے۔ جب اخبار چھپ جاتا ہے۔ تو اشاعت کے کمرہ تک بجلی ہی کے ذریعہ سے پونچایا جاتا ہے۔ علاوہ ان کے دس مشینیں تصاویر چھاپنے کے لئے ہیں۔ یہ روٹوگرافری مشینیں ہیں جن کے بیلنوں پر تصاویر کھُد جاتی ہیں ان سے ہر گھنٹہ میں ۹۰ ہزار کاپیاں مصور حصّہ کے چھپتی ہیں۔ جس کا حجم ۸۰ صفحات کا ہوتا ہے۔

نگار دسمبر ۱۹۲۱ء



فلسفۂ نیٹشے پر ایک نظر

یورپ کی اس جنگِ عظیم سے جو جو انکشافات ہائلہ دنیا میں ہوئے ہیں۔ وہ اس قدر حیرتناک ہیں کہ ایک انسان مشکل سے باور کر سکتا ہے اگر عقولِ انسانی اس عہدِ تمدن و تہذیب میں بھی اس قدر درندگی کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں کہ ازمنہ تاریک کی یاد دل سے محو ہو جائے۔

اس وقت تک جرمنی کے اغراض و مقاصد پر جو روشنی ڈالی گئی ہے وہ گو کیسی ہی بسیط و شگافتہ کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہنوز بہت سے پہلو ایسے ہیں جو تنقید کے محتاج ہیں اور اس وقت تک ان پر بہت کم لکھا گیا ہے میں نے نگار کی اشاعت اوّل میں تجارتی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بتایا تھا۔

کہ جرمنی کس خیال کے زیر اثر میدان جنگ میں آیا، لیکن آج یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اسے میدان حرب تک پونچا دینے میں اور کن کن علمی ذرائع سے کام لیا گیا تھا۔
یہ ایک حقیقت مسلّمہ ہے کہ جرمنی علوم و فنون کا ایک ملک ہے، اور اس کی آبادی کا غالب حصہ ایک خاص انداز کے فلسفہ سے متاثر ہے۔ لیکن جس طرح ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی، اسی طرح جرمنی کی تمام فلسفہ طرازی بھی قابل تحسین نہیں ہو سکتی، اور علم و فضل کا یہی ایک تاریک پہلو ہے جسے نیٹشے اور ٹرشکی نے سرزمین جرمنی پر درخشاں کیا۔

نیٹشے کے اصول | نیٹشے ایک زمانہ دراز سے جرمنی کے سامنے اپنی تحریک پیش کر رہا تھا۔ کہ جس طرح ممکن ہو دنیا میں ضعیف قوموں کو صفحہ ہستی سے محو کر دیا جائے۔ چنانچہ جرمنی کا سواد اعظم اور خاص کر فوجی لوگوں کا اعتقاد ہو گیا کہ صرف جرمنی کا رہنے والا انسان ہی دنیا کا قوی اور ترقی یافتہ فرد ہے، اور صرف اسی کو عالم میں باقی رہنے کا حق حاصل ہے، نیز جرمنی کے علاوہ دوسری قوموں کو فنا ہو جانا چاہیئے۔ اور تنہا جرمنی تمدن کو جس کی بنیاد اصول نیٹشے وغیرہ پر ہے تمام اقوام کے تمدن پر غالب آجانا چاہیئے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ صرف جرمنی ہی تمام دنیا پر قبضہ کرنے اور اس پر حکومت کرنے کا مستحق ہے۔
جرمنی کی فوجی طاقت جو اصول مذکورہ سے متاثر ہو چکی تھی، جرمن حکومت پر غالب آگئی، یہاں تک کہ ہر محکمہ کا انتظام خواہ وہ ملکی ہو یا فوجی، انہی لوگوں

کے ہاتھ میں آ گیا اور صرف فوجی افسر ہی جرمنی کے ارباب حل و عقد سمجھے جانے لگے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی دوسری قوموں کا دشمن ہو گیا، اور غیر اقوام کے مقابلہ میں اس نے حق و انصاف کو بالکل چھوڑ دیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دوران جنگ میں جرمنی اپنے جن اصول پر دنیا کا دستور العمل قائم کرنا چاہتا تھا۔ اگر ان میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا اثر ہیئت اجتماعی پر کیا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ جرمنی سیاست اس صورت میں قوموں کو ذیل کی ترتیب میں رکھتی اور ہر طبقہ کے لئے خاص اجتماعی قوانین وضع کئے جاتے۔

(۱) (Super man) یعنی انسان اعلیٰ۔ اس طبقہ میں صرف جرمن قوم کا شمار ہوتا۔ اور اگر کوئی قوم اپنی خصوصیت کو چھوڑ کر جرمنی بن جاتی تو ممکن تھا کہ اس کا شمار بھی اسی طبقہ میں ہو سکتا۔

۲۔ (Ordinary man) یعنی انسان متوسط۔ اس میں جرمنی کے علاوہ اور متمدن اقوام کا شمار کیا جاتا۔

۳۔ (Sub man) یعنی انسان ادنےٰ۔ اس میں دنیا کی تمام غیر متمدن اور نیم وحشی اقوام داخل ہوئیں۔ انسان متوسط، انسان ادنیٰ کو فنا کر لے کی کوشش کرتا۔ اور انسان اعلیٰ انسان متوسط کو فنا کر دینا چاہتا یہاں تک کہ دنیا میں سوائے انسان اعلیٰ کے جو صرف جرمنی ہوتا اور کوئی باقی نہیں رہتا۔

جلتون اور نیٹشے | بعض اجتماعیین خاص کر جلتون نے تحسین نسل کے مسئلہ پر بہت

کچھ غور کیا تھا۔ اور عقل و فزیالوجی دونوں حیثیتوں سے اس مقصد کے لئے چند علمی قواعد بھی وضع کئے تھے جو علم یوجنیکس (Eugenics) علم تحسین نسل، کا سنگ بنیاد ہے لیکن جلٹون اور نیٹشے کی تعلیمات میں زمین و آسمان کا فرق ہے، علمائے تحسین نسل صرف یہ چاہتے ہیں کہ آئندہ نسلیں خوبصورت اور قوی پیدا ہوں بغیر اس کے ضعیف افراد پر کوئی مضرت رساں اثر پڑے لیکن نیٹشے چاہتا ہے کہ ضعیف افراد کو بالکل فنا کر دیا جائے اور دنیا میں صرف قوی افراد باقی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نیٹشے اپنے کو اس عالم میں بالاتر سمجھتا تھا اور مدبر عالم بھی خیال کرتا تھا۔

ڈارون کے اصول کی توہین

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات نیٹشے اور اس کے متبعین نے ڈارون کے ناموس ارتقا سے حاصل کئے تھے، اور چاہتے تھے کہ یہ ناموس دنیا کے تمام مظاہر فطرت پر منطبق کر دیا جائے۔

نیٹشے نے اس مسئلہ میں انسان اور حیوان میں کوئی فرق قائم نہیں کیا، اسکا خیال ہے کہ جسطرح ایک بلی چوہے کو فنا کر دیتی ہے، اسی طرح سفید رنگ کا انسان سیاہ رنگ والے آدمی کو ہلاک کر دینے کا حق رکھتا ہے۔

نیٹشے نے یہ تو دیکھا کہ جب دو بلیاں ایک پارۂ گوشت پر لڑتی ہیں تو قوی ضعیف سے چھین لیتی ہے لیکن اس نے اس پر غور نہیں کیا کہ شہد کی مکھیاں کس طرح متفقہ

کوشش سے شہد فراہم کرتی ہیں۔

تنازع اور تعاون کا تعاقب | عالم حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تنازع اور تعاون دونوں ایک ساتھ اپنا عمل جاری کرتے ہیں لیکن اثرات ہمیشہ متعاقب ہوتے ہیں یعنی جسوقت تعاون اپنا عمل کرتا ہے تو تنازع اس کو باطل کرنے کے لئے مستعد ہو جاتا ہے، اور جب تنازع کے اثرات قوی ہو جاتے ہیں تو تعاون ان کو محو کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات فتح تعاون ہی کے حصّہ میں آتی ہے۔

تنازع کا محل، متبائن افراد میں زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً بلّی اور چوہا ایک جنس کے افراد ہیں۔ اس وقت تنازع ہوتا ہے، جب دونوں فرد ایک ہی مقصد حاصل کرنے کیلئے کوشش کرتے ہوں، مثلاً بلیّاں دودھ اور چوہا ایک یا انہیں فطرت کیطرف سے یہ الہام ہو جائے۔ کہ جن چوہوں کا وہ شکار کرنا چاہتی ہے تعداد میں کم ہیں۔

اسی طرح شہد کی مکھیوں کے درمیان بھی اسوقت تنازع ہو سکتا ہے جبکہ وہ شہد جمع نہ کرتی ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کیونکہ فطرت نے انہیں ایسا سبق دیا ہے کہ اگر وہ موسم بہار میں شہد کا ذخیرہ فراہم نہ کریں گی تو اسی موسم میں (جب پھولوں میں شہد نہیں ہوتا) بھوک سے مر جائیں گی، شہد کی مکھیاں چونکہ ایک مقصد مشترک کے لئے بالاتفاق سعی کرتی ہیں، اسلئے ان میں تنازع نہیں پایا جاتا۔ بلکہ حد درجہ تعاون موجود ہے اور تنافر و تبائن سے دور ہو کر جسم واحد کیطرح اپنی حیات اجتماعی کا بقا چاہتی ہیں کائنات عالم کے تمام اجزا ناموس اجتماع کے اصول پر قائم ہیں یعنی جب یہ اجزا

تدریجاً جماعت کی صورت اختیار کرتے ہیں اور چھوٹی بڑی جماعتوں میں ملنا چاہتی ہیں۔
اسوقت ہیئت اجتماعی پیدا ہوتی ہے اگرچہ چونکہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے تصادم ضروری ہے اسلئے افراد اور جماعت کی ارتقائی رفتار کیلئے تنازع اور تباین کا پیش آنا بھی ضروری ہے یعنی اجتماع اجزاء سے پہلے دفع و جذب کی صورت میں تنازع ہوتا ہے، جس سے اجزاء کے درمیان توازن اور تناسب پیدا ہو کر اجتماعی کیفیات پیدا ہوتی ہیں اور یہ وہ عام قاعدہ ہے جو فطرت کے مظاہر میں پایا جاتا ہے، مادہ سدیمیہ اجرام سماوی، قشر الارض، جمادات بسیط و مرکب، خصائل نباتی، عالمات حیوانی، اجناس بشری، قبائل، اقوام، حکومتیں، غرض سب میں یکساں طور پر اس کا عمل جاری ہے۔

تعاون، تنازع کی جگہ | اس مختصر بیان کے بعد کسی عاقل کو شک نہیں ہو سکتا۔

کہ نٹشے اور اس کے اعوان و انصار کے اصول، قانون اجتماع بشری کے بالکل منافی ہیں، کیونکہ اگر اصول مذکورہ پر آزادی سے ہونے لگے۔ تو تعاون دنیا سے بالکل مفقود ہو جائے۔ اور معمورہ عالم ایک دائمی تنازع کا میدان بن جائے۔

کائنات عالم کی رفتار ارتقائی یا اتحاد اجزاء میں، اجتماع بشری سب سے آخری قدم ہے۔ جہاں تعاون انسانی تنازع حیوانی کے قائم مقام ہو گیا ہے، اگر یہ تعاون نہ ہوتا تو نہ جنس بشری میں ہیئت اجتماعیہ پائی جاتی اور نہ ان وحشی درندوں سے اُسے کچھ امتیاز حاصل ہوتا، جو یک دُوسرے کو فنا کرتے رہتے۔

یہ مسلم ہے کہ جنس بشری نے اس وقت تک تنازع نہیں چھوڑا ہے اور صحیح

معنوں میں اس وقت اس کا تعاون پایا جاتا ہے، استعمار، تجارت، اور نفوذ سیاسی کے لئے اقوام عالم کے درمیان سلسلہ تنازع برابر جاری ہے، بلکہ ایک ہی قوم اپنے اغراض اقتصادی اور سیاست داخلی کی بنا پر آپس میں تنازع کرتی رہتی ہے، لیکن جنس بشری خاموشی کے ساتھ منازل ارتقا کو طے کرنے سے بھی غافل نہیں ہے اور مستقبل بعید میں اک دن آنیوالا ہے جبکہ تعاون تنازع پر پوری طرح غالب آجائیگا اور اقوام عالم کے افراد میں روابط تعاون نہائیت استحکام کے ساتھ قائم ہو کر ہر قوم ایک ٹھوس جسم کی طرح ہو جائے گی

اصول نیٹشے کا خطرناک اثر ہیئت اجتماعی پر

ہر حرکت و عمل جو نظام اجتماعی کے خلاف ہو وہ حقیقت میں مجتمع بشری کی بنیاد کو منہدم کرنے والا ہے، اس لئے اگر نیٹشے کے اصول پر افراد نے عمل کرنا شروع کر دیا اور طاقتور اور ارباب نفوذ نے اپنی طاقت سے اسے رواج دینا چاہا۔ تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہے کہ ہیئت اجتماعی کی وہ مستحکم عمارت منہدم ہو جائیگی جسے ارتقائے بشری نے ہزاروں برس کی مدت میں تیار کیا ہے اور یہ خطرناک اصول المبشریت کو اس قدر پیچھے ہٹا دیں گے کہ انسان اپنی حیات اجتماعی کو چھوڑ کر بہیمی اور انفرادی طور پر زندگی بسر کرنے لگے گا۔

اصول نیٹشے خود نامعقول ہیں

نیٹشے کے اصول کی جو تاویل بھی کی جائے، لیکن وہ ہر گز کسی معقول صورت کیساتھ لوگوں کے سامنے پیش نہیں کئے جا سکتے، کیونکہ:

(۱) نیٹشے نے ضعف اور قوت کے درمیان کوئی حد مقرر نہیں کی ہے اور نہ وہ

مقرر نہ کر سکتا ہے، کیونکہ قوت وضعف کے بیشمار مراتب لوگوں میں پائے جاتے ہیں اگر ہر قوی کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے سے ضعیف کو فنا کر دے تو یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہیگا۔ جبتک کہ تمام افراد فنا نہ ہوجائیں۔

(۲) فرض کر لیجئے کہ نیٹشے نے قوی اور ضعیف کے درمیان کوئی حد مقرر کر دی تو کیا وہ افراد جنہیں نیٹشے نے ضعفا کی صف میں شمار کیا ہے، اس پر راضی ہو سکتے ہیں کہ طاقتور افراد کی خاطر انہیں صفحہ ہستی سے معدوم کر دیا جائے، لہذا وہ مجبوراً ان کے خلاف آپس میں اتفاق کرلیں گے، اور چونکہ بعض وقت قلت، کثرت پر غالب آجاتی ہے، لہذا ممکن ہے کہ کسی وقت ضعیف لوگ غالب آکر انہیں فنا کردیں اور بجائے اس کے کہ مجمع بشری ضعفا سے خالی ہوجائے گا۔ قوی لوگوں کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے، جو مقصد نیٹشے کے بالکل خلاف ہے۔

(۳) اگر قوی کو ضعیف پر غالب آنے کے لئے ہر ایک طریقہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ تو دنیا کا کوئی قانون باقی نہیں رہ سکتا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قوانین وشرائع لوگوں کے ادبیات اور حقوق کی محافظ ہیں اور اگر وہ اٹھائے جائیں تو ہیئت اجتماعی بالکل برباد ہوجائے۔ اور جب رعائت قوانین ضروری نہ ہوگی تو جس طرح قوی اور ضعیف کے درمیان ان کی رعائت نہ ہوگی، اسی طرح ایک قوی اور دوسرے قوی کے درمیان بھی اس کا احترام لازم نہ ہوگا، اور آخر میں یہی نتیجہ نکلے گا کہ ہیئت اجتماعیہ کے

اجزا پراگندہ ہو کر انسان اجتماعی قیود سے آزاد ہو کر انفرادیت سابقہ کی طرف عود کر جائے گا۔

نیٹشے کے اصول عہد حیوانی کے مناسب ہو سکتے ہیں | عجیب بات یہ ہے کہ نیٹشے نے اپنے اصول کی تعلیم اور اشاعت تو شروع کی لیکن اس نے ان کے اجرا کے لئے کوئی دستور العمل تیار نہیں کیا، اس وجہ سے اس کی تعلیمات صرف نظریات تک محدود رہتی ہیں، مگر یہ نظریات بھی غیر منظم اور آپس میں متخالف و متناقض ہیں۔

نیٹشے نے قوت کی تعریف کی ہے اور قوت حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے اور ضعف کی مذمت کی ہے اور اسے فنا کر دینا مناسب سمجھا ہے۔

ہم بھی قوت کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر فرد قوی ہو جائے اور ضعف کو برا خیال کرتے ہیں، اور اس کے زائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں چاہتے کہ ضعیف افراد محض اس قصور میں ہلاک کر دئے جائیں کہ وہ ضعیف ہیں، کوئی عاقل بھی اس کو پسند نہیں کر سکتا جس میں ضعیف افراد کو پامال کرنا ضروری ہو کیونکہ جو چیز عالم حیات میں ظاہر ہوئی ہے اسے زندہ رہنے اور نفع اٹھانے کا پورا حق حاصل ہے۔

نیٹشے کا مذہب اس وقت قابل عمل ہو سکتا تھا۔ جب تک انسان نے ترقی کر کے اجتماعی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ جانوروں کی طرح

انفرادی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن اب جب کہ انسان ایک جسم اجتماعی ہو گیا ہے اور اس کے مختلف اجزاء، روابط اجتماعی سے جکڑے ہوئے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ طاقتور ضعیف سے تنازع کرے اور اسے ہلاک کر ڈالے کیونکہ اس صورت میں اس جسم واحد کے اجزاء منتشر ہو جائیں گے اور حیات اجتماعی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ضعف ہیئت اجتماعی کا مرض ہے | ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ضعف افراد ہیئت اجتماعی کا ایک مرض ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ اجزائے ضعیفہ قطع کر دیئے جائیں، بلکہ تدبیر یہ ہے کہ ضعیف کو قوی بنایا جائے۔

نیٹشے جس غائت کو حاصل کرنا چاہتا ہے، وہی فطرت کا بھی مقصود ہے، کیونکہ ہر آنے والی نسل گذری ہوئی سے زیادہ اچھی ہوتی ہے، اور رفتار ترقی برابر جاری رہتی ہے، فطرت بھی ضعیف کو معدوم کرتی ہے اور قوی کو باقی رکھتی ہے، لیکن وہ اس عمل میں کسی ضعیف پر ظلم نہیں کرتی، اور نہ نیٹشے کے اصول کو کام میں لاتی ہے۔

دنیا ہمیشہ ترقی کی طرف جا رہی ہے اور کائنات کے اجزائے مختلفہ آپس میں مل کر متحد ہوتے جاتے ہیں اور حیات اجتماعی کے ارکان مستحکم ہو رہے ہیں، اور وہ بشریت کو سعادت کی طرف لیجا رہے ہیں، اس سے

اگر ہم مجمع بشری کو ضعیف افراد سے خالی کرنا چاہیں تو اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین اصول تیار کئے جائیں اور ان کی جسمانی اور دماغی نشوونما کی رعایت تمام کاموں پر مقدم سمجھیں۔

نگار جون ۲۲ء

خـتـم شـد

کتبہ محمد امین خاور موتی بہ لاہور سنہ ۱۹۴۷ء مورخہ یکم اپریل۔